

# حلقہ چار

سید زید حامد

# حَاقَّةٌ جَارَانِ

سید زید حامد



# بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

- نام کتاب : حلقہء یاراں
- مصنف : سید زید زمان حامد
- ناشر : براس ٹیکس، راولپنڈی
- تقلیب حروف : براس ٹیکس ٹیم
- مجلس ادارت : سمیع اللہ بخاری، سیدہ قدسیہ مشہدی، فاطمہ حسین، سفیان مسعود
- کتابت و آرائش : وقار احمد صدیقی
- تاریخ اشاعت : دسمبر ۲۰۱۴ء
- قیمت : پندرہ سو روپے



راولپنڈی، پاکستان

فون: +92-51-5598046-7

ویب سائٹ: [www.zaidhamid.pk](http://www.zaidhamid.pk)

ای میل: [syedzaidzamanhamid@gmail.com](mailto:syedzaidzamanhamid@gmail.com)

نوٹ: اس کتاب کو مصنف کی اجازت سے امت مسلمہ کی فلاح کیلئے تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

سیدی و مرشدی رسول اللہ ﷺ  
کی خدمت اقدس میں  
ہدیہ عشق و ادب



# فہرست

۱	لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا	۱
۱۷	باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے	۲
۳۱	قرآن میں ہو غوط زن اے مرد مسلمان	۳
۴۵	ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں	۴
۵۹	اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است	۵
۷۱	ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں	۶
۸۷	دوسرا نام اسی دین کا ہے ”فقر غیور“	۷
۱۰۱	خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں	۸
۱۱۵	میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اِمام کیا ہے	۹
۱۳۱	قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے	۱۰
۱۴۷	مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!	۱۱

۱۶۵	زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا	۱۲
۱۷۹	زمانہ باتو نسا زد، تو باز زمانہ ستیز	۱۳
۱۹۱	خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا مقام	۱۴
۲۰۷	”قل هو اللہ“ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام	۱۵
۲۱۷	زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی	۱۶
۲۲۹	کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ و سحر گاہی	۱۷
۲۴۳	طمانچہ موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے	۱۸
۲۵۷	موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں	۱۹





مصنف حلقہ عیاران کی ریکارڈنگ کے دوران  
یہ کتاب مصنف کے فی وی پر نشر ہوئی اور یہ "حلقہ عیاران" کی تحریری شکل ہے۔



## لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اس تصنیف کا مقصد نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت اور آج کے پرفتن دور میں ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے اشکالات کے شافی جوابات دینا ہے، تاکہ وہ امت کی قیادت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھا سکیں۔

آج ہم تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں، یہ ہماری زندگیوں کا حیرت انگیز ترین لمحہ ہے۔

آپ کو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے دور میں پیدا کیا ہے کہ جب تقدیر امت مسلمہ کی قیادت کی ذمہ داری اس خطے کے مسلمانوں کو دینے والی ہے۔ آپ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ کے امین ہیں۔ ۱۷۵۷ء کی جنگِ پلاسی میں نواب سراج الدولہ کی شہادت سے پہلے مسلمانوں نے برصغیر پر تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی اور پھر زوال کا شکار ہو گئے۔ ۱۷۵۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک، ایک سو نوے سال ہماری تاریخ کا دردناک ترین دور تھا۔ اس سے پہلے امت مسلمہ نے اتنا طویل اور کٹھن وقت کبھی نہیں گزاریا تھا۔

تحریک پاکستان محض مسلم لیگ کے قیام سے شروع نہیں ہوئی تھی، بلکہ پاکستان بننے کی جدوجہد تو قرونِ اولیٰ تک جاتی ہے۔ بقول قائد اعظمؒ، پاکستان تو اسی وقت بن گیا تھا کہ جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ لیکن جس پاکستان کی اب ہم بات کر رہے ہیں، وہ آج کا پاکستان ہے کہ جس کا پرچم سبز ہلالی ہے، جس کی نسبت گنبد خضراء کے ساتھ ہے، جو مدینہ ثانی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ ۲۷ رمضان کو، لیلۃ القدر کی مبارک گھڑی میں، وجود میں لایا۔ اس پاکستان کو اللہ تعالیٰ مستقبل میں امت کو یکجا اور متحد کرنے کیلئے استعمال





کرے گا اور تب مسلمان ایک ہوں گے حرم کی پاسبانی کیلئے، نیل کے ساحل سے لیکر تاجکاک کا شغریٰ، ان شاء اللہ۔

پاکستان اللہ تعالیٰ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ یہ امت مسلمہ کیلئے ایک تحفہ ہے۔ اس پاکستان کے قیام کیلئے ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک، کروڑوں انسانوں نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا۔ مگر یہ حقیقت تاریخ کے صفحات سے ہی مٹادی گئی ہے۔ ہماری نصابی کتب میں بھی اسکا ذکر نہیں کیا جاتا۔ ذرائع ابلاغ بھی یہ دردناک حقیقت سامنے لانے سے کتراتے ہیں۔ صرف ۱۹۴۷ء سے لیکر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک ہی، کروڑوں مسلمان ذبح کر دیئے گئے تھے۔ اسکے علاوہ نسل کشی کی اتنی بڑی واردات شاید افریقہ کے غلاموں یا شمالی امریکہ کے مقامی ریڈ انڈینز کے ساتھ ہی کی گئی ہوگی، کہ جو کئی صدیوں تک مختلف عالمی طاقتوں کے نوآبادیاتی نظام کا شکار رہے۔ اُس دور میں اس وقت کی عالمی طاقتوں نے دنیا کو تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کیا تھا، خصوصاً ملت اسلامیہ اور ہندوستان میں تو بے پناہ تباہی مچائی گئی۔

جب امت پر کڑا وقت آتا ہے تو قوموں کی اجتماعی غلطیوں اور کوتاہیوں کی سزا انفرادی قربانیوں کے ذریعے معاف نہیں کی جاتی۔ انفرادی قربانیاں دینے والے افراد خود تو سرخرو ہو جاتے ہیں، مگر امت کے اجتماعی زوال کو نہیں روک پاتے۔ اجتماعی زوال کو ٹالنے کیلئے اجتماعی توبہ و قربانی دینی پڑتی ہے۔

سراج الدولہ ۱۷۵۷ء میں شہید ہو کر ہندوستان کی تقدیر بدلنے سے معذور رہے۔ اس کے بعد ٹیپو سلطان اس پرچم کو اٹھاتے ہیں اور کفار کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے بالآخر وہ بھی شہید ہو جاتے ہیں۔ پوری مسلم دنیا میں جہاں جہاں مسلمانوں نے تحریک مزاحمت اٹھائی، مثلاً وسطی ایشیا (شمرقند، بخارا، تاشقند، چینینا، ازبکستان، تاجکستان وغیرہ)، وہاں وہاں انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ہند میں



بھی مسلمان جنگ آزادی لڑ رہے تھے۔ خلافت عثمانیہ انیسویں صدی سے ہی ”یورپ کا مرد بیمار“ کہلانے لگی تھی۔ غرضیکہ پوری امت، مشرق اور مغرب میں، زوال کا شکار تھی۔ ہماری نصابی کتب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا تذکرہ صرف چند سطور میں یوں ملتا ہے کہ مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جنگ آزادی لڑی اور شکست سے دوچار ہوئے، کہ جس کے بعد ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ تفصیل سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔ انگریز جو آج پوری دنیا میں آزادیء اظہار رائے اور حقوق انسانی کے علمبردار بنے پھرتے ہیں، ہندوستان پر قبضے کے دوران انہوں نے وہ ظلم و ستم برپا کیا کہ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ دور حکومت اور تمدن کا نام و نشان تک مٹا ڈالا۔ انگریزوں سے پہلے ہندوستان پر حکومت کرنے والے مغل خاندان کا ۱۸۵۷ء کے بعد ذکر بھی نہیں ملتا کہ آخر وہ گئے کہاں؟ انگریزوں نے ان کے خاندان اور مسلمان اشرافیہ کے ایک ایک فرد کو ختم کر دیا۔ وہ تمام افراد کہ جن کا شاہی خاندان یا مسلمان تہذیب سے دور کا بھی تعلق ہوتا، انہیں دردناک اذیتیں دے کر شہید کر دیا جاتا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان علماء کو زندہ جلایا گیا یا توپوں کے آگے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ شاہی خاندان کی عورتوں کو بیچ دیا گیا۔ دہلی میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تاریخ، لائبریریاں، کتابیں اور دیگر خزانے جلا کر رکھ کر دیئے گئے۔ مسلمانوں کی ثقافت، تہذیب اور زبان تک کو مٹانے کی کوشش کی گئی اور جس دردناک طریقے سے یہ سب کچھ ہوا، اسے سن کر ہی انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

۱۷۵۷ء سے پہلے عالمی تجارت میں مسلمان ہندوستان کا حصہ ۲۵ فیصد تھا۔ ۱۹۴۷ء میں حال یہ ہو چکا تھا کہ عالمی تجارت میں برطانیہ



کے زیر تسلط ہندوستان کا حصہ ایک فیصد سے بھی کم رہ گیا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ ان ۱۹۰ سالوں میں انگریزوں نے ہندوستان کو کس قدر لوٹا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس دوران بہت ترقی ہوئی۔ انگریزوں نے ریلوے لائن بنوائی، عدالتیں بنائیں، بڑی نہریں اور سڑکیں تعمیر کیں۔ لیکن درحقیقت انگریزوں نے صرف ہندوستان کو لوٹا، ترقی نہیں دی۔ انہوں نے ہندوستان میں صرف اس قدر تعمیر و ترقی کی کہ جتنی ہندوستانیوں کو غلام رکھنے اور یہاں کے وسائل لوٹنے کیلئے ضروری تھی، ورنہ انکا پورا نظام ظلم، جبر اور استبداد پر قائم تھا۔

اگر موجودہ حکمرانوں میں غیرت ہوتی تو انگریزوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو سو سال کے نقصانات کا ہر جانہ طلب کرتے۔ اس زمانے میں بنگال میں دنیا کا بہترین ریشم بنتا تھا۔ یہ بات بہت مشہور ہے کہ اس ریشم کا ایک تھان انگوٹھی میں سے گزر جاتا تھا، یعنی اتنا باریک اور نفیس ریشم ہوتا۔ انگریزوں نے وہ ریشم بنانے والے تمام کاریگروں کے انگوٹھے کٹوا دیئے تاکہ وہ صنعت ہی ختم ہو جائے اور ہندوستان میں مانچسٹر کا بنا کپڑا فروخت ہو سکے۔ قیمتی فضلیں، معدنیات اور ہیرے جواہرات جہازوں میں بھر بھر کر انگلستان بھیج دیئے جاتے۔ ملکہء برطانیہ کے تاج میں جڑا ہوا ”کوہ نور ہیرا“ آخر ان تک کیسے پہنچا؟

۱۷۵۷ء کے بعد ہی ہندوستان کے مسلمانوں کیلئے مشکل وقت شروع ہو چکا تھا، مگر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے لیکر ۱۹۴۷ء تک کے نوے سال مسلمانوں پر خصوصاً بہت بھاری گزرے۔ ہماری زبان تک تبدیل کر دی گئی۔ اس سے پہلے مسلمانوں میں فارسی زبان رائج تھی۔ فارسی کو ختم کر دیا گیا۔ عربی پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔ اسکے بعد مسلمانوں میں زبان اور فرقوں کی بنیاد پر اتنے گروہ پیدا کیے گئے کہ پھر مسلمان متحد ہی نہ ہو پائے۔ نہ صرف مسلمانوں کی سیاست ختم کر دی گئی بلکہ مسلمانوں کو معیشت سے بھی بے دخل کر دیا گیا۔ سب سے بڑا ظلم یہ کیا گیا کہ اشرافیہ کو قتل کر دیا گیا، مگر وہ غدار کہ جنہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا، انہیں زمینیں اور جاگیریں دے کر نواب، جاگیردار، وڈیرہ اور سردار بنا دیا گیا، اور مختلف خطابات دے کر مثلاً، ”خان بہادر“، ”ملک“، ”خان“، ”سردار“ وغیرہ، مسلمانوں میں ایک نئے حکمران طبقے کو جنم دیا گیا۔ نتیجتاً مسلمانوں کا معاشرتی ڈھانچہ اور اس کے طبقات تبدیل ہو کر رہ گئے۔ غلاموں اور غداروں کو مسلمانوں کی اشرافیہ بنا دیا گیا اور حقیقی اشرافیہ کو ختم کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ سال پہلے جب ملکہء برطانیہ پاکستان آئیں تو پارلیمنٹ میں سپیکر نے ملکہ کو مخاطب کر کے کہا: ”We are still your loyal subjects“ یعنی ہم اب بھی آپ کے وفادار غلام ہیں۔ یہی طبقہ آج تک پاکستان پر حکمرانی کر رہا ہے، چاہے وہ کسی بھی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتا ہو۔

دوسرا بڑا ظلم جو انگریزوں نے کیا وہ یہ تھا کہ ہمارے دین میں فتنے پیدا کر دیئے، خصوصاً قادیانیوں کا فتنہ۔ انگریزوں نے ختم نبوت کے حوالے سے مسلمانوں میں شکوک و شبہات پیدا کیے، اور قادیانیوں کے ذریعے یہ پرچار بھی کروایا کہ انگریزوں کے خلاف مزاحمت حرام ہے۔ ایسے علماء کو بھی سامنے لایا گیا کہ جو بظاہر تو انگریزوں کے مخالف تھے، مگر درحقیقت ہندو مشرکوں کے کٹر ساتھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب علامہ اقبالؒ نے دین کی سر بلندی اور تحریک پاکستان کے حوالے سے کام شروع کیا تو ان کی سب سے زیادہ مخالفت ہندوؤں یا انگریزوں نے نہیں، بلکہ انہی نام نہاد علماء نے کی کہ جن کو آج ہم ”کانگریسی مولوی“ کہتے ہیں۔ ہندوستان کا دارالعلوم دیوبند ان

کا نگرہی مولویوں کا گڑھ تھا اور آج تک یہ پاکستان کے مخالف اور مشرکوں کے ساتھی ہیں۔ انہی مولویوں نے اقبالؒ کو ”کافر“ اور قائد اعظمؒ کو ”کافر اعظم“ کہا اور پاکستان کو ”کافرستان“ کا نام دیا۔ علامہ اقبالؒ نے کلیات اقبال میں دارالعلوم دیوبند کا نام لیکر ایک نظم لکھی ہے، کہ جس میں مولوی حسین احمد مدنی کے نظریات اور اعمال کو ابولہب سے تشبیہ دی ہے۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں، ورنہ  
زدیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است  
سرود برسر منبر کہ ملت از وطن است  
چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است  
بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست  
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں ایسے مولویوں کو اڑا کے رکھ دیا تھا کہ جنہوں نے مغربی قوم پرستی کا تصور دیا اور جنہوں نے یہ کہا کہ قومیت وطن سے ہے، اسلام اور دین سے نہیں۔ اقبالؒ نے کہا کہ قوم مذہب سے ہے۔ اگر مذہب نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

ستم ظریفی دیکھیے کہ آج وہی کانگریسی مولوی پاکستان کے چیمپئن بنے پھرتے ہیں۔ پاکستان کی حکومت میں بھی شامل ہیں اور خود کو تحریک پاکستان کے علمبردار کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے حقیقی طور پر تحریک پاکستان کے لیے قربانیاں دینے والوں کا کردار، ہماری نصابی کتب سے غائب کر دیا ہے۔ انگریزوں اور ہندوؤں کے مظالم پر بھی یوں پردہ ڈال دیا گیا کہ جیسے انہوں نے مسلمانوں پر کبھی ظلم کیا ہی نہ ہو، بلکہ یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ہندوستان کی تقسیم ہی غلط تھی، قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ سے بہت بڑی خطا ہوئی کہ انہوں نے پاکستان بنایا۔ جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ اور مولانا فضل الرحمن کے والد مفتی محمود پاکستان کی پارلیمنٹ میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کر چکے ہیں کہ وہ پاکستان بنانے کے گناہ میں شامل نہیں تھے!

اس حلقہء یاراں میں ہم ان تمام موضوعات پر بات کریں گے۔ ہم پاکستان کی سیاست اور معیشت پر بھی بات کریں گے اور دینی موضوعات پر بھی۔ ہم اقبالؒ کے بندہء مومن کو بھی زیر بحث لائیں گے اور اقبالؒ کے فلسفہء خودی پر بھی بات کریں گے۔ ہم ہر اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے کہ جو پاکستان کی نوجوان نسل کے ذہن میں ہے۔ کیونکہ اگر اس نسل کی تربیت نہ کی گئی تو آنے والے دور میں ہمیں اسکی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑے گی۔ لمحوں کی خطا ہوتی ہے مگر سزا صدیوں تک کا ٹاپڑتی ہے۔ نواب سراج الدولہ کی صفوں میں ایک عداوت تھا، میر جعفر۔ اس نے انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر کے مسلمانوں کو شکست سے دوچار کر دیا۔ وہ لمحوں کی خطا تھی



مگر اس کی سزا ہم نے دو سو سال تک کاٹی۔ ہمیں دو سو سال کی غلامی برداشت کرنا پڑی۔ اس کے بعد میر صادق نے ٹیپو سلطان سے غداری کی۔ اقبالؒ نے انہی غداروں پر ایک المناک مرثیہ بھی کہا ہے:

جعفر از بنگال و صادق از دکن

نگِ آدم، نگِ دین، نگِ وطن

مسلمانوں کو کبھی بھی کوئی باہر سے نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ ہمیں ہمیشہ ہماری صفوں میں موجود غداروں نے نقصان پہنچایا ہے۔ کبھی وہ علمائے سو کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں، کبھی دانشوروں کی شکل میں اور کبھی سیاستدان کے روپ میں۔

ایسے فتنہ گر علماء کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کا منہ ہوم ہے کہ، فتنے انہی علماء میں سے اٹھتے ہیں اور انہی میں داخل ہو جاتے ہیں اور وہ اللہ کی مخلوق میں سب سے زیادہ ناپاک لوگ ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی رحمت یہ ہے کہ وہ ہر دور میں علمائے حق بھی پیدا کرتا ہے کہ جو دین کی آبرو کی حفاظت کا کام کرتے ہیں۔ انگریز جو فتنے برصغیر میں چھوڑ کر گئے، ان کے ناپاک اثرات آج بھی باقی ہیں۔ ہمارے ملک میں انہی کا بنایا ہوا نظام رائج ہے۔ ہمارا عدالتی، سیاسی اور معاشی نظام سبھی کچھ انگریزوں کا چھوڑا ہوا ہے۔ ہماری سیاست میں آج بھی وہی میر جعفر اور میر صادق کی اولادیں شامل ہیں، اور ہمارے دین کے ٹھیکیدار بھی وہی فتنہ گر ہیں کہ جو ”پاکستان بنانے کے گناہ میں شامل نہیں تھے“۔

اس پاکستان کے بارے میں کچھ حقیقتیں ہم آپ کو بتانا چاہیں گے۔ پاکستان اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ اشفاق احمد صاحب نے کہا تھا کہ اس پاکستان کی مثال حضرت صالحؑ کی اونٹنی جیسی ہے، معجزے سے بنا ہے اور معجزے ہی سے قائم ہے۔ جس نے پاکستان کی عزت کی، وہ دو جہانوں میں نوازا جائیگا اور جس نے پاکستان کی مخالفت کی، خواہ وہ کتنے ہی جج کر لے، روزے رکھ لے، نمازیں پڑھ لے، وہ دنیا اور آخرت میں تباہ و برباد ہو جائیگا۔ تاریخ نے ثابت کیا ہے کہ جس نے بھی پاکستان کے ساتھ برا کیا، اللہ تعالیٰ نے اسے برباد کر دیا۔ اس کی دنیا اور آخرت دونوں تباہ ہوئے۔ جو پاکستان کے ساتھ مخلص رہا، چاہے اسے دنیا میں چند تکلیفیں برداشت کرنا پڑی ہوں، لیکن اسے دو جہانوں میں عزت اور آبرو ملی۔

عربی زبان میں لفظ ”پاکستان“ کا لغوی معنی ہی ”مدینہ طیبہ“ ہے۔ ”پاک“ مطلب طیب اور ”ستان“ یعنی مدینہ (شہر)۔ پاکستان کوئی عام ملک نہیں ہے۔ یہ ”مدینہ ثانی“ ہے۔ دنیا میں بہت سے ممالک وجود میں آئے، مگر چودہ سو سال میں یہ پہلی بار ہوا ہے کہ کوئی ملک مدینہ منورہ سے اتنی مماثلت رکھتا ہو۔ مدینہ میں بھی مسلمان، مشرک مکہ سے ہجرت کر کے آئے، پاکستان میں بھی مسلمان، مشرک ہندوستان سے ہجرت کر کے آئے۔ وہاں بھی مشرک مکہ اور مسلمان مدینہ کے درمیان پے در پے جھڑپیں ہوتیں رہیں، یہاں بھی پاکستان اور ہندوستان مسلسل حالت جنگ میں ہیں۔ وہاں بھی دوران ہجرت مسلمانوں نے بہت تکلیفیں اٹھائیں، یہاں بھی دوران

ہجرت مسلمانوں کو بے انتہا ظلم و ستم برداشت کرنے پڑے۔ وہاں بھی احد میں مسلمانوں کو نقصان اٹھانا پڑا، یہاں بھی ۱۹۷۱ء میں مسلمان کو چوٹ لگی۔ وہاں بھی دو قومی نظریہ تھا کہ مسلمان اور مشرک کا فرد الگ الگ قوم میں ہیں، یہاں بھی دو قومی نظریے، یعنی ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں، پر یہ ملک وجود میں آیا۔ وہاں بھی امن پسندی سے رہنے کیلئے ”معاہدہ حدیبیہ“ کیا گیا، یہاں بھی پاکستان اور ہندوستان کے درمیان شملہ اور تاشقند جیسے کئی امن معاہدے ہو چکے ہیں۔ وہاں بھی جب کفار نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی تو پھر فیصلہ کن معرکے کے بعد مکہ فتح ہوا، یہاں بھی ہندوستان مسلسل معاہدوں کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور اب ایک فیصلہ کن معرکے کے بعد دہلی دوبارہ فتح ہوگا، ان شاء اللہ۔ حدیث شریف میں اس فیصلہ کن معرکے کو ”غزوہ ہند“ کا نام دیا گیا ہے۔ ہندو مشرک صرف تلوار کی زبان سمجھتا ہے اور اس فتح کی بشارت ہمیں سیدی رسول اللہ ﷺ نے بہت پہلے سنادی ہے۔ اور یہی پاکستان کے قیام کا ایک اہم مقصد ہے۔

پاکستان کی تعمیر لا الہ الا اللہ، پر ہوئی، اور اب پاکستان کی تکمیل، محمد الرسول اللہ ﷺ پر کی جائے گی، ان شاء اللہ۔ ہم نے خطہ زمین بھی حاصل کر لیا ہے اور اس کا دفاع بھی کر رہے ہیں، اب صرف یہاں پر شریعت کا نفاذ باقی ہے، کہ جس کے بعد پاکستان اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے قابل ہوگا کہ جو اس کے نصیب میں لکھی گئی ہیں۔

ہمارا دوسرے مسلمانوں سے دین کا رشتہ ہے۔ ہمارا رشتہ لسانیت، قومیت، فرقہ واریت اور عصبیت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ مدینہ طیبہ کی طرح پاکستان ہمارا مرکز ہے۔ جس طرح اس وقت مدینہ منورہ کا دفاع پوری امت کا دفاع تصور کیا جاتا تھا، اسی طرح آج امت کا مرکز پاکستان ہے اور اس کا دفاع امت کا دفاع ہے۔ امت کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ اسے ایک ایسا آزاد خطہ زمین میسر ہو کہ جہاں وہ خود کو منظم کر سکے اور اپنے نظریے کو فروغ دے سکے۔ پاکستان ہمارے لیے وہی مقدس خطہ زمین ہے۔ پاکستان کی سرحدیں جواب چھوٹی نظر آتی ہیں، ان شاء اللہ مستقبل میں چھوٹی نہیں رہیں گی۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے

نیل کے ساحل سے لیکر تاجنخاک کا شجر

اقبال اتحاد بین المسلمین کے داعی تھے۔ اقبال کا پیغام بہت انقلابی ہے۔ اسکے باوجود پاکستان کے قیام کے ۶۸ سال گزر جانے کے بعد بھی نوجوان نسل کو اقبال کا کلام نہیں پڑھایا جاتا۔ ہمارے معاشرے میں سرکاری طور پر اقبال کو عقیدت کا نشان تو ضرور بنایا گیا ہے، مگر ان کے کلام اور ان کے پیغام سے فیض لینے کا رواج نہیں۔ جیسا کہ ہم قرآن کے ساتھ کرتے ہیں کہ بیٹیوں کو رخصت کرتے وقت ان کے سر پر تو رکھ دیتے ہیں، مگر قرآن پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی زحمت نہیں کرتے، حالانکہ قرآن انقلاب کی کتاب ہے، روحانیت اور ہدایت کی ایسی کتاب کہ جب ہمارے بزرگوں نے اسے سمجھا تو فقط تیس سال کے عرصے میں (خلافت راشدہ میں) چین

سے لیکر یورپ تک کے تمام علاقے اسلام کے پیغام سے منور ہو گئے۔ جو قرآن سننا اور سمجھتا ہے، وہ پھر عام زندگی نہیں بسر کر سکتا، وہ انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ اقبالؒ کا کلام بھی وہی برکت رکھتا ہے کیونکہ اس میں اقبالؒ نے حکمت قرآن، عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ کی ہی نمائندگی کی ہے۔ اگر اس وقت کلام اقبالؒ سے لگائی ہوئی چنگاری مسلمانوں کو اتنی طاقت دے سکتی ہے کہ وہ براعظم کو توڑ کر ایک الگ ملک بنالیں، تو آج اس کلام اقبالؒ سے فیض لیکر ہم دنیا کی امامت کیوں نہیں کر سکتے!

## سوالات و جوابات

سوال: قرآن اور کلام اقبالؒ میں قوم پرستی کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ نے اسلام کسی ایک خطہء زمین کیلئے نہیں بھیجا۔ اسلام تو آفاقی اور عالمگیر دین ہے۔ آجکل قومیت کا ایسا تصور دیا جاتا ہے کہ جس کے باعث انسان چھوٹے چھوٹے جغرافیائی خطوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اسلام اپنی فطرت کے تحت انسانوں کو جوڑتا ہے، تقسیم نہیں کرتا۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام

جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم!

لاکھوں انسان ایک ساتھ حج کرتے ہیں۔ وہ لوگ دنیا کے ہر کونے سے آتے ہیں مگر وہاں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون کس رنگ و نسل، قومیت اور طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ کائنات میں کہیں اتنا روح پرور منظر نہیں ملتا کہ جتنا حج کے موقع پر نظر آتا ہے۔ یہی اسلام کا پیغام ہے۔ ہمارا دین فقط اسلام کے نام پر انسانیت کو متحد کرتا ہے۔ کوئی بھی ایسا پیغام کہ جو لوگوں کو قومیت، لسانیت، فرقہ واریت، عصبیت اور رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم کرے، وہ اسلام کا پیغام نہیں ہو سکتا۔

مغرب کا تصور یہ ہے کہ ہر قوم کو ایک خطہء زمین، پرچم اور قومی ترانہ دے کر انہیں باقی لوگوں سے الگ کر دو۔ جغرافیہ کی بنیاد پر تقسیم کرنے کے بعد بھی وہ ملکوں کو مزید چھوٹا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسے بیسویں صدی میں خلافت عثمانیہ کو توڑ کر درجنوں ممالک میں تقسیم کر دیا گیا۔ اب وہ پاکستان کو بھی توڑ کر مختلف چھوٹے چھوٹے ممالک میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں۔ سندھ و بلوچستان کو الگ کرنے کی بات کی جاتی ہے، صوبہ سرحد کو افغانستان کا حصہ بنانے کی بات کرتے ہیں۔



لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبالؒ نے مغرب کے اس تصور پر سخت تنقید کی:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیر، بن اسکا ہے، وہ مذہب کا کفن ہے

ہر دور کے لوگ اپنے عہد کے مطابق کچھ بت تراشتے ہیں۔ حضور ﷺ نے اپنے دور میں کعبہ میں موجود تین سوساٹھ بت توڑے تھے۔ آج بھی وہ تین سوساٹھ بت ہم نے اپنے درمیان بسائے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کے دلوں میں بستے ہیں، کچھ معاشروں میں بستے ہیں۔ ہمیں وہ تمام بت توڑنے ہیں تاکہ توحید کو زندہ کیا جاسکے۔

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے

ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

یعنی مسلمان جس وطن کی بات کرتے ہیں وہ ارشاد نبوی ﷺ کی روشنی میں وجود میں آتا ہے۔ حضور ﷺ نے اپنے وطن سے محبت کو ایمان کا حصہ بنایا ہے۔ حضور ﷺ کو مکہ و مدینہ سے بہت محبت تھی۔ ہمیں بھی پاکستان سے عشق ہے۔ جب کوئی خطہ جیسے کہ پہلے مدینہ اور اب پاکستان، اسلامی نظریے کی بنیاد پر وجود میں آئے، تو پھر ایسے ملک کی محبت ایمان کا حصہ بن جاتی ہے۔ لیکن جب اسلامی نظریے کو دفن کر کے، قومیت، عصبیت، لسانیت اور فرقہ واریت کو پروان چڑھایا جائے اور اس بنیاد پر ملک بنائے جائیں، جیسا کہ بنگلہ دیش وغیرہ، تو اقبالؒ اس کو مذہب کا کفن کہتے ہیں۔ اگر لوگ اسلام کو پیچھے رکھتے ہوئے عصبیت کی بنیاد پر یہ کہیں کہ میں بنگالی ہوں، ایرانی ہوں، پاکستانی ہوں، عرب ہوں یا افغانی ہوں، تو یہ وہ قومیت ہے کہ جو حرام ہے اور جس کی جڑ کاٹنے کیلئے اسلام آیا ہے اور جس کی جڑ دور جدید میں اقبالؒ بھی کاٹتے ہیں۔

سوال: آپ کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمانوں کیلئے بنایا گیا ہے، لیکن مسلمان تو پوری دنیا میں موجود ہیں۔ اس میں کیا خاص مقصد پنہاں ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر کے یہاں مسلمانوں کا مرکز بنایا گیا؟

جواب: یہ اللہ کا ایک غیر معمولی راز ہے۔ اقبالؒ جب تصور خودی دیتے ہیں تو کہتے ہیں:

خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجمان ہو جا

جب انسان اپنے آپ کو جانا شروع کرتا ہے اور اپنے رب سے ایک تعلق قائم کر لیتا ہے، تو پھر وہ اللہ کے راز دانوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنے رازوں سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اقبالؒ بھی اللہ تعالیٰ کے راز دان تھے۔ ولی، درویش، فقراء یہ سب

اللہ تعالیٰ کے رازدان ہی ہوتے ہیں۔ اگر آپ چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ حالات و واقعات بتا دیتے ہیں کہ اللہ کس قوم سے کام لینا چاہ رہا ہے۔ آغاز میں اللہ تعالیٰ نے عربوں سے کام لیا، اگرچہ برسرِ اقتدار خاندان تبدیل ہوتے رہے۔ خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ آئے۔ بنو امیہ سے خلافت بنو عباس میں منتقل ہوئی۔ عباسی عرب کمزور پڑے تو اس زمانے میں بظاہر کوئی ایسی قوم نظر نہیں آتی تھی کہ جو مسلمانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکے، مگر غیبی امداد کے تحت ترک سلجوق آگے آئے۔ اس کے بعد عثمانی ترکوں نے یہ ذمہ داری لے لی۔ اس وقت کے علماء اس صورتحال سے پریشان ہو گئے کیونکہ ایک حدیث شریف کے مطابق خلافت کا حق صرف قریش کے پاس ہے۔ پھر علماء نے اس حدیث کی تشریح یوں کی کہ اگر قریش موجود ہوں تو خلافت کا حق انکا ہوگا، ورنہ ان کی عدم موجودگی میں ایسے غیر قریش بھی خلافت کی مسند سنبھال سکتے ہیں کہ جو امت کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کر سکتے ہوں۔ اس تشریح کی روشنی میں پھر عباسی خلافت کی کمزوری کے پیش نظر، خلافت عثمانی ترکوں کے حوالے کر دی گئی۔ وہ عرب نہیں تھے مگر مسلمان اس حکمت کو سمجھ گئے کہ اب امت مسلمہ کی عزت و آبرو کی حفاظت عثمانی ترکوں کی تلوار ہی کر پائے گی۔ جب صلیبی جنگیں ہو رہی تھیں تو اللہ تعالیٰ کے رازدان بندے جانتے تھے کہ صلیبیوں کو ختم کرنے کا کام اللہ تعالیٰ کو نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی سے ہی لینا ہے۔ لہذا پوری دنیا کے مسلمان جوق در جوق نور الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے پرچم تلے جمع ہونا شروع ہو گئے۔

اسی طرح جب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان کو شکست ہوئی اور مسلمان جدید ٹیکنالوجی کی موجودگی میں بھی، انگریزوں سے ہار گئے تو اللہ کے ولی اور درویش سمجھ گئے کہ اب مسلمانوں کے زوال کا وقت آن پہنچا ہے۔ اب قیادت ان سے چھین لی جائے گی، اور پھر یہی ہوا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پوری مسلمان دنیا زوال کا شکار ہو چکی تھی۔ عربوں کا حال یہ تھا کہ انگریزوں کے ساتھ مل کر انہوں نے ترک مسلمانوں کے خلاف بغاوت برپا کر دی۔ لارنس آف عربیہ کی کہانی پڑھیے تو اندازہ ہوگا۔ یہ ہماری تاریخ کا بہت تکلیف دہ حصہ ہے کہ کس طرح مشرق وسطیٰ میں عربوں نے مسلمان ترک خلافت ختم کرنے کیلئے اور اپنی بادشاہتیں قائم کرنے کیلئے، اپنے ہی مسلمان بھائیوں کے خلاف سازشیں کیں اور بغاوتوں کا حصہ بنے۔ اقبالؒ نے اس رویے پر بہت دکھ بھرے انداز میں کہا تھا:

بیچتا ہے ہاشمی آبروئے دین مصطفیٰؐ

خاک و خوں میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش

وہ شریف مکہ کے بیٹے تھے کہ جنہیں انگریزوں نے مسلمانوں سے غداری کے انعام کے طور پر، پہلی جنگ عظیم کے بعد، نئے نقشے بنا کر کسی کو اردن کی حکومت دی اور کسی کو عراق کی۔ یاد کیجیے حضور ﷺ کی وہ حدیث کہ جس کا مفہوم ہے کہ ایک وقت آئے گا جب دشمن تو میں





تم پر اس طرح ٹوٹیں گی کہ جس طرح بھوکے دسترخوان پر ٹوٹتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ! کیا ہم تعداد میں کم ہوں گے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تعداد میں تو تم اتنے زیادہ ہو گے جیسے سمندر پر جھاگ ہوتی ہے، مگر تمہیں دنیا سے محبت ہوگی اور تم موت سے خوف کھانے لگو گے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں پچاس کروڑ کے لگ بھگ مسلمان تھے، مگر وہ خلافت عثمانیہ کو ٹوٹنے سے نہ بچا پائے۔ خدا کا شکر ادا کریں کہ آپ نے وہ وقت نہیں دیکھا۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اس وقت یہ شعر کہا تھا۔

اے خاصہ خاصانِ رسل ﷺ وقت دعا ہے

امت پہ تیری آ کے عجب وقت پڑا ہے

مسلمان سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان پر ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ خلافت عثمانیہ ٹوٹ جائے گی اور پوری امت یوں یتیم ہو جائے گی۔ پوری مسلم دنیا تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ اس وقت جتنے بھی فقیر کامل پیدا ہوئے، مسلمانوں کے احیاء کے علمبردار کھڑے ہوئے، درویش، علماء اور عظیم سیاستدان سامنے آئے، وہ سب کے سب ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک بشارت اور خوشخبری ہے کہ آئندہ امت کے احیاء اور عروج کے حوالے سے جو بھی کام لیا جائے گا، وہ اسی خطے کے مسلمانوں سے لیا جائیگا۔ عرب، ایشیا وسطیٰ کے مسلمان اور ترک یہ ڈیوٹی انجام دے چکے ہیں۔ اس لیے یہ کام اب اس خطے کے مسلمانوں کے سپرد کیا گیا ہے۔ اقبالؒ نے اسی حوالے سے یہ خوبصورت اشعار کہے تھے:

وحد کی لے سنی تھی دنیا نے جس مکان سے

میر عربؒ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

عطا مومن کو پھر درگاہ حق سے ہونے والا ہے

شکوہ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

پہلا شعر حضور ﷺ کی اس حدیث کے حوالے سے ہے کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجھے ہندوستان سے ٹھنڈی ہوا آئی ہے۔ دوسرا شعر اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ ماضی میں پوری امت مسلمہ کو دیئے جانے والے تحفے اب پاکستان کے مسلمانوں کو دیئے جائیں گے، تاکہ وہ امت مسلمہ کی قیادت کر سکیں۔ اقبالؒ کی ساری شاعری اردو یا فارسی میں ہے۔ اسکا مطلب ہے کہ مسلمانوں کے احیاء کی ڈیوٹی اب اردو اور فارسی بولنے والے مسلمانوں سے لی جائیگی، یعنی پاکستان، افغانستان، ایران، وسطی ایشیا، تاجکستان وغیرہ۔

حضور ﷺ کی ایک اور حدیث کے مطابق خراسان سے فوجیں نکلیں گی۔ اسکے علاوہ غزوہ ہند کی بشارت بھی احادیث میں ملتی ہے۔ آخری دور کے متعلق حضور ﷺ نے جو کچھ بھی فرمایا، اس کا تعلق اسی خطے سے ہے۔ اقبال کا کلام تسبیح کے دانوں کو جوڑنے والے دھاگے کی طرح ہے کہ جس نے خطے کے مسلمانوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا ہے۔ ایک عرب دانشور نے یہ بات کہی تھی کہ پاکستان کا مطلب ہی مدینہ طیبہ ہے۔ یہ ”بلد پاک“ ہے۔ یہ پاک سرزمین اور کشور حسین ہے۔

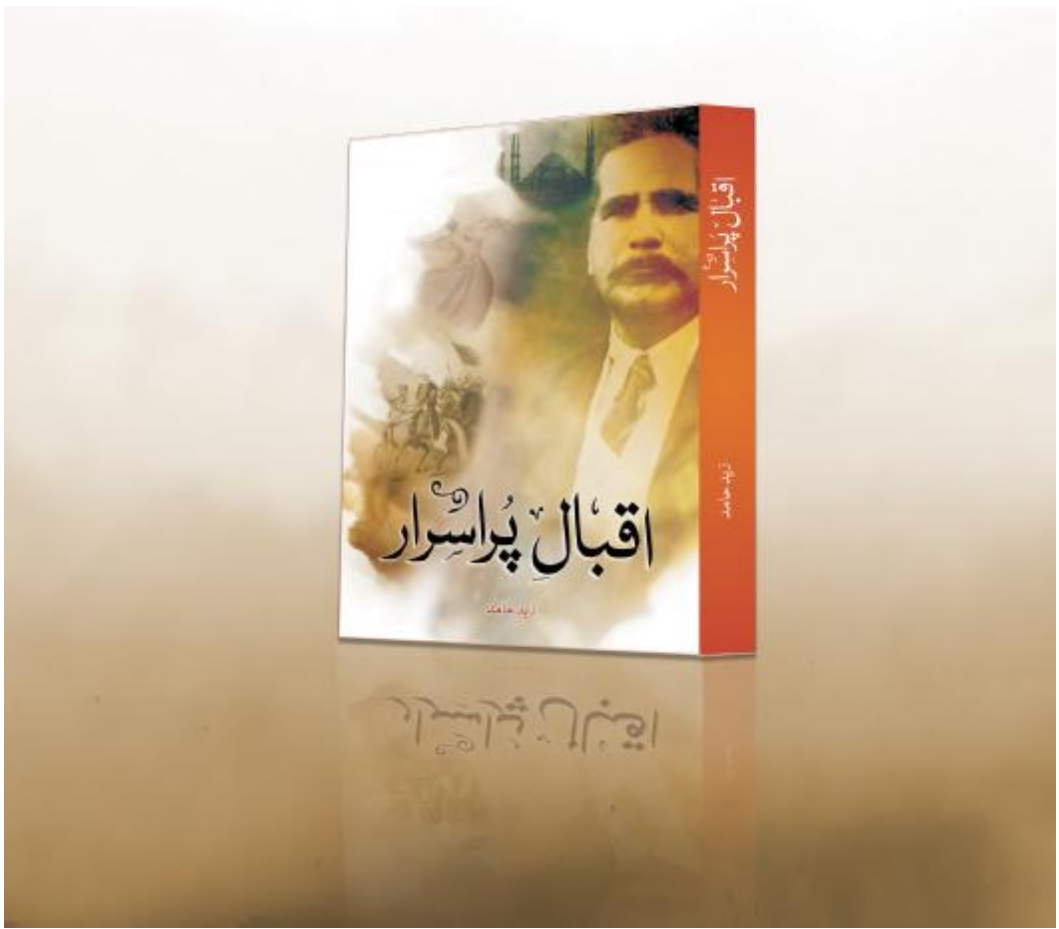
اپنی اس خوش نصیبی پہ ناز کریں کہ اللہ تعالیٰ کو اس خطے کے مسلمانوں سے کام لینا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود کو اس ڈیوٹی کیلئے بھی تیار کریں۔ اللہ اب اپنا کام ان شیروں اور لیروں سے لے گا کہ جو اقبالؒ کے مرد مومن ہوں گے، ان شاء اللہ۔

.....

سوال: ہمارا نظریہ اسلام پر مبنی ہے مگر تحریک پاکستان کے دوران ہماری اعلیٰ سطح کی قیادت مثلاً علامہ اقبالؒ، قائد اعظمؒ وغیرہ کو سیکولر خیال کیا جاتا تھا۔ اب بھی بہت سے لوگ انہیں سیکولر کہتے ہیں۔ کیا وہ واقعی سیکولر تھے؟

جواب: جب تک کسی شخص کی ذات پر حملہ نہ کیا جائے، اسکے نظریات پر بھی حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ اقبالؒ کے طاقتور ترین پیغام یعنی ان کی شاعری، کہ جو آنے والی کئی صدیوں تک مسلمانوں کیلئے رہنمائی کا کام کر سکتی ہے، کا اثر ختم کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ اقبالؒ کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنا دیا جائے کہ وہ سیکولر تھے، بدکار تھے، اچھے کردار کے حامل نہیں تھے، تاکہ لوگ ان سے رہنمائی لینا چھوڑ دیں، حالانکہ آج کی دنیا میں کفر کے نظام کیلئے سب سے بڑا خطرہ ہی اقبالؒ ہیں۔ انہیں یہ اذان دینے کا فریضہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا، تبھی ان کی اذان میں اتنا اثر ڈالا گیا۔ اقبالؒ کا کلام قوموں کو زندہ کرتا ہے۔ اتنا، ہم فریضہ اپنے وقت کے مجدد کو ہی ملتا ہے۔ مجدد الف ثانیؒ کے بعد شاہ ولی اللہ اور ان کے بعد علامہ اقبالؒ نے ہی برصغیر کے مسلمانوں کو سنبھالے رکھا۔ جس طرح کی روحانیت اقبالؒ میں پائی جاتی تھی اور جتنا وہ حضور ﷺ سے عشق کرتے تھے، وہ کوئی سیکولر شخص نہیں کر سکتا۔ اقبالؒ نے یہ پیغام دیا کہ مسلمانوں کو سب کچھ قرآن سے ہی ملے گا۔ ایسا پیغام کسی سیکولر شخص کا نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبالؒ کی شخصیت کے پراسرار پہلو ہم نے اپنی دوسری کتاب ”اقبال پر اسرار“ میں تفصیل سے درج کیے ہیں۔

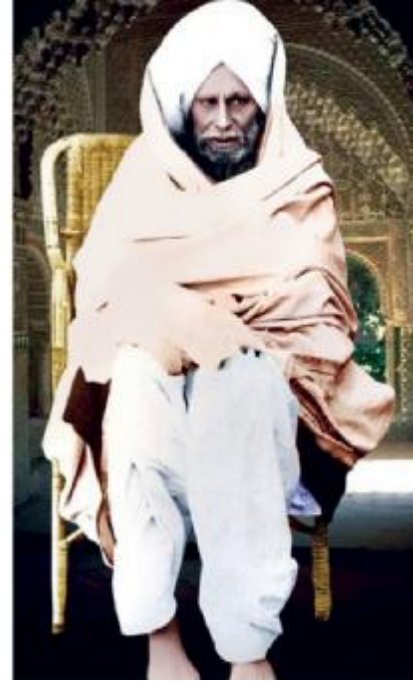
اپنے وقت کے عظیم ترین علماء، فخر اور درویش قائد اعظمؒ کی پشت پر تھے۔ امیر ملت حضرت پیر جماعت علی شاہ ان میں سے ایک ہیں کہ جن کے کام اور ان کی خدمات کو کتاہوں سے غائب کر دیا گیا ہے اور تاریخ کے صفحات سے مٹا دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب قائد اعظمؒ واپس ہندوستان آئے اور مسلم لیگ کی قیادت سنبھالی تو کچھ ہی عرصے بعد، ۱۹۳۸ء میں، علامہ اقبالؒ کا انتقال ہو گیا۔ اقبالؒ نے قوم کو نظریہ دیا، ایک خواب دیا، لیکن زمین پر کام کرنے کیلئے افرادی قوت کی ضرورت تھی۔ افرادی قوت کی تمام تر ضرورت علی گڑھ یونیورسٹی کے طلباء نے پوری کی۔ لوگ مذاق اڑاتے تھے کہ یہ آجکل کے بچے کیسے اسلام کا نفاذ کریں گے۔ مگر انہوں نے یہ کام کر دکھایا۔ اس



وقت ہندوستان کے بڑے بڑے علماء کا نگرہی تھے۔ ایک بار قائد اعظمؒ کے پاس علماء کا ایک وفد آیا اور مطالبہ کیا کہ اگر آپ ہمیں پچاس ہزار روپے دیں تو ہم آپ کو ووٹ دیں گے۔ مسلم لیگ کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا، لہذا انکار کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ اعتراض بھی اٹھایا گیا کہ ہم آپ کو ووٹ نہیں دیں گے کیونکہ آپ شیعہ ہیں۔ قائد اعظمؒ نے جواب دیا: ”ٹھیک ہے آپ گاندھی کو ووٹ دے دیں، وہ سنی ہوں گے“، اور ان بد بخت ”علماء“ نے گاندھی ہی کو ووٹ دیئے۔

مگر اسکے بعد قائد اعظمؒ کی حمایت کرنے کیلئے بہت سے اہل نسبت، اہل طریقت، اولیاء اللہ، فقراء اور درویش سامنے آئے کہ جن میں سب سے بڑا نام حضرت پیر جماعت علی شاہ کا ہے۔ اسکے علاوہ پیر ماکی شریف بھی تھے۔ کانگریسی مولویوں نے فتویٰ دے دیا تھا کہ جو مسلم لیگ کو ووٹ دیگا اسکا نکاح ختم ہو جائیگا۔ پیر جماعت علی شاہ نے جواباً فتویٰ دیا کہ جو مسلم لیگ کو ووٹ نہیں دیگا اسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائیگا۔ اس نازک وقت میں اگر اللہ تعالیٰ ایسے علمائے حق کو کھڑا نہ کرتا، تو پاکستان کا بننا مشکل ہو جاتا۔ اس وقت لوگوں نے حضرت پیر جماعت علی شاہ سے قائد اعظمؒ کے متعلق کہا کہ یہ تو انگریز لگتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ ہمارے عالم، محدث اور مفتی نہیں ہیں، یہ ہمارے وکیل ہیں۔ یہ مسلمانوں کا مقدمہ لڑ رہے ہیں، ہم ان کی پشت پناہی ضرور کریں گے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی کو خواب میں حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی کہ جس میں حضور ﷺ نے انہیں نصیحت کی کہ محمد علی جناح کی مخالفت نہ کرنا۔ اس





مولانا اشرف علی تھانوی

پیر آف مائیکل شریف

پیر جماعت علی شاہ

سے پہلے وہ قائد اعظمؒ کے مخالف تھے مگر جب حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا تو انہوں نے بھی قائد اعظمؒ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی قائد اعظمؒ کی حمایت پر رضامندی ظاہر کر دی۔ مگر بیشتر علمائے دیوبند قائد اعظمؒ کی مخالفت کرتے رہے۔ علامہ اقبالؒ، قائد اعظمؒ کے متعلق کہتے تھے کہ "He is incorruptible and unpurchasable" یعنی نہ وہ خیانت کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی انہیں خرید سکتا ہے۔

پاکستان کو بننا تھا اور وہ بن کر رہا۔ دنیا کی کوئی طاقت قیام پاکستان کو نہیں روک سکتی تھی، چاہے انگریز سامراج ہو، ہندو صیہونی ہوں یا کانگریسی دیوبندی علماء۔ اللہ نے امت کو دوبارہ عروج دینے کیلئے جو فیصلے کر دیئے تھے، پاکستان کا قیام اس منزل کے حصول کے راستے میں پہلا نشان راہ تھا۔ اس کی بشارت علامہ اقبالؒ نے ۱۹۳۸ء میں، اپنے انتقال سے قبل، ان الفاظ میں دے دی تھی۔

عشق کو فریاد لازم تھی سو وہ بھی ہو چکی

اب ذرا دل تھام کر فریاد کی تاثیر دیکھ





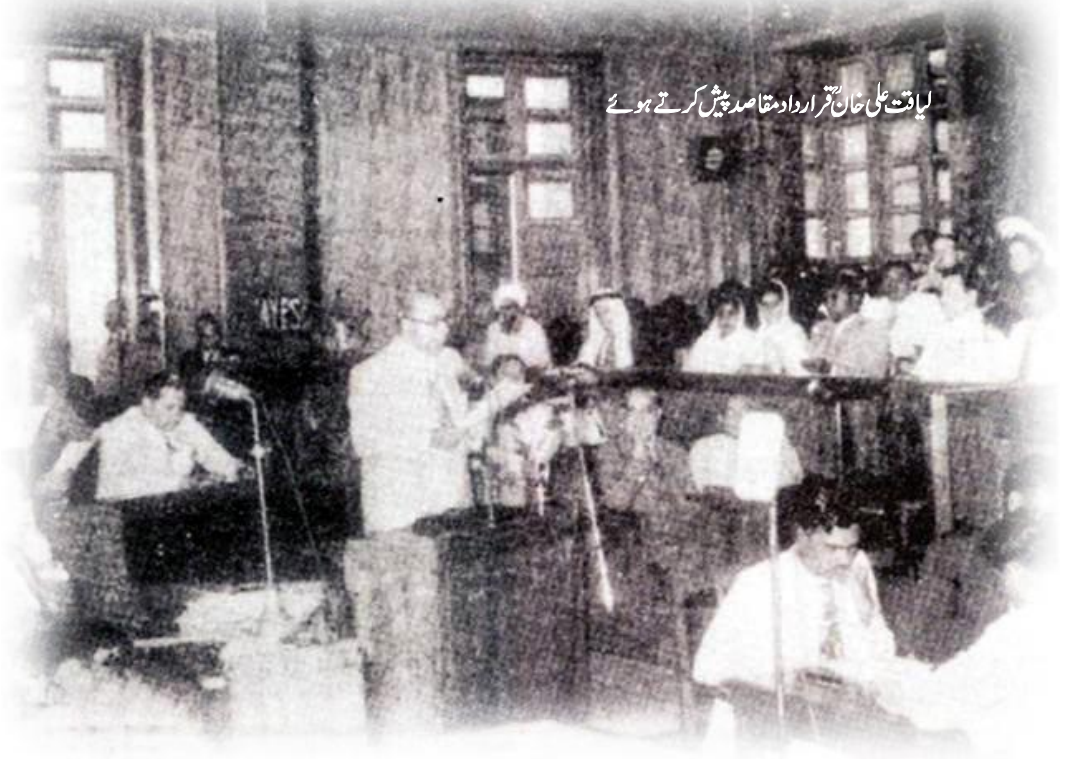


## باطل دوئی پسند ہے، حق لاشریک ہے

اس وقت ہم تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں، اس میں پاکستان کے صرف ظاہری وجود کو ہی خطرہ لاحق نہیں ہے بلکہ اس کی روحانی اساس، ”لا الہ الا اللہ.....“ اور دو قومی نظریہ بھی شدید خطرے میں ہیں۔ ہماری سب سے بڑی غفلت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہم اپنا مقصد حیات بھول گئے۔ ہم یہ بات فراموش کر بیٹھے کہ ہم نے پاکستان کیوں بنایا تھا؟ پاکستان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں دیا گیا ایک ایسا تحفہ ہے، کہ جو ایک مقصد کی تکمیل کیلئے تھا۔ ہمارے بزرگ اس مقصد سے بخوبی واقف تھے لیکن بعد میں آنے والی نسلیں اسے بھلا بیٹھیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہمارے بزرگوں کا تاریخی کارنامہ قرارداد مقاصد تھی۔ اس قرارداد کی منظوری کے بعد لیاقت علی خانؒ نے یہ الفاظ کہے تھے کہ ہماری آزادی کے بعد ہمارے لیے یہ عظیم ترین دن ہے!

کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کو ایک سیکولر (لا دین) ریاست ہونا چاہیے تھا اور یہاں پر مغرب کے جدید دور کے تمام سیاسی، معاشی اور معاشرتی نظاموں کو نافذ کیا جانا تھا۔ ایسے لوگوں کیلئے لیاقت علی خانؒ کی وہ تقریر ہی کافی ہے کہ جو انہوں نے قرارداد مقاصد کی منظوری کے موقع پر کی۔ اسے پڑھیں تو رو ٹوٹنے لگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ قوموں کو روز بروز عروج حاصل کرنے کے مواقع نہیں فراہم کرتا، آج ہم تاریخ کے جس موڑ پر کھڑے ہیں وہاں ہمارے پاس موقع ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی بہتر کارنامے سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس قرارداد میں واضح طور پر ہمارے بزرگوں نے طے کر دیا تھا کہ پاکستان کے تمام قوانین قرآن و سنت کے مطابق بنائے جائیں گے۔





۱۹۴۹ء میں قرارداد مقاصد کی منظوری کے دو سال بعد ہی ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خانؒ کو شہید کر دیا گیا۔ اس قتل کے حوالے سے تحقیقات بھی کروائی گئیں۔ تحقیقاتی رپورٹ میں یہ درج تھا کہ انہیں کس نے شہید کروایا۔ مگر تحقیقات کرنے والے انسپکٹر کو جہاز کے ایک حادثے میں مروادیا گیا اور ساتھ ہی وہ رپورٹ بھی خاکستر ہو گئی۔ لیاقت علی خانؒ کی شہادت کے بعد آنے والے حکمرانوں نے قرارداد مقاصد کو ایسے پس پشت ڈالا کہ پوری قوم ہی اپنی راہ گم کر بیٹھی، یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں ہمارا ایک بازو ہی ہم سے علیحدہ کر دیا گیا۔ مگر زمین کا نقصان کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل نقصان وہ ہوتا ہے کہ جب قوموں کی فکر اور ان کے نظریات کو ہی تبدیل کر دیا جائے۔ ہمارے لیے یہ شدید چوٹ ہے کہ اگر ہم شک کرنے لگیں کہ پاکستان ہم نے واقعی اسلامی نظریے کے تحت بنایا تھا یا پھر اسے لادین ریاست بنانا چاہیے، اور کیا قائد اعظمؒ کے پیش نظر ایک سیکولر ماڈل تھا، اور کیا علامہ اقبالؒ، نعوذ باللہ شرابی تھے، لہذا ان کی پیروی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اصل چوٹ ہے۔ یہ چوٹ ہے کہ اگر ہم نوجوان نسل سے کہیں کہ دو قومی نظریہ ختم ہو گیا ہے یا یہ کہ پاکستان کا بننا محض ایک غلطی تھی اور ہندوستان کی تقسیم نہیں ہونی چاہیے تھی اور بنگال کے ہم سے علیحدہ ہونے کو اس ضمن میں دلیل کے طور پر پیش کیا جائے۔

بھارت میں قیام پذیر کانگریسی مولوی آج بھی گاندھی اور نہرو کی تعریف کرتے ہیں، مگر قائد اعظمؒ کو برا سمجھتے ہیں۔ ایک کانگریسی مولوی جو پاکستان میں پارلیمان کے رکن ہیں، قومی سلامتی کونسل کا رکن بننے کے لیے بے چین تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ قومی سلامتی کونسل کو ماننے نہیں تو اس میں شامل ہونے کیلئے کیوں بے چین ہیں؟ تو ان کا جواب یہ تھا، ”مانتا تو میں پاکستان کو بھی نہیں ہوں، مگر ہوں تو پاکستان میں“۔ چند مسلمان علماء تو برملا یہ کہتے رہے ہیں کہ پاکستان بنانے کے گناہ میں ہم شامل نہیں تھے۔ وہ پاکستان کی نظریاتی اساس کو ہی تسلیم نہیں کرتے۔ یہی لوگ ہیں کہ جو آج پاکستان کی جڑیں کاٹ رہے ہیں، خود کش حملے کرواتے ہیں، اور خوارج

کے روپ میں مشرکوں کے ساتھی بن کر پاکستان کی ریاست سے جنگ کر رہے ہیں۔

سب سے بڑا حملہ جو دشمن ہم پر کرتا ہے وہ ہماری نظریاتی اساس پر ہوتا ہے۔ کہیں قومیت پرستی کی بات کی جاتی ہے، مثلاً پنجتوستان بنانے کے خواہشمند لوگ کہتے ہیں کہ میں پہلے پٹھان ہوں، پھر مسلمان اور پھر پاکستانی۔ یعنی مسلمان ہونے سے بھی پہلے وہ پٹھان ہیں۔ یہ عصبیت جاہلیہ ہے۔

اپنی نظریاتی اساس پر ہرگز سمجھوتہ نہ کیجیے گا۔ مسلمان کبھی اپنے رسول ﷺ پر شک نہیں کرتا۔ کچھ چیزیں شک و شبہ سے بالاتر ہوتی ہیں۔ پاکستان کی روحانی نظریاتی اساس پر کبھی شک نہ کیجیے گا، کیونکہ اگر یہاں شک پیدا ہو گیا تو دشمن اپنے عزائم میں کامیاب ہو جائیگا۔ منظم فوج، معیشت اور طاقتور نظام کے باوجود اگر ہمارا نظریہ متاثر ہو گیا، ہم لادین ہو گئے اور فقط ایک قومی ریاست بن گئے، تو یہ ہماری سب سے بڑی ناکامی ہوگی۔ ہم اس ناکامی اور رسوائی کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں قرآن پاک اور حضور ﷺ سے اپنا تعلق مضبوط کرنا ہے اور قرآن کی اس تشریح سے ہدایت لینی ہے کہ جو اللہ نے دور جدید میں اقبال سے کروائی۔

## سوالات و جوابات

سوال: ہم نے پاکستان ایک نظریے کی بنیاد پر بنایا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ آج پاکستان بننے کے ۶۸ سال بعد ہم اس نظریے کو بھول چکے ہیں؟

جواب: اس میں بہت سے عوامل ہیں۔ سارا قصور اگر ہم اپنے بڑوں پر ڈال دیں تو یہ بہت آسان ہوگا، لیکن اگر ہم ان حالات کو دیکھیں کہ جن میں پاکستان وجود میں آیا تھا، تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہمارے بڑوں کو کتنی ٹھن مشکلات کا سامنا تھا۔ قیام پاکستان کے اعلان اور پاکستان کے قیام کے درمیان آٹھ سے نو ماہ کے عرصے میں تقریباً پچاس لاکھ مسلمان شہید کر دیئے گئے۔ ہندوستان کے قریباً ہر علاقے سے پاکستان کی جانب ہجرت ہو رہی تھی۔ سوا کروڑ مسلمان گھروں سے ہجرت کیلئے نکلے، کہ جن میں سے پچاس لاکھ راستے میں ہی شہید کر دیئے گئے۔ انسانی تاریخ میں اس سے قبل اتنے بڑے پیمانے پر کبھی ہجرت نہیں ہوئی اور نہ ہی اتنا زیادہ قتل عام



ہوا۔ کچھ عرصہ قبل افریقہ کے شہر روانڈا میں دو قبیلے آپس میں لڑ پڑے۔ بے دریغ قتل عام ہوا اور تقریباً پانچ لاکھ افراد مارے گئے۔ روس دس سال افغانستان میں رہا۔ اس دوران پندرہ لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ عراق میں امریکہ کو آئے تقریباً دس سال ہو چکے ہیں اور اب تک وہاں دس لاکھ مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ مگر قیام پاکستان کے وقت صرف آٹھ سے نو ماہ کے عرصے میں پچاس لاکھ مسلمانوں کو انتہائی بے دردی سے قتل کیا گیا۔ مغربی پنجاب کے کنوؤں کا پانی پینے کے قابل نہ رہا تھا، کیونکہ وہ کنوئیں مسلمانوں کی لاشوں سے اٹے پڑے تھے۔ مسلمان لڑکیاں اپنی عزت کی حفاظت کیلئے کنوؤں میں کود جاتی تھیں، مگر کچھ لڑکیاں اس لیے بچ جاتیں کہ کنوؤں میں پہلے سے موجود لاشوں کی اتنی کثرت ہوتی کہ ان کے ڈوبنے کے لیے نہ پانی ہوتا نہ جگہ۔ پھر یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ جب ہندوؤں اور سکھوں کی جانب سے مسلمان قصوں اور دیہاتوں پر فائرنگ ہوتی تو مسلمان لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر گولیوں کی بوچھاڑ کے سامنے آجایا کرتیں۔ وہ مرنا قبول کر لیتیں مگر خود کو ہندوؤں کے حوالے نہ کرتیں۔ ہندو مصنفین اب خود یہ حقائق بیان کر رہے ہیں۔

پچاس لاکھ مہاجر جو، ہجرت کر کے پاکستان پہنچے، وہ عام لوگ نہیں تھے۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ہزار سالہ تہذیب کے نمائندہ لوگ تھے۔ ان میں مزدور اور کسانوں سے لیکر علماء، دانشور، اساتذہ اور ادیب تک شامل تھے۔ انہوں نے اپنی زمینیں، جائیدادیں، لائبریریاں اور تمام اثاثے ہندوستان چھوڑ دیئے اور لٹے پٹے پاکستان پہنچے۔ آدھے تو راستے میں ہی کٹ گئے، جو بچے ان کے آگے ایک ہی مقصد تھا۔ بقاء!

میرے والدین نے بھی ہجرت کی تھی، اور میرے والدین کے والدین نے بھی۔ اس وقت میرے والد میڈیکل کالج میں پڑھتے تھے۔ پاکستان آنے کے بعد انہوں نے پاک فوج میں شمولیت اختیار کی۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد ’’اوکیوی ٹرسٹ‘‘ پر اپرٹی

بورڈ“ (Evacuee Trust Property Board) کے نام سے ایک ادارہ بنایا گیا کہ جس کی ذمہ داری یہ تھی کہ ہندوستان میں جاگیریں اور جائیدادیں چھوڑ کر آنے والے لوگوں کو پاکستان میں زمینیں اور جائیدادیں دے۔ ایک قانون یہ بنایا گیا کہ وہ لوگ ہندوستان جائیں اور کاغذات بنوالائیں کہ جن میں یہ لکھا ہو کہ فلاں کے پاس اتنے ایکڑ زمین، اتنے مکانات اور باغات تھے۔ ان کاغذات کی روشنی میں سب کو یہاں اتنی ہی جائیداد دی جاتی تھی۔ جائیداد اور زمینوں کے حصول کیلئے لوگوں نے رشوت اور بدعنوانی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ قارئین نے اگر اس حوالے سے تفصیل جانی ہو تو قدرت اللہ شہاب کی کتاب ”شہاب نامہ“ پڑھیے۔ اس لوٹ مار کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاہل اور بدعنوان لوگ جائیدادوں اور جاگیروں کے مالک بن کر شرفاء بن بیٹھے اور حقیقی شرفاء نوکریاں اور کھیتی باڑی کر کے اپنی زندگیاں گزارنے لگے۔ پورا سماجی ڈھانچہ ہی تبدیل ہو گیا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بھی یہی ہوا تھا۔ حقیقی اشرافیہ کو انگریزوں نے شہید کر دیا اور غداروں کو جاگیردار بنادیا گیا۔ آج جو طبقہ پاکستان پر حکومت کر رہا ہے، سو سال پہلے یہ سب لوگ انگریزوں کے ملازم تھے۔ کوئی انگریزوں کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرتا تھا، کوئی ان کے جوتے پالش کرتا۔ انگریز خوش ہو کر انہیں جاگیروں اور جائیدادوں سے نواز دیتا۔ درحقیقت ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جن لوگوں نے مسلمانوں سے غداری کی اور انگریزوں کا ساتھ دیا، ان کو جاگیریں دی گئیں۔ یہ سب تاریخ رقم ہے مگر ہمیں پڑھائی نہیں جاتی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جو طبقہ اشرافیہ سامنے آیا وہ انگریزوں کے وفاداروں اور قوم کے غداروں پر مشتمل تھا۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد قائد اعظمؒ کا انتقال ہو گیا۔ کچھ سال بعد لیاقت علی خانؒ کو بھی شہید کر دیا گیا۔ صاحب علم اشرافیہ بے چارے ادھر ادھر بکھر گئے۔ غلام محمد جیسے معذور شخص کو، جو کہ بول بھی نہیں سکتا تھا، ملک کا صدر بنادیا گیا۔ اس کی سیکرٹری ”مس بورل“ ایک امریکی خاتون تھیں۔ چونکہ لوگ یہ نہیں سمجھ پاتے تھے کہ صدر صاحب کیا کہہ رہے ہیں، لہذا مس بورل اپنی مرضی کا ترجمہ کر کے سب کو یہ بتاتی تھیں کہ صدر صاحب یہ کہہ رہے ہیں۔ مس بورل کی بتائی ہوئی باتوں پر پاکستان کے قانون بنے۔ کیا آپ یقین کریں گے! ایک امریکی لڑکی صدر پاکستان کی سیکرٹری تھی اور اس کی مرضی سے حکومت چلتی تھی۔ ان حالات میں پاکستان کا نظریہ کیسے پنپ سکتا تھا؟

اس کے بعد ایوب خان نے کافی اچھے کام کیے۔ ایوب کے دور میں بننے والا پانچ سالہ منصوبہ پاکستان کی تاریخ کا بہترین منصوبہ تھا۔ تربیلا اور منگلا ڈیم بھی اسی دور میں بنے۔ نہروں اور سڑکوں کا نظام بہتر بنایا گیا۔ لیکن یہ ساری ترقی نظریے کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ایوب خان کے جانے کے چند سال بعد ہی پاکستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور مشرقی پاکستان، بنگلہ دیش بن گیا۔ پاکستان کے ٹوٹنے کا سامان قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی شروع ہو گیا تھا کہ جب یہ فتنہ کھڑا ہوا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی یا بنگالی؟ مولانا بھاشانی نے ۱۹۵۶ء میں ہی یہ کہہ دیا تھا، ”ہم پاکستان کو اسلام و علیکم کہتے ہیں“۔ یعنی شروع ہی سے فساد کھڑا کر دیا گیا تھا۔ پاکستان ۷۱ء میں نہیں ۵۶ء ہی میں ٹوٹ گیا تھا۔



جو چیز ہمیں جوڑ سکتی ہے وہ اسلام اور پاکستانیت ہے۔ اس پر حکمرانوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ اگر اسلام اور پاکستان کو کمزور کریں گے تو پھر صوبائی خود مختاری کے نام پر پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ پہلے ہی پوری مسلمان دنیا کو مزید تقسیم کرنے کیلئے پورے مشرق وسطیٰ میں خونریز جنگیں برپا کر دی گئی ہیں۔ بڑے بڑے مسلمان ممالک، عراق، شام، مصر، لیبیا، سوڈان، یمن کو قومیت، لسانیت اور فرقہ واریت کی بنیادوں پر مسمار کیا جا رہا ہے۔ پاکستان پر بھی شدید حملے جاری ہیں۔ عرب دنیا مکمل طور پر تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ اگر کوئی مسلمان ملک بچے ہیں تو وہ ترکی، ایران اور پاکستان ہیں۔ پاکستان عالم اسلام کا سب سے مضبوط ترین ملک اور ایٹمی طاقت ہے۔ اگر پاکستان کو، نعوذ باللہ، کچھ ہو گیا تو امت مسلمہ کا مستقبل ڈوب جائے گا۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ امت مسلمہ کی سب سے خوش قسمت نسل آپ ہیں۔ اس موقع کو ضائع مت کیجیے۔ ہم مزید ۲۰ سے ۳۰ سال ایک اور نسل کا انتظار نہیں کر سکتے۔ یہ کام آپ کو ہی کرنا ہوگا!

سوال: کیا ہم تحریک پاکستان کو جہاد کہہ سکتے ہیں؟

جواب: ہر دور میں معاملات جو سمت اختیار کرتے ہیں اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی حکمت شامل ہوتی ہے۔ اللہ کی مرضی اور اس کے رازوں کو سمجھیے۔ اگر سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کے دور میں کوئی شخص یہ کہتا کہ میں قلم سے جہاد کروں گا تو اللہ تعالیٰ اس کا جہاد قبول نہیں فرماتا، کیونکہ اس دور میں جہاد بالسیف کی ضرورت تھی۔ دشمن مسلمانوں کی صفوں میں گھس آیا تھا۔ پوری جماعت قیام میں ہو اور آپ رکوع میں چلے جائیں اور کہیں کہ میں بڑی نیکی کا کام کر رہا ہوں، تو اللہ آپ کی اس نیکی کو ٹھوکر مار دے گا۔ کیونکہ آپ کو جماعت کے ساتھ ہی چلنا ہے۔ اللہ کی منشاء اسی میں ہے۔

یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا

کبھی ایسا دور بھی آتا ہے کہ جب تلوار سے جہاد کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس وقت اگر تلوار نکال لی جائے اور کہا جائے کہ میں جہاد کر رہا ہوں تو فساد ہی پیدا ہوگا۔ آج پاکستان میں ایسے بہت سے گروہ ہیں کہ جو خود کش حملے کر کے نام نہاد اسلامی نظام لانے کی بات کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ جہاد کر رہے ہیں، حالانکہ وہ فساد کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو جہنم کے بدترین گڑھوں میں تباہ و برباد کرے کہ وہ بے گناہ مسلمانوں کو شہید کر رہے ہیں۔ پاکستان میں شریعت نافذ کرنے کیلئے پاکستان کی حکومت اور مسلمانوں کے خلاف تلوار نکالنے کی نہیں بلکہ علمی، نظریاتی، روحانی، قانونی اور فکری جدوجہد کی ضرورت ہے۔ افغانستان سے امریکی فوجوں کو بیدخل کرنے اور کشمیر آزاد کرانے کیلئے تلوار کی ضرورت ہے۔ اس فرق کو سمجھنا لازم ہے، ورنہ دنیا میں بھی فساد پھیلے گا اور آخرت بھی تباہ ہوگی۔

میسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کا سب سے بڑا جہاد یہی تھا کہ اپنے لیے الگ خطہ زمین حاصل کرنے کیلئے اپنا سب کچھ قربان کر دیں۔ آج کے دور میں سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ پاکستان کے دفاع کیلئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا جائے، تاکہ آنے والے دور میں

پاکستان میں شریعت کا نفاذ کر کے اس کو امت مسلمہ کے اتحاد اور عروج کا مرکز بنایا جاسکے۔ پاکستان کے قیام کی جدوجہد بھی جہاد تھی، اور آج پاکستان کا دفاع بھی جہاد ہے۔ جس نے اس میں شک کیا، وہ ہلاک ہوا۔

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس کو کامیابی ملی تو مسلمان بہت دلبرداشتہ ہوئے۔ بہت سے مسلمانوں کو مسلم لیگ پر یقین ہی نہیں تھا، لہذا انہوں نے کانگریس کو ووٹ دیئے۔ کانگریس نے کامیابی کے بعد اپنی حکومت والے صوبوں میں اذان پر پابندی لگا دی، مسلمان بچوں کو ہندو ترانہ ”وندے ماترم“ پڑھنے پر مجبور کیا گیا اور مسلمانوں کا جینا حرام کر دیا گیا۔ یہی ہندو تھے کہ جن پر مسلمانوں نے ہزار سال حکومت کی اور کبھی انہیں مسلمانوں سے کوئی شکایت نہ ہوئی تھی۔ اگر مسلمان تلوار کے زور پر ہندوؤں کو مسلمان کرتے، تو ایک ہزار سالہ دور حکومت کے بعد ہندوستان میں ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا۔ مگر ہزار سالہ غلامی کے بعد، جب کانگریس کو چند سال کیلئے صوبائی حکومتیں ملیں تو انہوں نے طاقت کے زور پر مسلمانوں کو ہندو بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

قائد اعظم تقریباً پندرہ سال تک کانگریس کے رکن رہے تھے۔ ان سے زیادہ برداشت رکھنے والا رہنما کوئی نہیں تھا۔ وہ ہندو، مسلمان، سکھ اور پارسی سب کو ساتھ لے کر چلنے کے خواہاں تھے۔ مگر بعد میں ہندوؤں کے معصب رویے سے تنگ آ کر کانگریس چھوڑ دی اور مسلم لیگ میں شامل ہو گئے۔ اس واقعے میں مسلمانوں کیلئے بڑا سبق ہے کہ اگر قائد اعظم جیسا صلح جو رہنما بھی ہندوؤں کے ساتھ گزارا نہیں کر سکا اور اسے کانگریس چھوڑنی پڑی تو کوئی اور مسلمان ہندوؤں کے ساتھ کیسے گزارہ کر سکتا ہے؟



مگر ۱۹۳۰ء کی دہائی میں قائد اعظم مسلمانوں کے رویے سے اس قدر مایوس ہو گئے کہ ہندوستان چھوڑ کر برطانیہ چلے گئے۔ علامہ اقبال ان سے ملنے برطانیہ گئے اور انہیں سمجھایا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے اور آپ ہی ان کی قیادت کر سکتے ہیں۔ علامہ اقبال کی اس ترغیب کے بعد ہی قائد اعظم واپس ہندوستان تشریف لائے اور ہند کے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی۔ ۱۹۳۹ء میں جب کانگریس کی حکومت ٹوٹی تو قائد اعظم نے مسلمانوں کو ”یوم نجات“ منانے کو





"WE HAVE NO ORDERS TO SAVE YOU"

GUJARAT RIOTS WERE PLANNED

# 1044 people killed gujarat 2002 riots

The more the two sides try and tell attention to their religious differences by slaughtering each other, the less there is to distinguish them from one another. They worship at the same altar. They're both apostles of the same murderous god, whoever he is. In an atmosphere so vitiated, for anybody, and in particular the Prime Minister, to arbitrarily decree exactly where the cycle started is malevolent and irresponsible.

It's a shame that Gujarat people have chosen a man as their CM again, who is responsible for thousands of deaths.

# burnt alive

کہا۔ ہندوؤں کے ظلم کو دیکھنے کے بعد ہی مسلمانوں کو ہوش آیا اور انہوں نے قیام پاکستان کیلئے جدوجہد شروع کی، اور ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی۔

آج کہنے کو تو ہندوستان میں ۲۵ کروڑ مسلمان ہیں، مگر ان کی حالت اچھوتوں سے بھی بدتر ہے۔ آپ جب بھی وہاں الیکشن کرائیں گے، ۹۹ فیصد سیٹیں ہندو یا غیر مسلم ہی جیتیں گے۔ کانگریس نے چند کرائے کے مولوی رکھے ہوئے ہیں، کہ جو ذرائع ابلاغ کے سامنے یہ کہتے ہیں کہ مسلمان یہاں بہت خوش ہیں اور بہت اچھی حالت میں ہیں، مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہندوستان کا سابق صدر ڈاکٹر عبدالکلام بظاہر تو مسلمان تھا، مگر وہ ہندوؤں سے بھی بڑھ کر ہندو تھا، مندروں میں جا کر پوجا کرتا۔ چند اداکاروں مثلاً شاہ رخ خان، سلمان خان وغیرہ کو دکھا کر بتایا جاتا ہے کہ ہم ہندوستان میں مسلمانوں کو بہت عزت دیتے ہیں، مگر ہندوستان ہی کی مسلمان اداکارہ شبا نہ اعظمی کا بیان آیا کہ انہیں ممبئی میں کرائے پر مکان نہیں ملتا، کیونکہ وہ مسلمان ہیں۔ اب ہندو صیہونی زیندر مودی کے اقتدار میں آنے کے بعد تو ہر لمحے مسلمانوں کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ گجرات جیسے قتل عام ہر شہر میں برپا کیے جائیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی نہ جان سلامت ہے، نہ مال، نہ عزت، نہ آبرو، نہ ایمان۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی دردناک حالت کو دیکھ کر قائد اعظمؒ اور اقبالؒ کی فہم و فراست پر یقین ہو جاتا ہے کہ کیوں وہ ایک آزاد مسلمان ریاست کے قیام کیلئے جدوجہد کرتے رہے۔ بلاشبہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی بقاء کا سوال تھا۔

آج جو لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا، وہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے



ہیں۔ ہم ان سے پوچھنا چاہیں گے کہ کیا آپ کا شعور قائد اعظمؒ سے زیادہ ہے؟ کیا آپ کی فراست اقبالؒ سے زیادہ ہے؟ میسویں صدی کے سب سے بڑے مفکر اور دانشور، چاہے مشرق کی بات ہو یا مغرب کی، اقبالؒ ہی تھے۔ اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء کے خطبہ الہ آباد میں یہ نہیں کہا تھا کہ ”پاکستان کو الگ ہونا چاہیے“۔ بلکہ انہوں نے کہا تھا کہ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ہوگا۔“ یعنی انہوں نے پیشین گوئی کی تھی۔

تحریک پاکستان کے دوران تلوار نکالنے کی اجازت نہیں تھی۔ پاکستان عوامی، مذہبی، سیاسی و روحانی تحریک کے ذریعے وجود میں آیا۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے بعد جب مسلم لیگ نے یہ فیصلہ کر لیا کہ مسلمان ہرگز پاکستان کے دعوے سے دستبردار نہیں ہونگے تو انگریزوں نے بھی بھرپور مزاحمت کی۔ اس وقت قائد اعظمؒ نے مسلمانوں کو گھروں سے نکل کر Direct Action یعنی باقاعدہ مسلح جدوجہد کرنے کی اجازت دے دی۔ اس پر انگریز حکومت سرسیمہ ہو گئی اور مطالبہ پاکستان کو تسلیم کر لیا گیا۔ جہاں براہ راست عمل کی ضرورت تھی، وہاں مسلمانوں نے عمل کا راستہ اپنایا۔ جہاں تدبیر کی ضرورت تھی، وہاں تدبیر کی۔ ہجرت کے دوران مسلمان چونکہ نہتے ہوتے تھے، لہذا پورے کے پورے قافلے مار دیئے جاتے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر آنے والی کئی ریل گاڑیوں میں سے صرف لاشیں نکلتیں، جبکہ پاکستان سے دہلی پہنچنے والی ریل گاڑیوں میں سے زندہ لوگ ہی برآمد ہوتے۔ پاکستان سے ہندوستان ہجرت کرنے والے ہندو اور سکھ اپنا سب کچھ ساتھ لے کر گئے، کیونکہ پاک فوج نے قتل و غارتگری اور لوٹ مار کا بازار گرم نہ ہونے دیا تھا۔ ممتاز مفتی کی کتاب ”الکھنگری“ میں یہ واقعہ تحریر کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے قتل و غارت کے جواب میں، انکے گاؤں کے نوجوانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور جوش میں لوگوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی ہندوؤں اور سکھوں کو قتل کریں گے، مگر گاؤں کی عورتیں راستے میں آگئیں اور اپنے مردوں کو انتقامی کارروائی سے روکا۔ مگر ہندوستان میں ہندوؤں اور سکھوں نے ظلم کی انتہا کر دی۔

پاکستان کی قدر کیجیے۔ اس آزادی کی قدر کریں کہ جو ہمیں حاصل ہے۔ ایک لمحے کیلئے سوچیں کہ ہم نے پاکستان کیوں بنایا؟ کیوں اتنی قربانیاں دیں؟ ہر شخص خود اپنا ذمہ دار ہے۔ اگر کوئی نہ سمجھنا چاہے تو اسے سمجھنا ناممکن نہیں، لیکن آنے والا دور پڑھے لکھے ذمہ دار نوجوانوں کا ہے۔ وہ نوجوان جو شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں، انہیں ہم کہیں گے کہ ہوش میں آؤ!

پوری دنیا کے کفار ہمیں ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ بونیا کے مسلمان اگرچہ مغرب زدہ تھے، مگر جب ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۶ء کے درمیان یوگوسلاویہ کو توڑنے کیلئے خانہ جنگی شروع کی گئی، تو جس طرح بونیا کے مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اسکی مثال نہیں ملتی۔ قتل عام کرنے والے عیسائی تھے۔ ان کے لیے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ یورپ میں کوئی مسلمان ریاست ہو، لہذا بونیا کے مسلمانوں کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اقوام متحدہ کو نظر انداز کر کے جس طرح دو لاکھ مسلمان عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کو ذبح کیا گیا، اسکے ذکر سے ہی انسان کے روگئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک لاکھ سے زائد مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جب انگریزوں نے بیت المقدس شریف پر قبضہ کر لیا، اور خلافت عثمانیہ کو توڑ کر ترک مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا تھا

اور عرب بغاوتیں کر رہے تھے، تو اس وقت بھی مسلمان خون کے آنسو رو رہے تھے۔ تب علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

مسلمانوں کو مسلمانوں کو کر دیا طوفان مغرب نے

بونیایا کے مسلمان اب کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمان کرنے والے سربیا کے لوگ تھے۔ اگر وہ ہم پر ظلم نہ کرتے تو ہمیں یاد ہی نہ آتا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔

اپنی شناخت کو پہچانو! اگر تم اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ سے اپنا تعلق مضبوط نہیں کرو گے، تو تمہارا دشمن تمہیں نہیں چھوڑے گا۔ تم اپنے آپ کو پہچانو یا نہ پہچانو، تمہارا دشمن تو تمہیں خوب پہچانتا ہے۔ تمہارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ صرف دشمن کا مقابلہ ہی نہیں کرنا، بلکہ اپنا نظریہ اور اپنی سوچ بھی دنیا کے سامنے پیش کرنی ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، دونوں میں اس وقت ایک بہت بڑا نظریاتی اور روحانی خلاء ہے، اور اب یہ امت مسلمہ کے نوجوانوں کی ذمہ داری ہے کہ انسانیت کی قیادت سنبھالیں۔

اس وقت انسان نے بہت سے خدا بنارکھے ہیں۔ ان میں سے اشتراکیت تباہ ہو چکی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام تباہ ہو رہا ہے۔ اسی لیے مغربی استعمار اسلام سے خوفزدہ ہے۔ کبھی حجاب پر اور کبھی مساجد کے مینار پر پابندی لگا دیتے ہیں۔ پوری دنیا میں اسلام کو دہشت گرد مذہب کے طور پر پیش کرنے کی منظم سازش جاری ہے۔ حتیٰ کہ عراق میں بدترین دہشت گردوں کو اسلامی خلافت کا علمبردار بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود مغربی دنیا میں اسلام سب سے زیادہ تیزی سے پھیلنے والا دین ہے۔ فرانس میں تو یہ حال ہے کہ انکو خطرہ لاحق ہو گیا ہے کہ آئندہ پچیس سالوں میں فرانس میں اتنے مسلمان ہو جائیں گے کہ شاید فرانس یورپ کا پہلا اسلامی ملک بن جائے۔

پاکستان کے نوجوانوں کو جس طرح مغرب زدہ اور ہندوستانی ثقافت کا رسیا بنایا جا رہا ہے، وہ بہت تکلیف دہ ہے۔ اردو زبان کو بھی تباہ کیا جا رہا ہے۔ اقبالؒ کا کافی زیادہ کلام اردو میں ہے۔ دین کے حوالے سے بھی اردو میں بہت زیادہ کام ہو چکا ہے۔ ہماری تاریخ بھی اردو زبان میں لکھی گئی ہے، لیکن آج کے نوجوان اردو نہیں پڑھتے، اردو نہیں سیکھتے۔ انہیں عربی اور فارسی سے بھی واقفیت نہیں ہے۔ ساری توجہ کمپیوٹر اور ٹی وی پر ہے۔ ہماری اسلامیات اور مطالعہ پاکستان کی کتابیں عیسائی آکسفورڈ اور کیمرج میں لکھتے ہیں۔ ہم نے آٹھویں نویں کلاس کی مطالعہ پاکستان کی کتاب اٹھا کر دیکھی تو اس میں پاکستان کا نام تک نہیں تھا۔ وہ کتاب آکسفورڈ یونیورسٹی کی شائع شدہ تھی۔ اس میں گندھارا تہذیب کا ذکر تھا، اشوکا کی بات ہوئی تھی، چندر گپتا کے حوالے سے بھی بتایا گیا مگر پوری کتاب میں پاکستان کا ذکر تک موجود نہ تھا۔ ایک ایسی قوم کہ جو اپنی تاریخ سے ناواقف ہو، ایک ایسے پودے کی مانند ہوتی ہے کہ جس کی جڑیں زمین سے اکھڑ چکی ہوں۔

اس وقت اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ ہماری نوجوان نسل اردو دیکھے اور سمجھے۔ یہ مشکل کام نہیں ہے۔ چھ سات ماہ اردو کتابیں پڑھیں



آپ کی اردو اچھی ہو جائیگی۔ نسیم حجازی کے ناول، علامہ اقبالؒ کی شاعری، قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی کی کتابیں پڑھیں۔ مسلمان غازیوں کے کارناموں پر مبنی کتابیں پڑھیں۔ ان موضوعات پر انگریزی کی کتابیں اتنی اچھی نہیں ہیں کہ جتنی اردو میں ہیں یا عربی اور فارسی میں۔ تھوڑی محنت کریں۔ اردو، عربی اور فارسی سیکھیں۔ فارسی اردو کے بہت قریب ہے۔ اقبالؒ کا تقریباً ۵۰ فیصد کلام فارسی میں ہے جسے سمجھنے کیلئے فارسی آنا بہت ضروری ہے۔ ہمیں اپنی اساس کی طرف لوٹنا ہے۔ آج وعدہ کریں کہ ہم نے اردو زبان کو دوبارہ زندہ کرنا ہے۔

اقبالؒ کے کلام کو پڑھ کر یقیناً آپ میں نیا جوش و جذبہ بیدار ہوگا۔ اقبالؒ کا کلام اللہ کی طرف سے بہت بڑا تحفہ ہے۔ اس کو ضائع مت کیجیے، اس کی قدر کیجیے گا۔ اقبالؒ کے کلام کو پڑھیے، ممکن نہیں کہ آپ کے شعور میں انقلاب نہ برپا ہو اور آپ کے وجود میں عشق رسول ﷺ کی آگ نہ بھڑک اٹھے۔









## قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان

قرآن پاک حضور ﷺ کا زندہ جاوید معجزہ ہے۔ یہ دنیا کی واحد الہامی کتاب ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اس کے ایک نکتے اور زیروزبر تک میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ ہمارے بزرگ قرآن پاک سے اس قدر رہنمائی لیتے تھے کہ کچھ کا کہنا ہے کہ اگر ان کی سوئی یا اونٹ بھی گم ہو جاتا تو اسے بھی وہ قرآن کے صفحات میں تلاش کرتے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے ایک ایک مسئلے کے حل کیلئے سو سو بار قرآن کا مطالعہ کیا۔ اسی قرآن کی بنیاد پر مسلمانوں نے سائنس و ٹیکنالوجی کو بھی فروغ دیا۔ ہمارے دین کا کمال ہی یہ ہے کہ یہ دین و دنیا میں فرق نہیں کرتا۔ چنانچہ اقبالؒ کہتے ہیں:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلمان ہو کر

اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہو کر

مسلمانوں نے جب بھی قرونِ اولیٰ اور اس کے بعد کے ادوار میں امتِ مسلمہ کی عزت و آبرو کا پرچم بلند کیا، تو اسکے پیچھے مسلمانوں کی روحانی اساس قرآن پاک ہی تھا۔ قرآن پاک سے تعلق اور حضور ﷺ کا عشق، ادب اور احترام ہی وہ بنیادی ستون تھے کہ جن کی بناء پر امتِ مسلمہ ہمیشہ عزت و آبرو اور فتح حاصل کرتی رہی۔ آج جب ہم دوبارہ عروج کے حصول کی کوششیں کر رہے ہیں، تو یہ لازم ہے کہ ہم بھی قرآن پاک سے تعلق جوڑیں۔ قرآن کی وہ تشریح کریں کہ جو ایک عام انسان کو بندہء مؤمن بناتی ہے۔ قرآن کی وہ تفسیر کریں کہ

جس پر عمل کر کے بندہ مومن کی اذراں میں وہ تاثیر پیدا ہوتی ہے کہ جس سے شبستان وجود لرزتا ہے۔

ہمارے بزرگوں کو کامل یقین ہوتا تھا کہ انہیں ان کے مسائل کا حل صرف قرآن پاک میں ہی ملے گا۔ جب وہ روحانی اساس قائم تھی کہ جس کی بنیاد قرآن اور حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ پر تھی، تو یہ وہ وقت تھا کہ جب مسلمان دنیا کے ہر کونے میں اللہ کے پیغام کی اذرائیں دے رہے تھے۔ چین سے لیکر یورپ تک مسلمانوں کی سلطنت قائم تھی۔ یہ سب قرآن سے فیض لینے کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔

اسی قرآن کو بنیاد بنا کر مسلمانوں نے معاشرتی علوم میں ترقی کی، سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عدالتی نظام قائم کیے اور سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی نمایاں کارنامے سرانجام دیے۔ ہمارے مذہب کا کمال ہی یہ ہے کہ یہ دین اور دنیا کو الگ الگ نہیں کرتا۔ دین الگ اور دنیا الگ، عیسائیوں کا نظریہ ہے۔ جبکہ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ دنیا گزارنے کا نام ہی دین ہے۔ انسان دنیا میں جو کچھ بھی کرتا ہے، اسکا اٹھنا، بیٹھنا، سونا، جاگنا سب کچھ اللہ تعالیٰ کیلئے ہوتا ہے۔ ”قُلْ اِنْ صَلَاتِي وَنَسْكَی وَمَحِیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ“ (الانعام، ۱۶۲) مسلمانوں کا ہر وہ عمل کہ جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کیلئے اور اسلام کی بہتری کیلئے کرتے ہیں، وہ سب دین اور عبادت ہے۔

قرآن ایک زندہ طاقت ہے۔ یہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہے کہ ہم اسے بیٹیوں کی رخصتی کرتے وقت فقط ان کے سروں پر رکھ دیں یا برکت کیلئے چند الفاظ پڑھ لیں، اگرچہ قرآن کو چھونا اور الفاظ کو پڑھنا بھی باعث خیر و برکت ہے۔ اگر اللہ نے یہ برکت بھی نہ رکھی ہوتی تو شاید آج ہم اس قرآن کو پڑھنے اور ہاتھ لگانے کی زحمت بھی نہ گوارا کرتے۔ مگر قرآن ہدایت اور عمل دونوں کی کتاب ہے۔ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے۔ ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ تھا کہ اگر ان کے پاس کوئی شخص کوئی مسئلہ لے کر حاضر ہوتا اور اسکا حل دریافت کرتا، تو وہ پہلے اس شخص سے پوچھتے کہ کیا آجکل کے زمانے میں یہ مسئلہ کسی کو درپیش ہے؟ اگر جواب ملتا کہ نہیں! یہ خیالی مسئلہ ہے اور فی الحال کسی کو درپیش نہیں، تو بزرگ یہ جواب دیتے کہ جب آنے والے ادوار میں امت کو یہ مسئلہ درپیش ہوگا، تو اس وقت کے علماء قرآن و سنت کی روشنی میں اسکا جواب دے دیں گے۔

حضور ﷺ نے جب معاذ بن جبلؓ کو یمن کی مہم پر روانہ فرمایا تو پوچھا: ”معاذ! فیصلے کیسے کرو گے؟“ حضرت معاذ بن جبلؓ نے جواب دیا: ”یا رسول اللہ ﷺ! قرآن کی مدد سے۔“ پھر حضور ﷺ نے دریافت فرمایا: ”اگر تمہیں قرآن میں کسی مسئلہ کا حل نہ ملے تو؟“ حضرت معاذؓ نے جواب دیا: ”سیدی! آپ کی سنت میں انکا حل ڈھونڈوں گا۔“ رسول اللہ ﷺ نے پھر سوال کیا: ”اگر میری سنت میں بھی تم کو نہ ملے تو؟“ تو پھر حضرت معاذؓ نے جواب دیا: ”تو پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔“ حضور ﷺ نے اس پر خوشی کا اظہار فرمایا کہ یہی صحیح طریقہ ہے، اور پھر آنے والے وقتوں کیلئے اسلامی قانون سازی کیلئے اسی قائدے کو اصول بنا دیا گیا۔ کچھ لوگ اس حدیث مبارکہ میں حضور ﷺ کے سوال کا غلط ترجمہ کرتے ہیں کہ ”اگر قرآن میں نہ ہو تو۔“ یہ انتہائی بے ادبی ہے۔ درحقیقت اسکا ترجمہ یہ ہے

کہ ”اگر تمہیں قرآن میں نہ ملے تو۔“ قرآن میں تو سب مسائل کا حل موجود ہے، یہ انسان کی کمزوری ہوگی کہ اگر اسے وہ حل نہ مل پائے۔ قرآن ایک بحر بیکراں کی مانند ہے کہ جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا، انسان اس میں سے جتنا بھی پانی نکالتا ہے، اپنے ظرف کے مطابق ہی نکالتا ہے۔ حضور ﷺ کے سوال سے بھی یہ بات بالکل ثابت ہو جاتی ہے کہ کائنات کا ہر راز اس قرآن میں موجود ہے، صرف انسان کو وہ معرفت اور فراست چاہیے کہ ان رازوں کو تلاش کر سکے۔

قرآن کی بات کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ قرآن پاک کو روزانہ پڑھنے کا معمول بنایا جائے۔ یہ قرآن ہمارے لیے ایسے کھل جائے اور ہم اس سے ایسے باتیں کریں کہ جس طرح ہم اپنے رب سے بات کر رہے ہوں۔ قرآن بھی اللہ کی صفت کلام کا ایک جزو ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے قرآن کے ذریعے مخاطب ہوتا ہے، اور اسی طرح مخلوق بھی قرآن کے ذریعے اپنے رب سے ہم کلام ہو سکتی ہے۔

آج ہماری نوجوان نسل کے ذہنوں میں کئی طرح کے سوالات ہیں، مثلاً قرآن پڑھنے کے آداب کیا ہیں؟ یہ تو عربی کی کتاب ہے، اس کو کیسے سمجھا جاسکتا ہے؟ بازار میں اس قدر ترجمے اور تفاسیر دستیاب ہیں، ان میں سے کس کا انتخاب کیا جائے؟

قرآن ہر ایک پر اپنے راز نہیں کھولتا، اس کا نزول قلب پر ہوتا ہے، عقل پر نہیں۔ اس حوالے سے قرآن کی آیات بہت واضح ہیں۔ ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ہم قرآن کو عجی زبان میں نازل کرتے تو یہ لوگ کہتے کہ ہمیں قرآن سمجھ نہیں آیا۔ ان سے کہیے کہ کیا عجی اور عربی زبان کی باتیں کرتے ہو، یہ قرآن تو ان سب کیلئے ہدایت اور شفاء ہے کہ جو ایمان لاتے ہیں!

اس آیت سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ قرآن سے ہدایت لینے کیلئے صرف عربی جاننا کافی نہیں ہے، بلکہ ہدایت کی بھی ضرورت ہے۔ عربی سے واقفیت اگرچہ قرآن کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، مگر قرآن سے پوری طرح فیضیاب ہونے کیلئے قلب میں ایمان اور اللہ کی طرف سے ہدایت اور توفیق کا ہونا ضروری ہے۔ اگر صرف عربی زبان سے واقفیت ہی واحد شرط ہوتی، تو آج کوئی عرب گمراہ نہ ہوتا۔ درحقیقت آج سب سے زیادہ فتنوں کا شکار عرب مسلمان ہی ہیں۔ وہ قرآن کی زبان تو جانتے ہیں، مگر قرآن کو نہیں سمجھتے۔ قرآن اپنے راز خود بتاتا ہے۔ یہی وہ قرآن ہے کہ جس سے کئی گمراہ بھی ہوتے ہیں اور یہی وہ قرآن ہے کہ جو بہت سوں کو ہدایت بھی دیتا ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۲۶ اسی حکمت کو بیان کرتی ہے کہ اسی قرآن کو پڑھ کر بہت سے لوگ گمراہ ہوں گے، بہت سے لوگ ہدایت پائیں گے اور صرف فاسق ہی گمراہ ہوں گے۔ پھر قرآن فاسق کی تعریف بھی بیان کرتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اللہ سے کیے ہوئے وعدوں کو توڑتے ہیں اور قطع کرتے ہیں اس رشتے کو، کہ جس کو جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا، نتیجتاً دنیا میں فساد کرتے ہیں۔ آج ہمیں قرآن کی اس آیت کی حقیقت اپنی آنکھوں سے نظر آتی ہے کہ جب دہشت گرد خوارج قرآن پڑھتے ہیں، قرآن سے دلیلیں لاتے ہیں، مگر زمین میں فساد برپا کر رہے ہیں۔ یہی قرآن ان کو گمراہ کر رہا ہے، کہ یہ فاسق ہیں۔





حضور ﷺ کی احادیث مبارکہ سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ آخری دور میں ایسے علماء ہوں گے کہ جو آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے۔ انہی سے فتنہ اٹھے گا اور انہی میں داخل ہو جائیگا۔ قرآن کے الفاظ رہ جائیں گے، مگر ہدایت ختم ہو جائیگی۔ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوں گی، مگر ان نمازیوں کے دل ایمان سے خالی ہوں گے۔ اسلام دور آخر میں اس طرح اجنبی ہو جائے گا کہ جس طرح اپنے آغاز پر تھا۔ آج اسی فتنوں کے دور سے گزر رہے ہیں۔

ان فتنوں سے نمٹنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم قرآن پاک سے اپنا روحانی تعلق قائم کریں۔ ہماری نوجوان نسل کو قرآن سے رجوع کرنا ہوگا۔ آجکل بچے قرآن پڑھنے سے گھبراتے ہیں۔ قرآن پاک پڑھ بھی لیں تو وہ قرآن کا انگریزی یا اردو ترجمہ یا تفسیر پڑھتے ہیں۔ اللہ اس سے بھی ہدایت دے سکتا ہے، لیکن جو الفاظ اللہ نے نازل کیے ہیں، وہ عربی میں ہیں اور ان کو ویسے ہی پڑھنا چاہیے۔ اسی میں خیر ہے۔ اگر قرآن پورے آداب، ایمان اور تکریم کے ساتھ پڑھا جائے، تو وہ انسان کے قلب پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے، چاہے آپ کو عربی آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ جب آپ قرآن سے مانوس ہو جائیں گے، تو عربی بھی سمجھ میں آنا شروع ہو جائیگی، کیونکہ قرآن کے تقریباً ۵۰ فیصد الفاظ وہ ہیں کہ جو اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اب ایسے بھی قرآن پاک آگئے ہیں کہ جن میں ہر ہر لفظ کا اردو میں الگ الگ ترجمہ کیا گیا ہوتا ہے۔ ان عربی الفاظ کا ترجمہ بار بار دیکھنے سے وہ الفاظ یاد ہو جاتے ہیں۔ پھر انسان جب براہ راست عربی میں قرآن پڑھتا ہے تو پھر ترجمہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی، قرآن براہ راست عقل و قلب پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کہتے تھے کہ میں نے زندگی میں بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، مگر زندگی کے آخر میں، میں نے سب کتابیں پرے کر دیں اور اب سب کچھ صرف قرآن سے لیتا ہوں۔ اقبالؒ کا فلسفہ خودی، کہ جو ان کے کلام کی معراج ہے، قرآن کی آیتوں ہی کی تشریح ہے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کو قرآن کا یہ فہم اور حضور ﷺ کی سنت سمجھنے کی اہلیت کیسے عطا ہوئی، کس سے سیکھی؟ تو آپ نے جواب دیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ پر ایک کروڑ مرتبہ درود بھیجا تھا!

## سوالات و جوابات

سوال: قرآن بندہ ءمومن کی کیا صفات بیان کرتا ہے؟

جواب: اقبالؒ کا بندہ ءمومن وہی ہے کہ جو قرآن کا بندہ ءمومن ہے، کہ جن کو اقبالؒ ”پراسرار بندے“ کہتے ہیں:

یہ غازی، یہ تیرے پر اسرار بندے  
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی  
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا  
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

بندہٴ مومن کی شخصیت میں ایک روحانی جہت ہوتی ہے کہ جس کے باعث اس کا کردار لوگوں کو مسحور کر دیتا ہے، مہوت کر دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود صحابہ کرامؓ ہیں۔ بندہٴ مومن نرم دم گفتگو بھی ہوتا ہے، گرم دم جستجو بھی۔ رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل بھی ہوتا ہے اور پاکباز بھی۔

قرآن پاک خود بندہٴ مومن کی صفات بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ ایسے وجود ہوتے ہیں کہ جو ہر حال میں، ہر وقت، اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے رہتے ہیں، چاہے اٹھے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں، اور ساتھ ہی اس قدر عقل و دانش و معرفت کے پیکر ہوتے ہیں کہ ان کی فکر اور سوچ زمین اور آسمانوں کی تخلیق پر تفکر اور تدبر میں غرق ہوتی ہے، یعنی وہ پوری کائنات کے نظام پر غور و فکر کرتے ہیں اور اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اس کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ کی کارگیری کا ہی کمال ہے، اور اللہ تعالیٰ نے کچھ بھی بیکار پیدا نہیں کیا!

یعنی قرآن بندہٴ مومن کی ایسی حیرت انگیز تصویر کھینچتا ہے کہ جو اللہ کے رازوں کو سمجھتے ہیں، خودی کے ترجمان ہوتے ہیں اور خدا کے رازدار، وہ بندہٴ مولا صفات ظاہر میں تو قاری نظر آتے ہیں، مگر حقیقت میں خود قرآن ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کی بشریت کو تخلیق کرنے سے پہلے ہی قرآن پاک کا علم اور نور انسان کے قلب میں داخل کر دیا تھا۔ یہ بات تھوڑی عجیب تو لگتی ہے، مگر اس کی دلیل بھی قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہمارے گھروں میں موجود قرآن، عکسی قرآن ہے۔ اصل قرآن تو ہمارے دلوں میں موجود ہے۔ اس کی دلیل سورۃ الرحمن میں موجود ہے۔ ”الرحمن“۔ رحمان وہ ہے۔ ”علم القرآن“۔ جس نے قرآن سکھایا۔ ”خلق الانسان“۔ پھر انسان کو پیدا کیا۔ ”علمہ البیان“۔ اور پھر اس کو بولنا سکھایا۔ اس ترتیب پر غور کیجیے، یعنی قاری نظر آتا ہے مگر حقیقت میں ہے قرآن۔

سورہ الاعراف، آیت ۱۷۲ میں ہے کہ ”عہد الست“ کے وقت انسانوں نے اللہ تعالیٰ سے عہد کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے سوال کیا تھا ”الست بر بکم؟“ (کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟) انسان نے کہا ”بلی“ (جی ہاں)، آپ ہمارے رب ہیں۔ جب ہم اس دنیا میں آئے تو سب سے پہلے ہم سے اس عہد کی تجدید کروائی گئی۔ کلمہ طیبہ کے پہلے حصے کی شکل میں کہ جس کا مطلب ہے ”نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے“۔ یہ عہد الست کی تجدید ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا: ”بہترین ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور کثرت سے اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہو“، ایمان کی تجدید یہ ہے کہ خود کو یہ یقین دلاتے رہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود، کوئی مطلوب، کوئی محبوب نہیں ہے۔



الْحَمْدُ لِلَّهِ

وَالصَّلَاةِ وَالسَّلَامِ

خَلْفَ الْأَنْبِيَاءِ

وَالصَّلَاةِ وَالسَّلَامِ

محمّد بن عبد الله  
١٤٢١



قرآن فاسق کی یہ تعریف بیان کرتا ہے کہ وہ اللہ سے کیے گئے عہد کو توڑ ڈالتا ہے۔ اسکا کلمہ مکمل نہیں ہوتا، یعنی وہ ”لا الہ الا اللہ“ پر یقین نہیں رکھتا، اس بات کے باوجود کہ عہدالست میں وہ اس کا اقرار کر چکا ہوتا ہے۔ اللہ کو کائنات کا واحد مالک، حاکم، ”رب الناس“، ملک الناس، اللہ الناس،“ نہیں مانتا، یہی وجہ ہے کہ زمین پر فساد برپا کرتا ہے۔ اسکے علاوہ وہ اس رشتے کو بھی توڑتا ہے کہ جس کو جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تھا، یعنی کلمے کے دوسرے حصے، ”محمد الرسول اللہ“ سے نسبت اور تعلق قائم نہیں کرتا۔

جب انسان اللہ سے کیے گئے عہد کی تجدید کرتا ہے، (یعنی لا الہ الا اللہ کہتا ہے) اور وہ اس رشتے کو جوڑتا ہے کہ جس کو جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے، (یعنی محمد الرسول اللہ پر ایمان لاتا ہے) تو پھر انسان کے قلب میں موجود حقیقی قرآن، عکسی قرآن سے ہم آہنگ ہو کر نور بن جاتا ہے اور انسان زمین میں فساد کرنے کے بجائے خیر اور برکت کا باعث بن جاتا ہے۔

لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کے اس کلمہ طیبہ کو خود قرآن نے سورۃ البقرہ میں یوں بیان کیا ہے کہ جس کا مفہوم ہے: ”جس نے طاعت کا کفر کیا، (یعنی لا الہ کہا) اور اللہ پر ایمان لایا (یعنی الا اللہ کہا)، تو وہ عروۃ الوقیٰ علیہ السلام کو ایسے تھام لیتا ہے کہ پھر یہ رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا۔“

ہم نے ”عروۃ الوقیٰ“ کے ساتھ (علیہ السلام) کیوں لگایا؟ حالانکہ اس کا ترجمہ کتابوں اور تفسیروں میں تو صرف ”مضبوط رسی“ ہے۔ مگر جب انسان کو یہ معلوم ہو جائے کہ ”عروۃ الوقیٰ“ اصل میں تو حضور ﷺ کا ایک اسم مبارک ہے، تو پھر اس آیت کی تشریح بالکل مختلف ہو جاتی ہے۔

اس اسم مبارک کی دو دلیلیں ہم پیش کرتے ہیں۔ صوفی برکت علی صاحب نے اسمائے رسول ﷺ پر ایک خوبصورت کتاب لکھی ہے۔ پوری مسلم دنیا میں اسمائے رسول ﷺ کے حوالے سے اتنی خوبصورت کتاب نہیں لکھی گئی۔ یہ کتاب ان کے ادارے کی جانب سے فروخت نہیں کی جاتی، صرف تحفتاً دی جاتی ہے۔ اس کتاب میں حضور ﷺ کا ایک اسم مبارک ”عروۃ الوقیٰ علیہ السلام“ بھی لکھا ہوا ہے۔

اس کے علاوہ حج اور عمرے کے دوران، جب مولجہ شریف پر سلام پیش کرتے ہیں تو پیچھے دیوار پر ترکوں نے بھی حضور ﷺ کے اسمائے مبارکہ تحریر کیے ہوئے ہیں کہ جو باب السلام سے لے کر باب یقیع تک پوری دیوار پر پھیلے ہوئے ہیں۔ روضہ مبارک کے سامنے جو اسمائے مبارک لکھے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک ”عروۃ الوقیٰ علیہ السلام“ بھی ہے۔





اگر انسان کا ”لا الہ الا اللہ“ درست ہو اور اس کا تعلق حضور ﷺ سے مضبوط ہو، تو قرآن اس پر اپنے راز کھولنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر وہ فساد نہیں پھیلاتا، خیر پھیلاتا ہے۔ اگر ہم آنے والے ادوار میں عروج حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا مرکز اور ہماری بنیاد قرآن پاک پر ہونی چاہیے۔

آجکل کے دور میں قرآن کے احکام کو نافذ کیسے کرنا ہے؟ اسکی مثال ہمیں سیرت مبارکہ سے ملتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھا: ”حضور ﷺ کے اخلاق کیسے تھے؟“ حضرت عائشہؓ نے فرمایا: ”کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟“ یعنی حضور ﷺ کے اعمال اور اخلاق بالکل قرآن کے مطابق تھے۔ حضور ﷺ کی سنت قرآن کی تشریح اور عملی نمونہ ہے۔ لہذا قرآن و سنت ہی ہمارا آئین اور قانون ہیں۔ چنانچہ قرآن سے ایک ذاتی روحانی تعلق قائم کرنا ہم پر واجب ہے۔ قرآن سے تعلق قائم کیے بغیر حضور ﷺ سے نسبت اور سنت کی حکمت عطا نہیں ہوتی۔ قرآن اور سنت آپس میں لازم اور ملزوم ہیں۔ کسی ایک کو ترک کریں گے یا اسکی حکمت کو نہ پائیں گے تو دوسرے کی روح سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

سوال: اللہ تعالیٰ سے محبت اور حضور ﷺ سے محبت میں کیا فرق ہے؟

جواب: ایک بندہ مومن کیلئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اللہ سے محبت کا اظہار ہی حضور ﷺ کی محبت سے ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ جو لوگ ایمان لاتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ سے شدید ترین محبت کرتے ہیں۔ مگر اس کی تشریح بھی قرآن نے خود بیان کی ہے اور حضور ﷺ کی احادیث مبارکہ میں بھی بیان فرمائی گئی ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ حضور ﷺ کی طرف سے فرماتا ہے کہ اگر تم دعویٰ کرتے ہو کہ تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو، تو میری اتباع کرو، پھر اللہ بھی تم سے محبت کرنے لگے گا! ایک اور حدیث مبارکہ ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا کہ جب تک میں اسے اس کی جان، مال، اولاد، عزت اور باقی ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں! حضور ﷺ سے محبت اور اتباع ہی اصل میں اللہ سے محبت ہے۔ انسان کا دل چاہتا ہے کہ کسی ایسے وجود سے پیار کرے کہ جو اس جیسا ہو، کہ جس کی وہ خدمت کر سکے، کہ جس سے نسبت قائم کر سکے، کہ جس پر وہ قربان ہو سکے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کا مظہر حضور ﷺ کو بنایا ہے۔ صحابہ کرامؓ جب حضور ﷺ سے ملا کرتے تھے تو فرماتے تھے ”فداک امی وابی یا رسول اللہ ﷺ“، یعنی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ ﷺ۔ حضور ﷺ پر اپنے آپ کو قربان کرنا ہی اصل میں اللہ پر قربان کرنا ہے۔

جب صلح حدیبیہ پر دستخط ہونے والے تھے، تو کفار نے ایک آدمی بھیجا تاکہ وہ جائزہ لے سکے کہ مسلمانوں سے معاہدہ کرنا بھی چاہیے یا نہیں۔ اس شخص نے واپس آکر قریش کے سرداروں کو مشورہ دیا کہ مسلمانوں سے جنگ نہ کرنا۔ میں نے کسریٰ اور نجاشی کے دربار دیکھے ہیں، رومی بادشاہوں کی شان و شوکت کو بھی دیکھا ہے۔ مگر میں نے کسی بادشاہ میں اتنا جلال نہیں دیکھا اور نہ کسی بادشاہ کے درباریوں میں اس بادشاہ کیلئے اتنی عزت و تکریم، محبت اور عشق دیکھا کہ جتنا محمد ﷺ کے وجود میں اور ان کے ماننے والوں میں دیکھا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں کہ حضور ﷺ تھوکتے ہیں اور صحابہ کرامؓ ان کا تھوک زمین پر گرنے سے پہلے اپنے جسم پر مل لیتے ہیں، حضور ﷺ وضو کرتے ہیں تو وضو کا پانی بھی زمین پر نہیں گرتا، بلکہ اسے بھی صحابہؓ اپنے جسم پر مل لیتے ہیں۔ لہذا اس قوم سے جنگ نہ کرو تو بہتر ہے! اس بیان کے بعد ہی کفار نے رعب میں آکر صلح حدیبیہ پر دستخط کر دیئے۔

صحابہ کرامؓ کو حضور ﷺ سے جو عشق تھا اس کی مثالیں حیرت انگیز ہیں۔ کسی صحابیؓ کے دل و دماغ میں بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ حضور ﷺ سے انتہائی درجے کا عشق کہیں شرک نہ ہو۔ کیونکہ ان کے ذہنوں میں اس قسم کی کوئی الجھن نہ تھی۔ یہ شک اور وسوسے صرف شیطان ڈالتا ہے کہ حضور ﷺ کا عشق اور ادب کہیں شرک نہ بن جائے۔ صحابہ کرامؓ تو اپنی جان، مال، عزت و آبرو سب کچھ حضور ﷺ پر نچھاور کرنے کیلئے تیار رہتے اور اسی کو اللہ کی محبت سے تعبیر کرتے تھے۔ خود قرآن میں لکھا ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتا ہے اور جو رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرتا ہے، وہ اللہ کی نافرمانی کرتا ہے۔ جن لوگوں کو رب العالمین کے مقام کا اندازہ نہیں ہو سکتا، انہیں رحمت العالمین ﷺ کے مقام کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر! اللہ تعالیٰ ہر لمحے

حضور ﷺ کے درجات بلند کرتا رہتا ہے، لہذا بندہ ء مومن کی معراج یہ ہے کہ حضور ﷺ کے قدموں میں خود کو قربان کر دے، اور اس بات پر محکم ہو جائے کہ حضور ﷺ کے اصل اور اعلیٰ مقام کا اندازہ سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ جو بھی شخص اپنی محدود عقل سے حضور ﷺ کے مقامات کو سمجھنے کی کوشش کرے گا، غلطی کرے گا، گستاخی کرے گا۔

.....

سوال: ہمارے معاشرے میں آجکل لادینی (سیکولر) خیالات کا بہت پرچار کیا جا رہا ہے کہ جیسے دین اور دنیا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ہم قرآن کی روشنی میں اس کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟

جواب: پوری دنیا میں کفر مسلمانوں کے نظریات اور ان کی اساس پر حملہ کر رہا ہے، تو وہ اس صورت میں کریگا کہ مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھا جائے۔ علامہ اقبالؒ اس صورتحال پر اللہ تعالیٰ کو مخاطب کر کے رو پڑے تھے، کہ جب انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ اے مالک! تیرے احکامات تو برحق ہیں، مگر ہمارے مفسرین تاویل سے قرآن کو کچھ سے کچھ بنادیتے ہیں۔ یعنی غیر ضروری تاویلیں دے کر اسے سنسکرت کی کتاب بنادیتے ہیں۔ قرآن کے کمزور ترجموں کے حوالے سے ایک اور جگہ اقبالؒ کہتے ہیں:

مجر بھی ترا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا

مگر یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا؟

اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ ہمیں قرآن کی روحانی اساس کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور قرآن کو اس طرح پڑھنا چاہیے کہ جیسے اقبالؒ کے والد نے نصیحت کی تھی کہ قرآن ایسے پڑھو کہ جیسے تم پر نازل کیا جا رہا ہو۔ ایک بات یاد رکھیے گا، قرآن حضور ﷺ کیلئے نازل نہیں ہوا، بلکہ حضور ﷺ کے صدقے ہمارے واسطے نازل ہوا ہے، تاکہ ہم ہدایت پائیں۔

قرآن سمجھنے کیلئے وہ عظیم تحفہ کہ جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے، اسے قرآن کی زبان میں ”شرح صدر“ کہتے ہیں۔ شرح صدر کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا وہ خاص نور کہ جس کی روشنی میں انسان اللہ کا راز دار بن جاتا ہے، حکمت قرآن اس پر نازل ہوتی ہے اور اس شخص کو دین کا اصل فہم عطا ہو جاتا ہے۔ شرح صدر ایک روحانی تحفہ ہے کہ جو کتابیں پڑھنے یا زبانیں جاننے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ یہ خاص اللہ کا فضل اور توفیق ہے، کہ جس کو وہ چاہتا ہے، عطا کرتا ہے۔

موسیٰؑ نے بھی اللہ تعالیٰ سے شرح صدر کیلئے دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے شرح صدر عطا فرما، تاکہ مجھے دین کی سمجھ آنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ایک آیت میں جب حضور ﷺ پر اپنے انعامات کا ذکر کیا تو آپ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا: ”کیا ہم نے آپ کو شرح صدر عطا نہیں کیا۔“

”شرح صدر“ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت بڑا تحفہ ہے، مگر لوگ اس کی اہمیت کو نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالیٰ سے ”شرح صدر“ طلب کرنی

چاہیے۔ شرح صدر حاصل ہو جائے، تو اللہ تعالیٰ دین کو سمجھنے میں آسانی فرما دیتا ہے اور قرآن انسان کے سامنے اپنے راز کھولنے لگتا ہے۔ قرآن کی ایک اور آیت کا مفہوم ہے کہ جس کو اللہ تعالیٰ نے اسلام کیلئے شرح صدر عطا کیا ہو، اور پھر وہ اپنے رب کی طرف سے نور پر ہو، تو وہ اس جیسا کیسے ہو سکتا ہے کہ جو پتھر دل ہو اور اللہ کے ذکر سے غافل ہو! اس آیت سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شرح صدر اور دلوں کو نرم کرنے کیلئے اللہ کا ذکر لازم ہے۔

قرآن کو سمجھنا اس وقت تک ممکن نہیں کہ جب تک کوئی مسلمان حضور ﷺ کی سنت کو نہ سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سنت کی حکمت اور شرح صدر کیسے حاصل ہو؟ جس طرح قرآن نے کچھ شرائط عائد کی ہیں کہ قرآن سے ہدایت وہی پاسکتے ہیں کہ جن کا تعلق اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے مضبوط ہوگا، اسی طرح سنت کی حکمت پانے کے حوالے سے بھی کچھ شرائط ہیں۔ ایک آیت ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ بیشک تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سنت ہی بہترین نمونہ ہے، مگر اس کیلئے کہ جو اللہ کو چاہتا ہے، آخرت پر ایمان لاتا ہے اور اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے! یہاں بھی کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کی بات آگئی ہے۔ یعنی قرآن اور سنت دونوں کی حکمت سمجھنے اور شرح صدر کیلئے اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنا ضروری ہے۔

قرآن کی اس آیت کے مطابق، حضور ﷺ کی سنت مبارکہ سے حکمت لینے کی بھی تین شرائط ہیں۔ اللہ کی طلب، آخرت پر ایمان اور ذکر اللہ کی کثرت۔ جو شخص یہ تین شرائط پوری نہیں کرتا، اسے حضور ﷺ کی سنت کی حکمت کبھی سمجھ نہیں آئے گی، وہ خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔

قرآن کی حقیقت کو سمجھنے سے پہلے، انسان کو خود اپنی حقیقت جاننا ہوگی۔ انسان کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے کیا تو تین پوشیدہ رکھی ہیں، ان کے ادراک کے بعد ہی انسان ان تینوں کو استعمال کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ حقیقت انسانی کی معرفت کے حوالے سے اقبالؒ فرماتے ہیں:

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں

وجود حضرت انسان نہ روح ہے نہ بدن!

انسان کی حقیقت نہ اس کا جسم ہے اور نہ ہی اس کی روح، بلکہ اسکی خودی ہے کہ جو اسکے اندر رہتی ہے۔ جس کو سورہ الحجو، آیت ۲۹ ”... نفخت فیہ من روحي“ کی مدد سے سمجھا جاسکتا ہے۔ انسان کی حقیقت جو اسکے اندر رہتی ہے اس میں قلب منیب، قلب سلیم، قلب شہید، نفس امارہ، نفس اوماہ اور نفس مطمئنہ شامل ہیں۔ یہ تمام مسائل فقہ کے نہیں، بلکہ طریقت کے ہیں۔ فقہ کا تعلق انسان کے جسم اور ظاہری مسائل سے ہے، جبکہ طریقت کا تعلق انسان کی حقیقت اور باطنی علوم سے۔ انسان کی حقیقت اور باطن کی تربیت کیلئے قرآن میں ”تزکیہ“ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان جب قرآن پڑھنے بیٹھتا ہے، تو اس وقت تزکیہ کی کیا اہمیت ہے؟ طہارت ظاہری صفائی ہے، مگر



تزکیہ قلب کی صفائی۔ قرآن کو ہاتھ لگانے سے پہلے طہارت ضروری ہے، قرآن کو سمجھنے کیلئے تزکیہ لازم ہے۔ شرح صدر تزکیہ سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

قرآن میں کئی مقامات پر حضور ﷺ کی ذمہ داری بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ آیات کی تلاوت فرماتے ہیں اور مسلمانوں کو سکھاتے ہیں، حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور انکا تزکیہ فرماتے ہیں!

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ تزکیہ کیا جاتا ہے، خود بخود نہیں ہو جاتا۔ تزکیہ کرنا مرشد کی ذمہ داری ہے۔ صرف فقہ کی تعلیم، کتابیں پڑھانے، حدیث سکھانے اور تفسیر سکھانے سے مرشد کی ذمہ داری پوری نہیں ہو جاتی۔ تزکیہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اسکا آغاز ذکر قلبی سے ہوتا ہے، نگاہ مرشد کامل سے ہوتا ہے۔ جب مرشد کامل کی نگاہ کسی پر پڑتی ہے، تو اس کے نصیب کھل جاتے ہیں۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اسکے زور بازو کا!

نگاہِ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جب حضور ﷺ کسی پر پیار کی نگاہ ڈالتے ہیں، تو اس شخص کی تقدیر ہی بدل جاتی ہے، شرح صدر عطا ہو جاتا ہے، دین کی حکمت عطا ہو جاتی ہے، ذہن، فکر اور سوچ پاکیزہ ہو جاتی ہے اور قرآن کا فہم عطا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ حضور ﷺ کی ایک نگاہ سے ہی حضرت ابو ہریرہؓ کا کمزور حافظہ ہمیشہ کیلئے قوی ہو گیا، اور اسکے بعد وہ کوئی حدیث مبارک بھی نہ بھولے۔

ایک مرتبہ ایک جماعت زکوٰۃ لے کر حضور ﷺ کے پاس آئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ زکوٰۃ لے جاؤ اور اپنے علاقے کے غریب لوگوں میں تقسیم کر دو۔ اس جماعت میں سے ایک شخص نے جواب دیا، یا رسول اللہ ﷺ، ہم یہ پہلے ہی کر آئے ہیں۔ اپنے علاقے کے غریبوں کو زکوٰۃ دینے کے بعد جو رقم بچی ہے، وہ ہم لے کر یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ حیران ہو گئے اور حضور ﷺ سے فرمایا کہ اس سے بہتر وفد آج تک ہمارے پاس نہیں آیا۔ حضور ﷺ نے خوش ہو کر فرمایا کہ اللہ نے ان کو شرح صدر عطا کر دیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے پاس آنے سے پہلے ہی وہ کام کر آئے ہیں کہ جو اللہ کی مرضی اور منشا ہے۔

آپ کو قرآن سے تعلق قائم کرنا ہے۔ لا الہ الا اللہ سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ سے محبت کرنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے درود شریف کی کثرت سے، اور اللہ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے اللہ کے ذکر کی کثرت سے۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت کی حکمت تبھی ملتی ہے کہ جب انسان اللہ کا ذکر کثرت سے کرتا ہے۔ اسکے علاوہ اللہ تعالیٰ سے شرح صدر طلب کریں اور ایسا مرشد تلاش کریں کہ جو اپنی نگاہ سے آپ کی تقدیر بدل دے، کہ تیرا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں!







## ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر ہم نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو خلافت راشدہ کی طرز پر دوبارہ بحال کرنا ہے، اگر ہمیں اسلام کا احیاء کرنا ہے، اگر ہمیں اس مقصد کو حاصل کرنا ہے کہ جس کیلئے پاکستان بنا تھا، اور اگر ہمیں پاکستان کو اس مقام پر پہنچانا ہے کہ جو اس کا نصیب ہے، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمیں قرآن سے نسبت اور تعلق کو دوبارہ استوار کرنا ہوگا اور حضور ﷺ کی سنت پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

اب ہمیں اپنی تقدیر خود لکھنی ہے۔ اسکے لیے جس ”لوح و قلم“ کی ضرورت ہوگی، وہ صرف ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ، قرآن پاک سے تعلق اور اس پر عمل کی بدولت ہی ہمیں مل پائیگا۔ اللہ تعالیٰ نے وہی جو ہر ہمیں بھی عطا کیے ہیں کہ جو ہمارے آباؤ اجداد کو عطا کیے تھے، کہ جنہیں اقبالؒ نے ”مردان خود آگاہ و خدا مست“ بتایا ہے اور جنہیں ”پراسرار بندے“ بھی کہا ہے۔ ہمارے پاس بھی اسی قرآن و سنت کی رہنمائی موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے وہی نسبت اور تعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی بخشا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے، ہم شیروں اور دیروں کی اولادیں ہیں اور، ان شاء اللہ، ہم بھی اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چل کر، انہی کے کردار، اخلاق، جرأت، شجاعت، ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ کو لیکر اٹھیں گے۔ اس کا مظاہرہ اب اس موجودہ نسل کو کرنا ہے۔ ہمارے پاس اسکے علاوہ کوئی دوسرا

راستہ موجود نہیں۔

گزشتہ باب میں ہم نے نسبت قرآن کی بات کی تھی اور یہ بتایا تھا کہ قرآن سے فیض کیسے لیا جاتا ہے، سنت مبارکہ سے ہدایت کیسے ملتی ہے، ہم نے شرح صدر کی بات بھی کی اور بتایا تھا کہ اللہ کیسے شرح صدر کے ذریعے بندہ مومن پر اپنے راز کھولتا ہے۔ ہم نے یہ بات بھی کی کہ قرآن کو سمجھنے کیلئے نور قلبی چاہیے، ایمان چاہیے، ہدایت چاہیے کہ جس کو حاصل کرنے کے بعد عربی زبان سمجھنے کی پابندی بھی نہیں باقی رہتی۔ کیونکہ اگر صرف عربی زبان ہی ہدایت کی واحد شرط ہوتی، تو پھر کوئی عرب کبھی گمراہ نہ ہوتا۔ اقبالؒ نے ایسے ہی گمراہ عربوں کے بارے میں کہا تھا:

بچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ

ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں قرآن سے نسبت اور تعلق سے متعلق بہت سوالات ہیں۔ قرآن اب ہماری پسندیدہ ترین کتاب نہیں رہی۔ اب ہم قرآن سے بہت دور ہو گئے ہیں، حتیٰ کہ اسے پڑھنے سے بھی گھبراتے ہیں۔ تقریباً ایک ہزار سال تک مسلم دنیا میں قرآن پاک کا ترجمہ تک نہ کیا گیا، کیونکہ قرآن کو عربی میں ہی پڑھا جاتا اور سب مسلمان عربی سیکھتے۔ ہندوستان میں سب سے پہلا ترجمہ شاہ ولی اللہؒ نے ۸ویں صدی میں، فارسی زبان میں کیا تھا۔ اس سے پہلے لوگ ہندوستان میں بھی قرآن کو عربی زبان میں ہی پڑھتے تھے۔ اس دور میں لوگ عربی زبان بھولنا شروع ہو گئے تھے اسی لیے مجبوراً شاہ ولی اللہ کو فارسی میں ترجمہ کرنا پڑا۔ آج ہم مسلمان دنیا جہاں کے علوم تو سیکھتے ہیں، مگر عربی زبان سے نااہل ہیں۔ یہ ہماری بہت بڑی کوتاہی ہے۔ ہمیں عربی سیکھنے کی ضرورت ہے۔ فارسی سیکھنے کی ضرورت ہے اور اپنی اردو کو بھی بہتر کرنا ہے۔

اگر دل میں نور ایمان اور عشق رسول ﷺ ہو اور ان آداب کا خیال رکھا جائے کہ جو قرآن پڑھنے کیلئے ضروری ہوتے ہیں، تو عربی پر عبور نہ بھی ہو، تب بھی قرآن اپنے راز کھولنا شروع کر دیتا ہے۔ سورۃ واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے تین درجے بتائے ہیں۔ اصحاب الشمال (اٹلے ہاتھ والے) کہ جو جہنم میں جائیں گے اور تباہ و برباد ہوں گے، اصحاب المیمنة (سیدھے ہاتھ والے) جنت میں جائیں گے، تیسرے وہ لوگ کہ جو اللہ تعالیٰ کیلئے سب سے بڑھ کر ہیں۔ ان کیلئے ”مقربون“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی جنتیوں کے بھی دو درجے بتائے گئے ہیں۔ اصحاب المیمین بھی جنت میں جائیں گے اور مقربون بھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جنتیوں کے ان دو درجات میں آخر فرق کیا ہے؟ سورۃ انعام میں ایک آیت ہے کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ جنہوں نے اللہ کی اطاعت کی اور رسول اللہ ﷺ کی بھی، وہ اس خاص درجے پر ہونگے کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہوا ہے اور وہ لوگ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں!

ہم تو مال بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں

جب ہم سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں درجہ انعام پر فائز کر۔ ہم اللہ تعالیٰ سے جنت نہیں طلب کرتے بلکہ ”درجہ انعام“ کی خواہش کرتے ہیں۔ یہ درجہ صرف انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کیلئے ہی مخصوص ہے۔

قرآن پاک کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے، ان سے کہو یہ ایمان نہیں لائے بلکہ اسلام لائے ہیں، ایمان تو ابھی ان کے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا! اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان ہونا ایک درجہ ہے۔ اس سے اوپر دوسرا درجہ مومنین کا ہے کہ جو مسلمان ہونے سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح ایک اور آیت ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ اے ایمان والو! ایمان لے آؤ! یعنی وہ لوگ کہ جو صرف زبانی ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہیں، ان سے کہا جا رہا ہے کہ حقیقی معنوں میں ایمان لاؤ۔

متقی کا مقام مومن سے بھی بڑھ کر ہے۔ سورۃ البقرہ کی آغاز کی آیتوں میں ہی یہ آیت ہے، ”ہدی للمتقین“ کہ جس کا مفہوم ہے کہ یہ ہدایت ہے متقین کیلئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متقین کو جب ہدایت ملتی ہے تو وہ مزید اونچا مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ قرآن میں عام مسلمان، مومن، متقی، محسن، صالح، شہید، صدیق، نبی و رسول کے مختلف درجات بتائے گئے ہیں اور ان سب سے اوپر حضور ﷺ کا مقام ہے۔ مسلمان، مومن، متقی اور محسن تمام کے تمام اصحابِ یمن ہیں، یعنی جنتی ہیں۔ مگر صرف انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہی مقررہوں میں شامل ہیں۔ جنت میں بھی درجات ہیں۔

یہ ایمان اور جنت کے مقامات کی درجہ بندیاں فقہ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ان کا تعلق انسان کے قلب، ایمان اور تزکیہء نفس سے ہے۔

جب انسان قرآن کی روح پر دھیان دیتا ہے اور اپنی توجہ روحانی درجات کی طرف رکھتا ہے تو وہ فرقہ وارانہ اختلافات میں نہیں پھنستا۔ کیونکہ اس کے لیے یہ بات اہم ہو جاتی ہے کہ وہ حضور ﷺ کے کس قدر قریب ہوا؟ کتنا مقرب ہوا؟ اور درجہ انعام تک پہنچا یا نہیں؟

بمطعمنیؑ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر ایک مسلمان درجہ انعام تک نہیں پہنچا تو وہ بھی ایک طرح سے خسارہ ہی ہے۔ جنت میں جانا مشکل نہیں کیونکہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے، مگر اہم بات یہ ہے کہ انسان وہ مقام حاصل کر لے کہ جو اس کو درجہ انعام پر فائز کر کے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی محفل میں مقام دلا دے۔

جس کا عمل ہے بے غرض، اس کی جزا کچھ اور ہے

حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

اقبالؑ جب بندہ مومن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد فقط عام مسلمان نہیں بلکہ وہ غیر معمولی وجود ہیں کہ جو درجہ انعام پر فائز ہیں، جو روحانی احساس رکھتے ہیں اور جو ”پراسرار“ ہیں۔ ان کا اللہ سے خاص تعلق ہوتا ہے کہ جو ان کو ”مقررہوں“ کے درجے پر فائز کرتا



ہے۔ اقبالؒ نے ایسے ”مردانِ خود آگاہ و خدا مست“ کو کہیں ”شاہین“ کہا ہے، کہیں ”شاہین شہہ لولاک“، تو کہیں ”مرد مومن“۔

## سوالات و جوابات

سوال: آجکل ہم یہ بات عام سنتے ہیں کہ اللہ ہماری دعا قبول نہیں کرتا۔ اللہ سے مانگنے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب: ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک شخص طویل سفر کرنے کے بعد خانہ کعبہ پہنچتا ہے، وہ خانہ کعبہ کے پردے کو پکڑ کر کھڑا ہوتا ہے، اسکے بال مٹی میں اٹے ہوتے ہیں، جسم تھکا ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے رورو کر، گڑ گڑا کر دعا کر رہا ہوتا ہے، مگر اللہ فرماتا ہے کہ میں اسکی دعا قبول نہیں کرتا، کیونکہ اسکا وجود حرام میں پلا ہوتا ہے۔

یہ اچھی طرح جان لیجئے کہ دعا کی قبولیت کیلئے بنیادی شرط ہی یہ ہے کہ انسان کا وجود حلال میں پلا ہو۔ آج کے دور میں سب سے بڑا عذاب ہی امت مسلمہ پر یہ آیا ہے کہ ہماری دعائیں قبول ہونا بند ہو گئی ہیں، اور اس کی وجہ سود اور رباء پر مبنی معاشی نظام ہے۔ ہر سال لاکھوں لوگ حج و عمرہ ادا کرتے ہیں مگر ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ آجکل مسلمانوں میں حلال اور حرام کی تمیز ختم ہو گئی ہے۔ اسکے علاوہ دعا اللہ تعالیٰ تک پرواز کر کے اس وقت تک نہیں جاتی کہ جب تک اسکے ساتھ درود پاک کے پر نہ لگا دیئے جائیں۔ دعا کے اول و آخر درود شریف لازماً پڑھنا چاہیے۔ دعا کرنے کے بھی آداب ہوتے ہیں۔ دعا کرتے وقت یہ یقین رکھیں کہ میرا رب میری بات سن رہا ہے۔

دعا دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ کہ جو انسان اپنے لیے کرتا ہے اور دوسری وہ کہ جو دوسرے آپ کیلئے مانگتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں سے دعا کروانا حضور ﷺ کی سنت بھی ہے۔ حضور ﷺ صحابہ کرامؓ سے فرمایا کرتے تھے کہ میرے لیے دعا کیا کرو۔ جس طرح مال کمایا جاتا ہے، اسی طرح دعا کو بھی کمانا پڑتا ہے۔ دعا کرنے والوں کو تلاش کریں، دعائیں کمانے کیلئے گھروں سے نکلیں۔ دعا خدمت اور ادب سے ملتی ہے، لہذا دعا دینے والے کی خدمت اور ادب کریں۔ کوئی شخص جب بے اختیار دعا دیتا ہے تو وہ دعا اللہ کے ہاں رد نہیں ہوتی۔ اگر آپ ایک اجنبی انسان، کہ جسے آپ سے کوئی توقعات نہیں ہیں، کی مدد کریں گے تو اسے جو خوشی محسوس ہوگی اور اس کے نتیجے میں جو دعا اس کے دل سے نکلے گی، وہ کبھی رد نہیں ہوگی۔ چنانچہ جو انسان آپ سے اچھائی کی توقع نہیں رکھتے، ان سے بھی اچھائی کریں۔ جس قدر اللہ تعالیٰ نے طاقت اور استطاعت دی ہو، اسکے مطابق لوگوں کی مدد کریں۔ قرآن پاک میں ایک خوبصورت



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
كَهَيْعَلٍ  
كَرَحْمَةٍ  
كَعَبْدَةٍ زَكِيَّاهُ

آیت ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے محبت اور خشیت کا رویہ رکھتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسکے لیے غیب سے راستے نکالتا ہے اور اسکو ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے کہ جہاں سے اسکو گمان بھی نہیں ہوتا! اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے توکل، تقویٰ، رزق کی کشادگی اور غیب سے اللہ کی مدد کا سارا راز کھول دیا ہے۔

رزق میں مادی اور روحانی، دونوں طرح کا رزق شامل ہے۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر

خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

یعنی آپ جو معاملہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ روارکھیں گے، وہی معاملہ اللہ تعالیٰ آپ کے ساتھ روارکھے گا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ سے درگزر کرے اور آپ کو معاف کر دے، تو آپ بھی اللہ کی مخلوق کو معاف کرنا شروع کر دیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اللہ آپ کو وہاں سے رزق دے کہ جہاں سے آپ کو گمان بھی نہ ہو، تو آپ بھی اللہ کی مخلوق میں ایسے رزق تقسیم کرنا شروع کر دیں کہ جہاں سے ان کو گمان نہ ہو۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ اللہ آپ کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر پردہ ڈال دے، تو آپ بھی اللہ کے بندوں کے گناہوں پر پردے ڈالیں۔ اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جائیں، وہ آپ سے راضی ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ سے شکوے نہ کریں، وہ آپ سے شکوہ نہیں کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب رسول ﷺ پر کثرت سے درود بھیجیں، اللہ تعالیٰ آپ پر رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائیگا۔ اسکو بھی دیں کہ جو مستحق ہو، اور اسکو بھی دیں کہ جو مستحق نہ ہو، تاکہ اللہ آپ کو اس وقت بھی دے کہ جب آپ مستحق ہوں، اور اس وقت بھی دے کہ جب آپ اس کی رحمت کے مستحق نہ ہوں۔

دین کی روح، اس کا مقصد، اس کا فلسفہ آسان فہم اور سیدھا سادہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جو سلوک آپ دوسروں سے روارکھیں گے، وہی سلوک اللہ آپ کے ساتھ روارکھے گا۔ جو رشتہ آپ اللہ سے رکھیں گے، وہی رشتہ اللہ آپ سے رکھے گا۔ اللہ کی مخلوق سے حساب نہ لیں، وہ آپ سے حساب نہیں لے گا۔ کچھ لوگ اللہ کی مخلوق سے بہت سختی سے حساب لیتے ہیں۔ یہ اس بات کی نشانی ہوتی ہے کہ اللہ آگے جا کر ان سے بھی بہت سخت حساب لینے والا ہے۔ جبکہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے دریغ خرچ کرتے ہیں، اللہ ان کو بے حساب دیتا ہے، سورہ ال عمران، آیت ۳۷ میں ہے: ”..... يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ“ اپنی زندگی کے آخری وقت میں ہر مسلمان اپنے سخت حساب سے خوفزدہ رہتا ہے، مگر کچھ صحابہ کرامؓ ایسے بھی ہیں کہ جنہیں حضور ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں ہی جنت کی خوشخبری دے کر حساب کے خوف سے آزاد کر دیا تھا۔ یہ وہ تھے کہ جنہوں نے کبھی اللہ سے حساب نہیں کیا اور سیدی رسول اللہ ﷺ پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

دعا قبول ہی وہی ہوتی ہے کہ جو دل سے کی جائے۔ زبردستی کسی سے کروائی گئی دعا بے فائدہ ہی رہتی ہے۔ دعا اسی کی لگتی ہے کہ جس کا رزق حلال ہو اور اس کی دعا کو درود کے پر لگے ہوں۔ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی حکمت کے تحت دعا کو فوراً قبول نہیں کرتا، مگر وہ دعا محفوظ

ہم تو مال بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں

کر لی جاتی ہے اور اسکے بدلے میں اللہ تعالیٰ انسان کو دیگر آسانیاں اور سہولتیں عطا فرما دیتا ہے۔ ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔ ہم انجانے میں بہت سی نقصان دہ چیزیں بھی مانگ لیتے ہیں، مثلاً لوگ دعا مانگتے ہیں کہ گاڑی مل جائے۔ گاڑی تو مل جاتی ہے مگر پھر اسی گاڑی کے حادثے میں پورا خاندان بھی ہلاک ہو جاتا ہے۔ گاڑی تو مانگ لی مگر خیر نہیں مانگی۔ اگر دعا کے ساتھ خیر بھی مانگی جائے، تو پھر اللہ خیر بھی عطا کرتا ہے اور شر کا عنصر بھی نکل جاتا ہے۔ لہذا جب بھی دعا کریں تو اس میں ایک جملے کا اضافہ کر دیں کہ ”یا اللہ! اس دعا کے نتیجے میں میری اور امت مسلمہ کی اس دنیا اور آخرت میں خیر کرنا“۔ ان شاء اللہ، اس طرح سے دعا کی جائے یا کروائی جائے تو ضرور قبول ہوگی، اور اسکی قبولیت میں ہر خیر نصیب ہوگی۔

حدیث شریف میں بنی اسرائیل کی ایک بدکار عورت کا ذکر آتا ہے کہ جس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا دیا، اور اس نیکی کے نتیجے میں اللہ نے اس کی مغفرت فرمادی۔ اگر صرف ایک بے زبان جانور کی خدمت ایک بدکار عورت کو جنت میں پہنچا سکتی ہے، تو اندازہ کریں کہ اللہ کی مخلوق کی خدمت انسان کو کیا مقام دلا سکتی ہے۔

جو شخص دعا نہیں کما تا، وہ بد نصیب ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ کوئی چیز تقدیر کو نہیں بدل سکتی سوائے دعائے دعا سے بڑی بڑی مصیبتیں ٹل سکتی ہیں، آزمائشیں آسان ہو سکتی ہیں، بند راستے کھل سکتے ہیں اور مایوسی، خوشخبری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ دعا کمانا پڑتی ہے اور اس کیلئے خدمت کرنا پڑتی ہے، لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنا پڑتی ہیں، ادب کرنا پڑتا ہے، اور مخلوق کی خدمت اس طرح کرنی پڑتی ہے کہ جس کی وہ توقع بھی نہ کرتے ہوں۔

سوال: ذکر اللہ سے کیا مراد ہے؟

جواب: ہم جس ذکر کی بات کر رہے ہیں، کہ جس کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے: ”ذکر اللہ کثیراً“، وہ ذکر قلبی ہے۔ جس طرح انسان کے جسم کو سانس کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح انسان کے قلب کو زندہ رہنے کیلئے اللہ کے ذکر کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسے سانس بند ہو جائے تو دم گھٹنے لگتا ہے، اسی طرح اللہ کا ذکر نہ کرنے سے قلب مردہ ہو جاتا ہے۔ یہ ذکر قلبی سانس کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے: ”اپنے رب کا ذکر کرو امید اور خوف کے ساتھ، صبح و شام، بغیر آواز نکالے اور دیکھنا غافلوں میں سے مت ہو جانا“، یعنی جو شخص اپنے وجود کے اندر اللہ کا ذکر صبح و شام نہیں کرتا، اللہ اسے غافل کہہ رہا ہے۔ جس طرح بیڑی کو چارج ہونے کیلئے کرنٹ چاہیے ہوتا ہے، اسی طرح انسان کے قلب کو زندہ رہنے کیلئے اللہ کا ذکر چاہیے ہوتا ہے۔ ذکر نماز کو بھی کہا گیا ہے اور تسبیح کو بھی۔ لیکن یہاں ذکر قلبی کی بات ہو رہی ہے۔ طریقت کے بہت سے سلاسل کہ جو روحانی تربیت دیتے ہیں اور انسان کے وجود کا تزکیہ کرتے ہیں اور اسکے قلب کی صفائی کر کے اسکو بندہ مومن بناتے ہیں، ان میں ذکر قلبی کو بہت اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ افضل

ذکر ”لا الہ الا اللہ“ کو قرار دیا گیا ہے، یہ ذکر زبان اور قلب سے ادا ہوتا ہے، اور سانس کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اسکے علاوہ بھی حضور ﷺ نے بہت سے ذکر اذکار عطا فرمائے ہیں۔

جس طرح انسان جسمانی امراض کیلئے مختلف ادویات اور ٹانک وغیرہ لیتا ہے، اسی طرح روحانی وجود کیلئے بھی ذکر کی ادویات کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ذکر اذکار کرنے اور تربیت کیلئے ایک مرشد چاہیے ہوتا ہے۔ یہ محض کتابیں پڑھ کر نہیں سیکھا جاسکتا۔ جس طرح ادویات کے نقصان دہ اثرات (side effects) ہوتے ہیں، اسی طرح اذکار کی بھی زیادہ مقدار نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

قلب کو زندہ رکھنے کیلئے ذکر قلبی ایک بنیادی عنصر ہے۔ پھر اسی سے قلب منیب، قلب سلیم، اور قلب شہید بنتا ہے۔ پھر نفس کو قابو کرنے کیلئے نفس امارہ، نفس لوامہ میں تبدیل ہوتا ہے، نفس لوامہ سے نفس مطمئنہ کا سفر طے ہوتا ہے۔ یہ وہ تمام طریقہ ہائے کار ہیں کہ جو ہمارے بزرگوں نے قلب زندہ کرنے کیلئے حضور ﷺ کی سنت سے سیکھے ہیں اور ہمیں بھی سکھائے ہیں۔ بلاشبہ قرآن سیکھنے کیلئے بھی استاد کی ضرورت پڑتی ہے۔ قرآن میں مختلف علوم بیان کیے گئے ہیں۔ بہت سے علوم ایسے ہیں کہ جن کا تعلق فقہ سے ہے، اور بہت سے علوم ایسے ہیں کہ جن کا تعلق انسان کے باطن اور قلب سے ہے۔ قرآن میں وضو کرنے اور نماز پڑھنے کا طریقہ نہیں بتایا گیا بلکہ یہ ہمیں حضور ﷺ کی سنت مبارکہ سے ملتا ہے۔ اسی طرح تزکیہ اور طریقت کے بہت سارے معاملات ہیں کہ جن کی ظاہری تفصیل قرآن میں نہیں ملتی بلکہ حضور ﷺ اور صحابہ کرام کی سنت سے اخذ کی جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک روایت ہے کہ جس میں آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے دو طرح کے علم حاصل کیے تھے۔ ایک علم میں نے بیان کر دیا ہے، لیکن اگر میں دوسرا علم بھی بیان کر دوں تو آپؐ لوگ میری گردن اڑا دیں گے! اس سے واضح طور پر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ شریعت کے معاملات اور ہیں اور طریقت کے مقامات اور۔ شریعت کے معاملات استاد سے سیکھے جاتے ہیں، اور طریقت کے مقامات مرشد سے۔

فقہ کے چار بڑے سلاسل ہیں، مالکی، حنفی، شافعی اور حنبلی۔ یہ فرقے نہیں ہیں بلکہ مکاتب فکر ہیں۔ ان سلاسل کے اماموں نے قرآن اور سنت مبارکہ کی روشنی میں قوانین بنائے کہ جن کی مدد سے فقہ اور شریعت کے مسائل حل کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح دین کی جو روحانی جہت ہے، وہ یہ کہ حضور ﷺ نے تزکیہ کس طرح فرمایا ہے، یعنی امراض قلبی کا علاج کس طرح فرمایا۔ شیطان انسان کے ذہن میں جو وسوسے ڈالتا ہے، وہ نفس کی بیماریاں ہیں جیسا کہ لالچ، کینہ، بغض، غیبت، خوف، بزدلی، بے غیرتی وغیرہ۔ یہ سب امراض قلبی ہیں کہ جن کا تعلق روحانیت سے اور علاج طریقت میں ہے۔ ان امراض کا طریقہء علاج بھی روحانی ہی ہوتا ہے۔ اس حوالے سے بھی کئی مکاتب فکر ہیں، مثلاً نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ وغیرہ۔ یہ بھی فرقے نہیں ہیں۔ حضور ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں فقط ایک اسلامی معاشرہ تھا، مگر بعد میں آنے والے ادوار میں مختلف مکاتب فکر سامنے آئے، کچھ نے فقہ کے معاملات کو سنبھالا اور کچھ نے



ہم تو مائل بہ کرم ہیں، کوئی سائل ہی نہیں

طریقت کے۔ کئی بزرگان مثلاً جنید بغدادیؒ، جلال الدین رومیؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ وغیرہ طریقت کے حوالے سے مشہور ہیں۔ آج بھی ان بزرگوں کے بنائے ہوئے سلاسل پوری امت میں جاری ہیں اور تقریباً ہر بزرگ کا ہی تعلق کسی نہ کسی روحانی سلسلے سے بھی ہوتا ہے۔ یہ تمام روحانی سلسلے ظاہری شریعت پر بھی عمل کرتے ہیں۔ کوئی بھی سلسلہ شریعت سے بالاتر نہیں ہوتا۔ جو شریعت سے باہر جائیگا وہ دین سے بھی باہر ہو جائیگا، لہذا شریعت کی پابندی لازم ہے۔

شریعت کی پابندی کے علاوہ مرشد بھی ضروری ہوتا ہے کہ جو تربیت دے کر آپ کو اس مقام تک پہنچا دے کہ جس کے بعد آپ براہ راست سیدی رسول اللہ ﷺ سے فیض لینا شروع کر دیں۔ جب آپ خود اس قابل ہو جائیں کہ استاد یا مرشد بن جائیں تو وہ اور معاملہ ہے، لیکن اس مقام پر ہم سب کو استاد اور مرشد کی اشد ضرورت ہے کہ جو اپنی تربیت سے ہمیں احسان و سلوک کی منزلیں طے کروائے۔

سوال: مرشد کامل کی شناخت کیسے کی جاسکتی ہے؟

جواب: مرشد کی خاص نشانی یہ ہوتی ہے کہ اسکے پاس بیٹھنے سے عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ عطا ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص حضور ﷺ کا ادب نہ سکھائے، حضور ﷺ سے عشق نہ پیدا کر سکے، حضور ﷺ سے نسبت و تعلق نہ سکھائے، تو وہ مرشد بننے کے لائق نہیں۔ مرشد وہ ہے کہ جس کے پاس بیٹھنے سے اللہ کی یاد تازہ ہو۔ اسکی باتیں سننے کے بعد آپ کی آنکھوں سے حضور ﷺ کی محبت میں ڈوبے ہوئے آنسو گریں، دل میں طوفان برپا ہو جائے کہ مجھے حضور ﷺ کے دربار میں حاضری دینی ہے۔ مرشد کے پاس جا کر آپ دنیا سے بیزار ہو جائیں، او محبوب سے وصل کی خواہش آپکو بے چین کر دے۔ وہ شریعت کے پردے میں رہتے ہوئے آپ کی روحانی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیتا ہے۔

دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو

عجب چیز ہے لذتِ آشنائی

اقبالؒ نے بھی بندہء درویش کی کچھ نشانیاں بتائی ہیں:

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے

حق تجھے میری طرح صاحب اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق







جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخ دوست

زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

مرشد کے پاس بیٹھ کر آپ کا دل اس دنیا سے اٹھ جائیگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ زمینیں اور جائیدادیں مت بناؤ کہ پھر تم اس دنیا کے ہی ہو کر رہ جاؤ گے! اللہ کا بندہ اور درویش دینے والا ہوگا، لینے والا نہیں۔ وہ ایک پراسرار وجود ہوگا، اسکے پاس برکت ہوگی، عافیت ہوگی۔ بے شک اس کے کپڑے پھٹے پرانے ہوں یا وہ زمین پر بیٹھا ہو، یا چاہے وہ قیمتی لباس میں ایک عالیشان گھر میں رہتا ہو، مگر اسکے پاس بیٹھ کر آپ کو سکون ملے گا۔ آپ پریشانی میں اس کے پاس جائیں گے اور وہ آپ کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہے گا، کہ اللہ اپنا کرم کرے گا اور آپ کو یقین آجائے گا کہ اب واقعی اللہ اپنا کرم کرے گا۔ وہ آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھے گا تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے، آپ اسکی نگاہوں کی تاب نہ لاسکیں گے۔ ایسے پراسرار وجود آج بھی موجود ہیں۔

یار کو ہم نے جا بجا دیکھا

کہیں ظاہر کہیں چھپا دیکھا

ممتاز مفتی، قدرت اللہ شہاب اور اشفاق احمد جیسے لوگ خود بھی بابے تھے اور وہ جن روحانی بابوں کا ذکر کرتے ہیں وہ آج بھی آپکے آس پاس ہیں، بس انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ یہ بابے ریلوے سٹیشن پر قلی کے روپ میں بھی مل سکتے ہیں، کہیں افسر کے روپ میں ہونگے، تو کہیں فوجی جرنیل۔ ان کے ظاہر پر مت جائیں۔ یہ سب وہ ذمہ داریاں ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمے لگا رکھی ہیں۔ ہم ذاتی طور پر ایسے فقراء کو جانتے ہیں کہ جو خانقاہوں پر نہیں بیٹھے ہوئے اور پاکستان کی روحانی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں ہے۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے، بس طلب سچی ہونی چاہیے۔ جب انسان اپنے رب سے ہدایت، ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ طلب کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو ہمارے پاس رہنمائی کیلئے بھیج دیتا ہے۔ مرشد اور استاد کو دیکھ کر انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہی وہ وجود ہے کہ جس کے ذریعے وہ ہدایت پاسکتا ہے۔

سوال: شریعت اور طریقت میں کیا فرق ہے؟

جواب: حقیقت میں شریعت اور طریقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں ہی دین کے دو پہلو ہیں۔ اکثر سمجھنے کی خاطر ہم کچھ ایسی اصطلاحیں وضع کر لیتے ہیں کہ جو قرآن و سنت کی نہیں ہوتیں۔ مثلاً نماز کا لفظ فارسی اصطلاح ہے، قرآن و سنت میں موجود نہیں،



وہاں اس کیلئے ”صلوٰۃ“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اسی طرح خدا کا لفظ بھی فارسی ہے، قرآن و سنت میں استعمال نہیں کیا گیا۔ روزہ بھی فارسی اصطلاح ہے۔

علماء اور فقہاء نے سمجھانے کیلئے شریعت اور طریقت جیسی اصطلاحوں کو استعمال کیا ہے۔ ان کی دلیل قرآن پاک سے ہی لی جاتی ہے۔ سارا دین کہ جو حضور ﷺ نے دیا اور جس کے حوالے سے امام احمد بن حنبلؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ وغیرہ نے قوانین بنائے، کو شریعت کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ سب ظاہری پہلو ہیں، لیکن کچھ معاملات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن پر قانون لاگو نہیں ہوتا۔ یہ باطنی معاملات ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص کے دل میں شیطان و سو سے ڈال رہا ہے تو اس شخص کو قانوناً سزا نہیں دی جاسکتی۔ کسی شخص میں اگر کینہ، بغض اور حسد ہو تو اُس پر اس بنیاد پر مقدمہ تو قائم نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان روحانی اور قلبی بیماریوں سے نجات ضروری ہے۔ ان بیماریوں سے نجات کیلئے تربیت کے سلسلے کو طریقت کہتے ہیں۔

شریعت اور طریقت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جس کسی نے شریعت کو تھاما اور طریقت کو ترک کیا، وہ دین کی حکمت، فراست، تزکیہ اور نرمی سے محروم ہوا۔ جس کسی نے صرف طریقت کو تھامنے کی کوشش کی اور شریعت کو ترک کیا، وہ گمراہ ہوا۔

پچھلے ادوار میں یہ دونوں ہی طرح کے علوم سکھائے جاتے تھے۔ شریعت ہمیں بتاتی ہے کہ نماز، روزہ، حج وغیرہ کیسے ادا کرنے ہیں۔ حلال اور حرام میں کیونکر تمیز روا رکھنی ہے۔ بزرگوں نے ہمیں یہ بھی سکھایا ہے کہ امراض قلبی سے کیسے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ آپ حضرت داتا گنج بخشؒ کی کتاب ”کشف المحجوب“ اٹھا کر دیکھیں، اس میں سارا زور اسی بات پر ہے کہ انسان اپنی نفس کی بیماریوں اور شیطان کے وسوسوں سے کیسے بچ سکتا ہے۔

ہمیں دوبارہ سے اپنی روحانی اساس کی طرف لوٹنا ہے۔ اس اساس کی طرف کہ جس کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ جب تک ہم قرآن و سنت کو دانتوں سے نہیں پکڑیں گے، تکمیل پاکستان کا وہ خواب کہ جو ہم دیکھ رہے ہیں، حاصل نہیں ہوگا۔ آئندہ ابواب میں اس حوالے سے تفصیلاً بحث کی جائے گی۔







## اگر بہ او نر سیدی، تمام بولہی است

بے شک اللہ تعالیٰ اور اسکے فرشتے نبی کریم ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں، اے ایمان والو! تم بھی آپ ﷺ پر درود و سلام بھیجا کرو۔ ہمارے دین کی حقیقی اساس حضور ﷺ سے نسبت اور ان سے روحانی تعلق پر قائم ہے۔ کوئی شخص اگر آپ ﷺ کا احترام نہ کرے اور آپ ﷺ سے محبت نہ رکھے، تو اقبال کے الفاظ میں اسکا پورا ایمان فقط ”بولہی“ ہے، یعنی وہ ابولہب کے راستے پر ہے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نر سیدی، تمام بولہی است

حضور ﷺ کا فرمان ہے: ”اپنے بچوں کو ادب سکھاؤ“۔ اس باب میں ہم عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ پر ہی بات کریں گے۔ کائنات میں دو گناہ ایسے ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ کبھی معاف نہیں کرتا۔ ایک شرک اور دوسرا گستاخی، رسول ﷺ۔ قرآن پاک میں مومنین کو مخاطب کر کے ایک آیت کا مفہوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی آوازوں کو اونچا نہ ہونے دو، کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا! اتنی سخت وعید شاید ہی کسی اور موقع پر سنائی گئی ہو۔

صحابہ کرامؓ اور ہمارے بزرگوں نے ادب رسول ﷺ کی نہایت اعلیٰ اور حیرت انگیز مثالیں قائم کیں، کہ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ

ادب ہی پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ ادب کے بعد ہی محبت پیدا ہوتی ہے۔ باادب شخص بانصیب ہوتا ہے اور بے ادب بے نصیب۔ اگر ادب رسول ﷺ نہ ہو، تو بیشک آپ روزے رکھ لیں، نمازیں پڑھ لیں، حج کر لیں، وہ سب بیکار ہو جائیگا، حتیٰ کہ اعمال ضائع ہو جائیں گے، لہذا اس معاملے میں انتہائی احتیاط کی ضرورت ہے۔

یہ فقہ کے معاملات نہیں ہیں کہ جن میں فتویٰ دیا جائے کہ ادب یوں ہونا چاہیے۔ یہ باتیں اہل دل، صحابہؓ کی سیرت سے کشید کرتے ہیں۔ مثلاً فقہ کی کتابوں میں یہ درج نہیں کیا جاتا کہ صحابہؓ حضور ﷺ کے پسینہ مبارک کو جمع کر کے اس سے خوشبو بناتے تھے۔ یہ سارے وہ معاملات ہیں کہ جو مسلمانوں کا حضور ﷺ سے عشق اور ادب ظاہر کرتے ہیں۔

ایک غزوہ کے موقع پر حضور ﷺ نے تمام مسلمانوں کو حکم دیا کہ جس قدر ہو سکے اپنا سامان لے کر آؤ۔ سب لوگ حسب توفیق سامان لالا کر آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش کر رہے تھے۔ ایک عورت اپنے شیرخوار بچے کو لے کر آپ ﷺ کے پاس پہنچ گئی اور کہا یا رسول اللہ ﷺ! یہ بچہ لے لیجیے۔ حضور ﷺ نے حیرت سے پوچھا کہ میں اس کا کیا کروں گا۔ وہ عورت رونے لگی اور جواب دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میرے پاس دینے کیلئے اور کچھ نہیں ہے، میں یہ بچہ اس لیے لے آئی ہوں کہ میدان جنگ میں جب دشمن آپ ﷺ پر تیر برسائیں تو آپ ﷺ اس بچے کو آگے کر دیکھیں گے، تاکہ وہ تیر اس کے جسم میں لگ جائیں اور آپ ﷺ محفوظ رہیں! یہ ہے عشق رسول ﷺ!

صحابہ کرامؓ میں سے ہر ایک کا حضور ﷺ سے محبت کا اپنا اپنا انداز تھا۔ ایک مرتبہ گرمیوں کا موسم تھا، ایک صحابیؓ کی حضور ﷺ سے ملاقات ہوئی تو دیکھا کہ آپ ﷺ کے کرتے مبارک کے بٹن کھلے ہوئے ہیں۔ وہ ان صحابیؓ کی حضور ﷺ سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ مگر آپ ﷺ کے کرتے مبارک کے بٹن کھلے دیکھنے کے بعد ان صحابیؓ نے ساری زندگی اپنے کرتے کے بٹن بند نہیں کیے۔

اسی طرح ایک صحابیؓ سردیوں میں حضور ﷺ سے ملے۔ آپ ﷺ نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ اس کے بعد وہ صحابیؓ، گرمی ہو یا سردی، کالی چادر ہی اوڑھ رکھتے۔

مشہور واقعہ ہے کہ جب غزوہ احد کے موقع پر حضور ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے، تو اس وقت حضرت اویس قرنیؓ یمن میں تھے۔ ان کو جب معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کے دندان مبارک شہید ہو گئے ہیں تو آپؐ نے بھی اپنا ایک دانت توڑ ڈالا۔ پھر خیال آیا کہ شاید یہ والا دانت نہ ہو بلکہ دوسرا والا دانت توڑا ہو۔ اس شبے میں دوسرا دانت بھی توڑ ڈالا۔ اس طرح کرتے کرتے آپؐ نے اپنے تمام دانت توڑ ڈالے۔ آپؐ کی حضور ﷺ سے ظاہر املقات کبھی نہیں ہوئی، مگر آپؐ کو پھر بھی صحابی کا درجہ حاصل ہے۔ حضور ﷺ نے اپنا کرتا مبارک حضرت اویس قرنیؓ کیلئے بھجوا دیا تھا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ جب وہ کرتا لے کر آپؐ کے پاس پہنچے تو ازراہ مذاق یہ کہہ دیا کہ آپؐ کیسے عاشق رسول ﷺ ہیں کہ حضور ﷺ سے ملنے بھی نہیں آئے، تو حضرت اویس قرنیؓ یہ سن کر بے چین ہو گئے، مگر پھر پیار سے ان دونوں



سے پوچھا کہ آپؐ دونوں نے تو حضور ﷺ کے ساتھ بہت وقت گزارا ہے، ایسا کیجیے حضور ﷺ کا قدم مبارک بتا دیجیے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ صحیح جواب نہ دے پائے۔ پھر حضرت اویس قرنیؓ نے دریافت فرمایا: ”حضور ﷺ کی بھنویں آپس میں ملی ہوئی تھیں یا الگ الگ تھیں؟“ دونوں پھر جواب نہ دے پائے۔ اس کے بعد حضرت اویس قرنیؓ نے پھر پوچھا: ”کیا غزوہ احد میں حضور ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے تھے؟ آپ میں سے کتنے لوگوں نے ان کے پیار میں اپنے دانت توڑے۔“ پھر انہوں نے اپنا منہ کھول کے دکھایا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کا نپ کر رہ گئے! اب ان کو اندازہ ہوا کہ حضرت اویسؓ کا کیا مقام ہے۔ اس کے بعد دونوں حضرات نے حضور ﷺ کا کرتا حضرت اویس قرنیؓ کی خدمت میں پیش کیا۔ انہوں نے وہ کرتا پہنا اور سجدے میں چلے گئے اور امت کیلئے طویل دعا مانگی۔

ادب رسول ﷺ کے معاملات دل کے ہوتے ہیں، فقہ کے نہیں۔ ایک مرتبہ ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ کو درخت کے پاس سے سر جھکا کر گزرتے دیکھا۔ درخت چھوٹا تھا اور حضور ﷺ طویل القامت تھے، لہذا سر جھکا کر گزرے۔ وہ صحابیؓ چھوٹے قد کے تھے، اسکے باوجود وہ ساری عمر اس درخت کے نیچے سے سر جھکا کر ہی گزرتے رہے، کہ انہوں نے حضور ﷺ کو ایسے ہی کرتے دیکھا تھا، حالانکہ ان صحابیؓ کو سر جھکانے کی ضرورت نہ تھی۔

حضرت امام مالکؒ مالکی فقہ کے امام ہیں۔ آپؒ ساری عمر مدینہ سے باہر نہیں گئے، ماسوائے حج کے موقع پر۔ آپؒ مدینہ منورہ میں جوتے نہیں پہنتے تھے اور گھوڑے پر سواری نہیں کرتے تھے۔ لوگوں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ جس جگہ میرے آقا ﷺ چلے پھرے ہوں، مجھے شرم آتی ہے کہ میں وہاں جوتے پہنوں اور گھوڑے پر سواری کروں!

یہ بات ذہن میں رکھ لیں کہ امام مالکؒ خود فقہ کے امام ہیں اور اچھی طرح جانتے ہیں کہ انکا یہ عمل فقہ کا معاملہ نہیں، بلکہ عشق اور ادب کے راز ہیں۔ اہل دل اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ عشق رسول ﷺ کی اداؤں پر نہ تو کوئی فتویٰ ہے، نہ اس پر کوئی تنقید ہے، نہ اسکی کوئی تقلید ہے، اور نہ ہی اسکی کوئی انتہا۔ کسی نے بھی امام مالکؒ پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ جب پوری امت مدینے میں جوتے پہننے پر اعتراض نہیں کرتی تو پھر آپؐ کیوں ننگے پاؤں پھرتے ہیں۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ عشق اور ادب کے معاملے پر کوئی فتویٰ نہیں ہے۔

عشق رسول ﷺ بذات خود ایک مکمل طرز زندگی ہے۔ یہ سب باتیں کہ جو ہم نے بیان کیں، وہ شرعاً بھی جائز ہیں۔ لیکن ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ کا اتنا بلند رتبہ ہے کہ اگر انسان حرام کام بھی آپ ﷺ کے عشق اور ادب میں کر جائے تو بلند درجات کا حقدار ٹھہرتا ہے۔ اس کی ایک مثال ہمیں سیرت مبارکہ ﷺ سے ملتی ہے کہ جب ایک مرتبہ علاج کے غرض سے آپ ﷺ کا بہت سا خون نکالا گیا۔ آپ ﷺ نے ایک پیالے میں وہ خون جمع کیا اور ایک صحابیؓ کو دیا کہ جاکر پھینک آؤ۔ وہ صحابیؓ باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے تو حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ خون پھینک آئے؟ صحابیؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے وہ خون زمین پر پھینکتے ہوئے







شرم آئی، لہذا میں وہ خون پی گیا۔ حضور ﷺ مسکرانے لگے اور فرمایا: ”جس جسم کے اندر میرا خون چلا گیا ہو، اب اس پر جہنم کی آگ حرام ہے“؛ لگو کہ خون پینا شریعت میں حرام ہے، مگر یہاں ایک عشق وادب کی ادا پر جنت کی بشارت مل گئی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضور ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد مسجد نبوی کے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دینا شروع کیا تو آپ ہمیشہ اس سیڑھی سے ایک زینہ نیچے کھڑے ہوتے تھے کہ جس پر حضور ﷺ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے۔ اسکے بعد جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو آپؓ اس سیڑھی سے بھی ایک زینہ نیچے کھڑے ہوتے کہ جس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ خطبہ دیتے تھے۔ دین کی کتابوں میں کہیں درج نہیں ہے کہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ مگر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ فقہ کے تحت نہیں ادب کے تحت ایسا کرتے تھے۔

حضور ﷺ کے روضہء مبارک کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے روضہء مبارک بنے ہوئے ہیں۔ ان کی ترتیب بھی اس طرح ہے کہ حضور ﷺ کے روضہء مبارک کے ذرا سا نیچے حضرت ابو بکر صدیقؓ کا روضہء مبارک ہے، اور اس سے مزید نیچے کی طرف حضرت عمرؓ کا روضہء مبارک ہے۔ تینوں ایک صف میں نہیں ہیں۔ یہ کمال ادب کی ایک اور حیرت انگیز مثال ہے۔

قرآن پاک میں بھی حضور ﷺ اور مسجد نبوی کے ادب کے حوالے سے احکامات دیئے گئے ہیں۔ مؤمنین کی نشانی ہی یہ بتائی گئی ہے کہ جب یہ حضور ﷺ کے پاس جمع ہوتے ہیں، تو واپسی کیلئے اس وقت تک نہیں ہلتے کہ جب تک اجازت نہ طلب کر لیں۔ حضور ﷺ کے گھر میں بھی تب تک داخل نہیں ہوتے کہ جب تک اجازت نہ طلب کر لیں۔ ہر کام حضور ﷺ کے اذن سے ہوتا ہے۔ آج بھی مسجد نبوی میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جن کو دیکھ کر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ عشق رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

غلامان محمد ﷺ دور سے پہچانے جاتے ہیں

دل گرویدہ گرویدہ ، سر شوریدہ شوریدہ

عشق رسول ﷺ کے حوالے سے صحابہ کرامؓ نے جو مثالیں قائم کی ہیں، آج وہ تمام روشن میناروں کی طرح ہمارے سامنے کھڑی ہیں۔

حضرت خالد بن ولیدؓ نے حضور ﷺ کے چند بال مبارک سنبھال کر رکھے ہوئے تھے۔ آپؓ نے وہ بال حفاظت کی غرض سے اپنی ٹوپی میں پرو لیے تھے۔ آپؓ جنگ کے دوران وہ ٹوپی اپنے سر سے اترنے نہ دیتے۔ ایک جنگ کے دوران وہ ٹوپی گر گئی اور دشمنوں کے قبضے میں چلی گئی۔ آپؓ نے باقاعدہ ایک دستہ تیار کیا اور دشمن پر حملہ کر کے وہ ٹوپی بازیاب کرائی۔ کچھ صحابہ کرامؓ نے اعتراض بھی کیا کہ آپؓ نے فقط ایک ٹوپی کی خاطر کئی مسلمان شہید کروادیئے۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ یہ عام ٹوپی نہیں، یہ لمس رسول ﷺ ہے اور اسی کی بدولت مجھے کامیابیاں نصیب ہوتی ہیں، اسی کی برکت سے تو میں جہاد کرتا ہوں! کسی نے بھی انکو ادب رسول ﷺ کی اس ادا پر شرک یا بدعت کا طعنہ نہیں دیا۔



یہ عشق رسول ﷺ کا معاملہ ہے، یہ بدعت نہیں ہے۔ ادب کی کوئی حد ہی نہیں، کیونکہ یہی پہلا قرینہ بھی ہے محبت کے قرینوں میں اور آخری بھی! آج تک یہ نہیں ہوا کہ گستاخ رسول ﷺ کو کچھ حاصل ہوا ہو، چاہے وہ دنیا جہاں کے علوم حاصل کر لے یا قرآن کا بہت بڑا عالم بھی ہو۔ اقبالؒ نے اسی حوالے سے طنز کرتے ہوئے کہا تھا:

فلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اقبالؒ کا عشق رسول ﷺ ایسا تھا کہ حضور ﷺ کا نام مبارک آتے ہی آپ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے۔ اس کی پوری تفصیل ہم نے اپنی کتاب ”اقبال پر اسرار“ میں بیان کی ہے۔ اقبالؒ کو بھی عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ ان کے والد نے سکھایا تھا۔ مسلمان والدین پر واجب ہے کہ اپنے بچوں کو ادب رسول ﷺ سکھائیں۔

قیام پاکستان سے قبل کا ایک واقعہ ہے کہ کسی سکول میں معائنہ کی غرض سے ایک انسپکٹر کو آنا تھا۔ بچوں کو خوب تیاری کروائی گئی تاکہ اگر انسپکٹر کوئی سوال پوچھے تو بچے اس کا جواب دے سکیں۔ جب انسپکٹر معائنہ کے لیے آیا تو اس نے ایک مسلمان بچے سے سوال کیا کہ اپنے نبی کا نام بتاؤ۔ وہ بچہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ انسپکٹر نے پھر پوچھا کہ کیا تمہیں اپنے نبی ﷺ کا نام نہیں آتا؟ بچے نے جواب دیا: ”معلوم ہے۔“ انسپکٹر نے کہا: ”تو پھر بتاؤ۔“ بچے نے تھوڑی دیر کیلئے باہر جانے کی اجازت مانگی۔ استادوں اور پرنسپل کو بہت غصہ آیا، انہوں نے اس بچے کو باہر جانے کی اجازت نہ دی اور رسول اللہ ﷺ کا نام بتانے پر اصرار کیا۔ جب بچہ نام لینے پر تیار نہ ہوا تو اسے مارا گیا۔ اتنا مارا گیا کہ اس کی نکسیر پھوٹ پڑی۔ اسی دوران پیریڈ کی گھنٹی بھی بج گئی۔ استاد نے بچے کو حکم دیا کہ نام یاد کر کے رکھو میں تھوڑی دیر میں واپس آکر پوچھوں گا۔ چند منٹ کے بعد جب استاد واپس آیا تو دیکھا کہ بچے کے جسم سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے، ناک میں بھی روئی رکھی ہوئی تھی تاکہ خون کا بہاؤ رک سکے۔ استاد نے تب نبی ﷺ کا نام دریافت کیا تو بچے نے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کا نام بتا دیا بلکہ انتہائی ادب و احترام سے آپ ﷺ کے ۹۹ اسمائے مبارک بھی سنا دیئے۔ استاد کو بہت حیرت ہوئی۔ اس نے پوچھا کہ جب تمہیں نام معلوم تھا تو پہلے کیوں نہیں بتایا؟ خواخوہ مار بھی کھائی۔ بچہ رونے لگا اور بولا: ”میرے والد نے مجھے نصیحت کی تھی کہ ہمیشہ با وضو ہو کر نبی اکرم ﷺ کا نام مبارک لینا۔ بے وضو کبھی ان کا نام مبارک اپنی زبان پر مت لانا اور جب آپ نے نام پوچھا تب میرا وضو نہیں تھا۔ میں باہر جانے کی اجازت اسی لیے مانگ رہا تھا تاکہ وضو کر آؤں۔“

ایسے لوگ ہی با نصیب ہوتے ہیں۔ بچوں کو ایسے آداب سکھانا والدین کی ذمہ داری ہے۔ اگر آپ صرف ادب رسول ﷺ کرنا شروع کر دیں تو اس کی برکت اور خیر سے ہی آپ کی ہر مصیبت دور ہو جائے گی، حضور ﷺ سے فیض ملنا شروع ہو جائیگا اور قرآن اپنے راز بھی کھولنا شروع کر دے گا۔ بے ادب اور گستاخ کے نصیب میں کچھ نہیں آتا۔ با ادب کیلئے کائنات کے تمام خزانے ہیں۔ اسی لیے ہم ادب

رسول ﷺ کی بات پہلے کر رہے ہیں۔ قرآن، فقہ، تفسیر اور حدیث کی بات بعد میں کریں گے۔

حضور ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا کہ اہل مدینہ کے ساتھ نرمی روا رکھو کہ یہ میرے ہمسائے ہیں! اس کے بعد تمام مسلمان حکمرانوں کا یہ طریقہ رہا کہ مدینہ کے لوگوں سے ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ مدینے کے لوگوں کی سزاؤں میں نرمی برتی جاتی۔ اہل مدینہ پر نسبت رسول ﷺ کی وجہ سے ہر طرح کی نرمی کی جاتی۔ آج بھی ”سادات“ کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

بھیرہ شریف کے پیر کرم علی شاہ صاحب کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا کہ میں سید ہوں اور مجھے دو بیل چاہئیں۔ سب جانتے تھے کہ وہ سید نہیں ہے۔ لہذا سب نے پیر کرم علی شاہ صاحب کو سمجھانا شروع کر دیا کہ یہ سید نہیں ہے، لہذا اس کی بات نہ سنیں۔ پیر صاحب عاشق رسول ﷺ تھے، انہوں نے اس شخص سے کہا کہ تم میرے گلے سے دو بہترین بیل لے جاؤ۔ اس کے جانے کے بعد لوگوں نے پھر پیر صاحب سے کہا کہ وہ سید نہیں تھا، آپ نے کیوں اس کو دو بیل دے دیئے۔ پیر صاحب نے جواب دیا کہ میں جانتا ہوں کہ وہ سید نہیں ہے، لیکن اس نے جن مبارک ہستی سے اپنی نسبت کا اظہار کیا تھا، ان کا ادب و احترام مجھ پر واجب تھا، لہذا اس کی بات مان لی! یہ ہوتے ہیں باادب لوگ!

سب سے خوبصورت ذکر جس کا اللہ تعالیٰ نے بھی حکم دیا ہے اور جو اللہ اور اس کے فرشتے بھی کرتے ہیں وہ حضور اکرم ﷺ پر درود بھیجنا ہے۔ درود کی کثرت مسلمانوں کو رسول اکرم ﷺ سے قریب کرتی ہے۔ علامہ اقبالؒ سے جب پوچھا گیا کہ جو کچھ آپ کو عطا کیا گیا ہے وہ آپ کو کیونکر ملا ہے تو اقبالؒ نے جواب دیا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ پر ایک کروڑ مرتبہ درود بھیجا ہے۔ تم لوگ بھی اتنی بار پڑھ لو تو دیکھنا اللہ تعالیٰ تمہیں کیا عطا فرماتا ہے۔

ساری عبادت ضائع ہو سکتی ہے مگر درود شریف ضائع نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ سے نسبت اور تعلق اور ان سے محبت اپنی زندگیوں کا جزو بنا لیجیے۔ اگر آپ قرآن کی کسی تفسیر کے بارے میں یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آیا وہ صحیح ہے یا نہیں تو یہ جانچئے کہ اس کے ترجمے میں حضور ﷺ کا ادب کیا گیا ہے یا کمزور الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اگر ادب والی زبان کا استعمال کیا گیا ہے تو وہ تفسیر صحیح ہے۔

ایک اور بات بھی آپ کو بتاتے چلیں۔ صحابہ کرامؓ نے کبھی بھی حضور ﷺ کو ان کے پہلے نام یعنی ”محمد ﷺ“ سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ صحابہؓ آپ ﷺ کو یا رسول اللہ ﷺ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ سوائے اللہ کے، کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ حضور ﷺ کو پہلے نام سے پکارے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جب حضور ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری دینے آتے تو کہتے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ ﷺ، پھر اسلام علیک یا ابوبکرؓ اور اسکے بعد اسلام علیک یا ابی کہتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نبی کریم ﷺ کے بہت پرانے دوست تھے مگر نبوت کے بعد حضور ﷺ کے غلام کی حیثیت سے ہمیشہ ایک قدم پیچھے چلتے۔ حضرت حمزہؓ حضور ﷺ کے چچا تھے۔ نبی کریم ﷺ آپ کے لیے بیٹوں کے برابر تھے مگر حضور ﷺ کو نبی کا رتبہ ملنے کے بعد آپ ان کے امتی بن گئے اور بزرگ والا رتبہ چھوڑ دیا۔

فدركه في كل اللب



مختلف سلاسل اور طریقت کے لوگوں میں مرشد کا بہت احترام کیا جاتا ہے۔ یہ ادب کا سلسلہ آج بھی قائم ہے۔ یہ ادب سیکھنا اور پھر اسے آئندہ نسلوں میں منتقل کرنا فرض ہے۔

## سوالات و جوابات

سوال: نبی کریم ﷺ کی زیارت کس طرح کی جاسکتی ہے؟ اور حضور ﷺ کے ساتھ اپنی محبت کس طرح بڑھائی جاسکتی ہے؟

جواب: زیارت نبی ﷺ برحق ہے۔ حضور ﷺ کا اپنی امت کے ساتھ اس قدر حیرت انگیز تعلق ہے کہ انسان کی عقل اس کو اکثر اوقات سمجھنے سے ہی قاصر رہتی ہے۔ حضور ﷺ دنیا سے پردہ کرنے کے باوجود اب بھی اپنی امت کی خبر گیری کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو امت کی خبر دی جاتی ہے، درود و سلام پہنچایا جاتا ہے، امت کی حاجات آپ سنتے ہیں اور ان پر حکم صادر فرماتے ہیں۔

تاریخ میں ایسے ہزاروں واقعات ملتے ہیں کہ لوگوں کو حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ یہ مستند بات ہے اور اس معاملے پر کئی کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔ ایک مرتبہ سلطان نور الدین زنگیؒ کو حضور ﷺ نے خواب میں آکر خبردار کیا کہ مدینہ میں یہودی روضہء مبارک کی بے حرمتی کرنا چاہتے ہیں۔ اس خواب کے بعد نور الدین زنگیؒ نے ایک مہم تیار کی اور مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں جا کر دیکھا تو ان یہودیوں نے واقعی روضہء مبارک کی طرف جانے کیلئے سرنگ تیار کر رکھی تھی۔ نور الدین زنگیؒ نے ان دونوں یہودیوں کو قتل کرنے کا حکم دیا اور ساتھ ہی وہ سرنگ بھی بند کروادی۔ اسکے بعد زمین کھود کر روضہء مبارک کے گرد سیسہ پلائی ہوئی دیوار قائم کر دی گئی، کہ جو آج تک وہاں موجود ہے۔ یہ واقعہ اتنا بڑا ثبوت ہے کہ حضور ﷺ کی زیارت برحق ہے اور آپ ﷺ آج بھی اپنی امت کی خبر رکھتے ہیں اور لوگوں کو ڈیوٹیاں دیتے ہیں۔

حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ اور بھی ہے کہ جس نے خواب میں میری زیارت کی، اس نے یقیناً مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میرے روپ میں نہیں آسکتا! ایک اور حدیث مبارکہ ہے کہ جس نے مجھے خواب کی حالت میں دیکھا، وہ عنقریب مجھے حالت بیداری میں بھی دیکھے گا! اس حوالے سے عبدالمجید صدیقی ایڈووکیٹ نے ایک بہت خوبصورت کتاب لکھی ہے۔ وہ کتاب ضرور پڑھیے۔ اس کتاب کا نام ہے: ”زیارت نبی ﷺ بحالت بیداری۔“ اس سے پہلے اسلامی تاریخ میں اس موضوع پر ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کو شائع ہوئے بیس سال گزر چکے ہیں اور آج تک کوئی اس پر اعتراض اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکا۔



یہ کتاب ضرور پڑھیے۔ اس سے آپ کو چودہ سو سال میں اس امت کو حاصل ہونے والے فیض کا اندازہ ہوگا۔ آپ ﷺ کا فیض آج بھی امت کیلئے اسی طرح جاری ہے کہ جس طرح صحابہ کرام کیلئے تھا۔ اسی لیے آپ ﷺ رحمت العالمین اور خاتم النبیین ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت اس لیے نہیں رہ گئی کہ آپ ﷺ کا فیض آج بھی جاری و ساری ہے۔

ایک صاحب کو حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی۔ ان صاحب کے نام ۱۴ جنوری ۱۹۲۲ء کو شاعر مشرقؒ نے خط لکھا کہ حضور ﷺ کی زیارت مبارک ہو۔ اس زمانے میں یہ بڑی سعادت کی بات ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ حضور ﷺ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی آپ ﷺ کی صحبت سے اسی طرح مستفید ہو سکتے ہیں کہ جس طرح صحابہ کرامؓ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں اس قسم کے اعتقاد کا اظہار بھی بعض دماغوں کو ناگوار ہوگا۔ اسی لیے چپ رہتا ہوں۔

لوگ کم علمی، ادب رسول ﷺ کی کمی اور عشق رسول ﷺ کے نہ ہونے کی وجہ سے اس فیض کا ہی انکار کر دیتے ہیں کہ جو انکو نصیب نہیں ہوتا۔ اقبالؒ نے بھی اس خط میں اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ قائد اعظمؒ سے متعلق مشہور واقعہ ہے کہ جب آپ لندن میں تھے تو آپ کو نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے آپ کو حکم دیا تھا کہ ہندوستان واپس جاؤ، تمہارے ذمے ایک اہم ڈیوٹی ہے۔ اس کے بعد ہی قائد اعظمؒ ولایت چھوڑ کر ہندوستان واپس تشریف لائے تھے۔

کچھ لوگ سوال پوچھتے ہیں کہ حضور ﷺ کو آج کل کے زمانے میں تحفے کیسے بھیجے جائیں۔ آپ لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ بقرعید کے موقع پر اپنی طرف سے قربانی کرنے کے علاوہ حضور ﷺ کی طرف سے بھی قربانی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو عبادات کرتے ہیں، نوافل پڑھتے ہیں، صدقات دیتے ہیں، حج اور عمرے کرتے ہیں اور اللہ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ مالک یہ حضور ﷺ کو تحفہ پہنچا دینا۔ درود شریف بھی تحفہ ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو رات کو اس وقت تک نہیں سوتے کہ جب تک اپنے دن کے سارے نیک اعمال رسول اللہ ﷺ کو تحفہ پیش نہ کر دیں۔ وہ نیک عمل کرتے ہی اس نیت سے ہیں کہ حضور ﷺ کو تحفہ پیش کر سکیں۔ وہ اپنے آپ کو حضور ﷺ کے حوالے کر چکے ہوتے ہیں۔

لوگ اپنے بزرگوں کو بھی تحفے تو دیتے ہی ہیں۔ لوگ حج بدل اور عمرہ بدل بھی کرتے ہیں۔ تو ان کاموں کا ثواب رسول اللہ ﷺ کو بھی تحفے کے طور پر بھیجا جاسکتا ہے۔ جو شخص حضور ﷺ کو کوئی تحفہ بھیجتا ہے، اس کا ذکر آپ ﷺ کی محفل میں کیا جاتا ہے۔ کسی بھی مسلمان کیلئے اس سے بڑی سعادت کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کا ذکر دربار نبوی میں کیا جائے۔ اس کے علاوہ مسلمان جب حضور ﷺ پر درود پاک بھیجتا ہے تو ملائکہ بھی اس شخص کیلئے دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے۔ دو جہانوں کے دروازے اس شخص کیلئے کھول دیئے جاتے ہیں۔ انسان کو شرح صدر اور رقت قلبی نصیب ہوتی ہے۔ عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ کی نشانی یہ ہے کہ دل نرم ہو جاتا ہے، آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور جب بتے آنسوؤں کے ساتھ دعا کی جائے تو وہ اللہ کے عرش کو ہلادیتی ہے۔





## ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

میرے آقا ﷺ سے محبت اور تعلق اس امت کے وجود اور خون میں رچا بسا ہے۔ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ مسلمان قتل ہونا قبول کر سکتے ہیں، اپنے بچوں اور جان و مال کی قربانی دے سکتے ہیں، اپنے ملکوں اور اپنی حکومتوں سے ہاتھ دھونا تو گوارہ کر سکتے ہیں، مگر آبروئے رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ یہ محبت ہمارے وجود میں اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ڈال دی تھی کہ جب اس نے ہم سے ”عہد الست“ لیا تھا۔ آقا ﷺ سے محبت اور ادب، اپنے بچوں کو سکھانے کا حکم دیا گیا ہے۔ بے ادب اور گستاخ رسول ﷺ بے نصیب ہی رہتا ہے، خواہ کتنی ہی عبادت کر لے، نمازیں پڑھ لے، روزے رکھ لے، زکوٰۃ دے دے۔ اگر وہ گستاخ رسول ﷺ ہے تو سمجھیں ساری زندگی کے اعمال ضائع ہو جائیں گے۔

ایک شخص حضور ﷺ کے پاس بیٹھا کرتا تھا اور آپ ﷺ سے بار بار یہ درخواست کیا کرتا کہ یا رسول اللہ ﷺ! بہت زیادہ غربت ہے، مجھے غنی کر دیجیے، مال و دولت عطا فرما دیجیے۔ حضور ﷺ نے فرمایا، کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ، تمہارے لیے بہتر ہے کہ اسی طرح رہو۔ لیکن جب اس نے بہت ضد کی تو حضور ﷺ نے دعا فرمائی کہ یا اللہ اس کو غنی کر دے۔ چند دن کے بعد اس کی بکریوں میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ پہلے تو وہ شخص پانچ وقت کی نماز حضور ﷺ کے ساتھ ہی پڑھتا تھا، مگر پھر بکریوں کے ریوڑ کی دیکھ بھال میں اتنا مصروف ہوا کہ صرف جمعہ کی نماز حضور ﷺ کے ساتھ پڑھنے لگا۔ پھر ریوڑ اتنا بڑھ گیا کہ مدینہ میں جگہ کم پڑ گئی، تو مدینہ کے باہر جا کر آباد

ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد حضور ﷺ نے ایک صحابی کو روانہ کیا کہ جاؤ، اس سے زکوٰۃ لے کر آؤ۔ وہ شخص مال کی کثرت کے باعث اتنا متکبر ہو چکا تھا کہ اس نے یہ سخت جملہ کہہ دیا کہ ”یہ زکوٰۃ تو مجھے تاوان لگتا ہے!“ اور صحابی کو اس جواب کے ساتھ واپس بھیج دیا کہ حضور ﷺ سے کہنا میں خود بعد میں زکوٰۃ لیکر آ جاؤں گا۔ جب یہ بات حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ خاموش ہو گئے، لیکن اللہ کے دربار میں یہ گستاخی پسند نہ کی گئی۔ چند دن کے بعد وہ شخص اپنی زکوٰۃ لے کر حضور ﷺ کے پاس آیا اور درخواست کی کہ زکوٰۃ لے لیں۔ حضور ﷺ نے انکار فرمادیا کہ اب تمہاری زکوٰۃ قبول نہیں کی جاسکتی۔ وہ شخص روتا پیٹتا رہا اور اسی طرح مایوس واپس لوٹ گیا۔ پھر جب تک حضور ﷺ مسلمانوں کے بیچ موجود رہے، اس شخص کی زکوٰۃ قبول نہیں کی گئی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور آیا۔ یاد رکھیے گا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف تلوار نکالی تھی۔ اب وہ شخص حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس آیا کہ میری زکوٰۃ قبول کر لیں۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے جواب دیا کہ جس کی زکوٰۃ حضور ﷺ نے قبول نہیں کی، اس کی زکوٰۃ میں بھی قبول نہیں کروں گا۔ وہ شخص حضرت عمرؓ کے زمانے تک زندہ رہا۔ وہ چختار ہا اور درخواست کرتا رہا کہ کوئی میری زکوٰۃ قبول کر لے، مگر حضرت عمرؓ نے بھی اسکی زکوٰۃ قبول نہیں کی۔

یہ مثال بتانے کا مقصد یہ ہے کہ ادب رسول ﷺ کے معاملے میں کبھی بھول کر بھی غلطی نہ کیجئے گا۔ یہاں غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ایک غلطی کی بدولت بندے کی ساری کائنات لٹ جاتی ہے۔ حضور ﷺ اپنی امت کی غلطیوں کی شفاعت کرنے والے ہیں، مگر اللہ کے رسول ﷺ کے دربار میں اگر کوئی گستاخی ہوگئی، تو کائنات میں کوئی بھی بچانے والا نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ گستاخ رسول ﷺ کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ اسی لیے اللہ کے نیک بندے جب حج یا عمرے کے لیے جاتے ہیں تو بے چین رہتے ہیں کہ کہیں کوئی غلطی نہ سرزد ہو جائے۔ مکہ میں تو لوگ خانہ کعبہ کے پردوں کو پکڑ کر رو رہے ہوتے ہیں اور اونچی اونچی آواز میں اللہ سے دعا کر رہے ہوتے ہیں، مگر یہی لوگ جب مسجد نبویؐ پہنچتے ہیں تو ادب کے مارے انکی سانسیں بھی رک جاتی ہیں۔ کسی کی جرأت نہیں ہوتی اونچا بولنے کی۔ سب ادب رسول ﷺ کے تحت خاموشی سے بیٹھ جاتے ہیں۔ روزہ پاک ﷺ کی طرف پیٹھ کر کے کوئی نہیں بیٹھتا۔ مگر کچھ بد بخت وہاں بھی ادب رسول ﷺ کا دھیان نہیں رکھتے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ مدینہ، خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ میں وہی لوگ جاتے ہیں کہ جن کو بلاوا آتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو بلاوا تو آتا ہے، لیکن وہ کچھ لینے کے بجائے اپنے اعمال ضائع کروا آتے ہیں۔ اس لیے اس باب میں ہم خاص طور پر ادب مسجد نبویؐ اور ادب رسول ﷺ کے حوالے سے بات کریں گے۔

سب سے بڑا تحفہ جو انسان حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہے، وہ درود شریف ہے۔ مسلمانوں کو کثرت سے درود شریف پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو مسلمان کثرت سے درود شریف پڑھتا ہے، اس کو ظاہر و باطن میں ہر وہ خیر عطا ہو جاتی ہے کہ جو اللہ ایک بندہء مومن میں دیکھنا چاہتا ہے۔



## سوالات و جوابات

سوال: فقر کیا ہے اور فقیر کسے کہتے ہیں؟

جواب: حضور ﷺ کی بے شمار شانیں ہیں۔ آپ ﷺ رسول اللہ ﷺ بھی ہیں اور رحمت العالمین ﷺ بھی۔ آپ ﷺ کے اسمائے مبارک آپ ﷺ کی ۹۹ شانوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے اپنی کسی شان پر کبھی فخر نہیں فرمایا، سوائے ”فقر“ کے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: الفقير فخری ”میرا فقر ہی میرا فخر ہے“۔ ہم عموماً اس شخص کو فقیر کہتے ہیں کہ جس کے پاس دنیاوی مال و متاع نہیں ہوتا۔ فقیر یہ نہیں ہے۔ فقر دین کی ایک بہت بڑی اصطلاح ہے! ایک بہت بڑا مقام ہے، دین اسلام کا دوسرا نام ہی فقر ہے۔ اسی لیے اقبالؒ کہتے ہیں:

لفظ ’اسلام‘ سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر

دوسرا نام اسی دین کا ہے، ”فقر غیور“!

یعنی ”غیرت مند فقر“۔ حقیقی معنوں میں روحانیت، معرفت اور طریقت میں فقیر اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو یہ جان لے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کا دیا ہے۔ فی الاصل اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں۔ جب انسان ”لا الہ الا اللہ“ کہتا ہے، یعنی نہیں ہے کوئی الہ سوائے اللہ کے، تو سب سے پہلے اس بت کو توڑتا ہے کہ جو انسان نے خود اپنے وجود میں بنایا ہوتا ہے۔ قرآن کی آیت ہے کہ کیا تم نے دیکھا ہے اس شخص کو کہ جس نے اپنی خواہشات نفس کو اپنا ”الہ“ بنایا ہوا ہے! ایک فقیر ہر بت کو توڑ چکا ہوتا ہے، چاہے وہ اس کا نفس ہو، مال و دولت ہو، دنیا کی محبت ہو، جاگیریں ہوں، اولادیں ہوں، عہدہ ہو، شہرت ہو یا عزت۔ جو ہر طاغوت سے انکار کر کے سیدی رسول اللہ ﷺ سے اپنا ایسا تعلق قائم کر لے کہ جو رشتہ کبھی ٹوٹنے والا نہ ہو، تو وہ شخص حقیقتاً فقیر ہے۔

حضور ﷺ کی ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ جب بندہ اللہ کے قریب آتا ہے، تو نوافل میں کثرت کرتا ہے اور اللہ سے پیار کرنے لگتا ہے۔ اس محبت میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اللہ اس بندے کی محبت میں خود فرماتا ہے کہ میں اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ کام کرتا ہے، پاؤں بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ چلتا ہے، زبان بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ بولتا ہے! اللہ تعالیٰ اس کے وجود کے اندر وہ خیر و برکت عطا فرماتا ہے کہ وہ قاری نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں قرآن ہو جاتا ہے۔ وہ تہاری و غفاری و قدوسی و جبروت بن جاتا ہے۔ دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ لنگی تو لب اقبالؒ سے ہے، مگر حقیقت جاننے والے جانتے ہیں کہ کس کی ہے وہ صدا! بلوانے والے نے

ان سے کیا خوب کلام کہلویا، کون ان کے ہاتھ بن گیا، کون ان کے پاؤں بن گیا اور کون ان کی زبان۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفرین، کار کشا، کار ساز

بندہ فقیر کی نگاہ سے تقدیریں بدلتی ہیں، وہ رب کا راز دار ہوتا ہے، خودی کا ترجمان ہوتا ہے، وہ وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل بلند کرتا ہے، لوح و قلم اس کی دسترس میں ہوتے ہیں۔ آج تک کائنات میں کوئی شخص فقیر نہیں بنا کہ جب تک وہ پہلے عاشق رسول ﷺ نہ بنا ہو۔ عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ ہی سب کچھ عطا کرتا ہے۔ چنانچہ فقرا ایک ایسا مقام ہے کہ جہاں بندہ مومن اپنے رب کا دست و بازو بن جاتا ہے، مگر اس سے پہلے اس کو جس پہلی سیڑھی پر قدم رکھنا ہوتا ہے، وہ ادب رسول ﷺ ہے، عشق رسول ﷺ ہے، اس کے بعد ہی فقر کا سفر شروع ہوتا ہے۔

.....

سوال: ایسے کونسے مقامات ہیں کہ جہاں روزمرہ کے معاملات میں ہم سے انجانے میں بے ادبی سرزد ہو جاتی ہے؟

جواب: ہم میں سے کوئی بھی مسلمان حضور ﷺ کی بے ادبی نہیں کرنا چاہتا، لیکن کبھی کبھی انجانے میں کچھ باتیں ایسی ضرور سرزد ہو جاتی ہیں۔ حضور ﷺ نے ایک حدیث شریف بیان فرمائی کہ جس کا مفہوم ہے کہ تین لوگ بہت بدنصیب ہیں: ایک وہ کہ جس کو رمضان کے روزے ملیں اور اس میں وہ اپنی مغفرت نہ کروا سکے، دوسرا وہ کہ جس کو بوڑھے والدین ملیں اور وہ ان کی خدمت کر کے اپنی مغفرت نہ کروا سکے، اور تیسرا وہ کہ جس کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک لیا جائے اور وہ درود شریف نہ پڑھے!

یہ سب سے بڑی کوتاہی اور غلطی ہے کہ جو روزمرہ کی زندگی میں ہم سے ہوتی ہے۔ اذان ہو رہی ہوتی ہے، اس میں حضور ﷺ کا اسم مبارک آتا ہے، مگر ہم اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں، درود شریف نہیں پڑھتے۔ حضور ﷺ کے اسم مبارک پر درود شریف پڑھنا لازم ہے۔ اگر آپ کتاب میں حضور ﷺ کا اسم مبارک لکھتے ہیں یا درود شریف لکھتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب تک وہ کتاب قائم ہے، جب تک وہ حروف قائم ہیں، وہ درود شریف لکھنے والے کو اس کی برکت اور خیر پہنچتی رہے گی۔ ہم نے ایسے بھی باادب دیکھے ہیں کہ جب ان کے سامنے حضور ﷺ کا اسم مبارک آتا ہے، تو اگر وہ بے تکلف بیٹھے ہوں تو فوراً اٹھ کر باادب بیٹھ جاتے ہیں۔ یہی باادب پھر بانصیب بھی ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ حضور ﷺ کا ادب تو کرنا چاہتے ہیں مگر علم کے سبب ادب کر نہیں پاتے۔ صحابہ کرامؓ نے آپ ﷺ کو ”یا محمد ﷺ“، کبھی نہیں

کہا، ہمیشہ ”یا رسول اللہ ﷺ“ کہہ کر مخاطب کرتے۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ حضور ﷺ کو ان کے پہلے اسم مبارک سے پکارے۔ یہ سخت بے ادبی ہے۔ نعتوں میں بھی لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی بے ادبی کر جاتے ہیں۔ ایک نعت ہے کہ ”محمد ﷺ کا روزہ قریب آ رہا ہے“، اس میں نہ چاہتے ہوئے بھی سخت بے ادبی ہو رہی ہے۔ حضور ﷺ کا نام مبارک نہیں لیا جاسکتا، جب تک کہ اسکے ساتھ درود شریف کا اضافہ نہ کیا جائے۔

اسی طرح قرآن پاک کے بہت سے تراجم ہیں کہ جن میں لوگ قرآن کی آیات کا ترجمہ کرتے ہوئے حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کر جاتے ہیں۔ جیسے انگریزی میں ایک لفظ ہے ”You“ کہ جو چھوٹے بڑے سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ عربی میں یہی لفظ ”انت“ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ”انت“ ہر چھوٹے بڑے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ لفظ جب اردو میں استعمال ہوتا ہے تو ہمارے پاس اس کیلئے کئی الفاظ موجود ہیں۔ بڑوں کو ہم ”آپ“ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں، چھوٹوں کو ”تم“ کہہ کر بات کرتے ہیں اور کسی کو تو ”تو“ بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ تو جب قرآن کی کوئی آیت کہ جس میں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ مخاطب کرتے ہیں، مثلاً ”قل ہو اللہ احد“ تو اس کا ترجمہ یہ بھی تو کیا جاسکتا ہے؟ ”اے میرے پیارے حبیب ﷺ، اے میرے پیارے نبی ﷺ، اے میرے پیارے رسول ﷺ، آپ یہ ارشاد فرمائیے۔“ بے ادب ترجمہ کرنے والے (نعوذ باللہ) یہ ترجمہ بھی کرتے ہیں: ”اے نبی ﷺ یہ کہہ“ (استغفر اللہ)۔ ترجمہ با ادب بھی تو کیا جاسکتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہہ رہے کہ یہ گستاخی جان بوجھ کر کی جاتی ہے۔ یہ ادب رسول ﷺ کے تقاضوں سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح لوگ جب مسجد نبوی ﷺ میں جاتے ہیں تو موبائل فون انکے ساتھ ہوتے ہیں، کہ جن پر مختلف گانوں اور سُرّوں والی گھنٹیاں (Ring Tones) بجز رہی ہوتی ہیں۔ عین نماز کے دوران پوری مسجد نبوی میں ہر طرف موسیقی بجز رہی ہوتی ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ لوگوں نے جو تے ہاتھوں میں اٹھائے ہوتے ہیں اور اونچی آواز میں فون پر بات کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ مقام اتنا ادب والا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ حضور ﷺ کے سامنے اپنی آوازوں کو بھی بلند نہ کرو تو صحابہؓ نے مسجد نبوی میں سرگوشیوں میں باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ ایک صحابیؓ کی آواز قدرتی طور پر بلند تھی، وہ اونچی آواز میں بات کرتے تھے۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے کہ میں تو مر گیا، تباہ و برباد ہو گیا۔ میری آواز تو ہے ہی رسول ﷺ کی آواز سے اونچی۔ اس پر ان کو تسلی دی گئی کہ آپ بے ادب نہیں ہیں۔ آج مسجد نبوی سے ادب اٹھ گیا ہے، اور یہی امت کے زوال کا سبب ہے۔

ایک بڑا المیہ کہ جس کا ہم خاص طور پر ذکر کرنا چاہیں گے۔ ہم خواہش کرتے ہیں کہ مسجد نبوی جا کر روضہ پاک کی زیارت کریں۔ مگر جب روضہ پاک کے سامنے جاتے ہیں تو شیطان اپنے وسوسے ڈالنا شروع کر دیتا ہے اور سارا ادب بھلا دیتا ہے۔ یہ فکر ڈال دیتا ہے کہ دور یال کی جوتی گم گئی تو کیا کرو گے؟ گھر والوں نے جن چیزوں کی فرمائشیں کی ہیں، وہ تو ابھی تک خریدیں نہیں، ہوٹل کا کمرہ آرام دہ نہیں ہے، واپس جا کر کمرہ تبدیل کرتا ہوں، کھانے کیلئے ہوٹل کو نسا اچھا ہے، غرضیکہ شیطان ہر فنّہ اس وقت انسان کے وجود میں ڈالتا





ہے کہ جب وہ کائنات کے شہنشاہ کے دربار میں ہزاروں میل کا سفر کر کے اپنی مغفرت کروانے پہنچتا ہے۔

ہوں چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

جوئی کی حفاظت کیلئے، لوگ جوتے ہاتھ میں اٹھا کر ہی روضہء پاک پر سلام کرنے چلے جاتے ہیں۔ ان سے کوئی پوچھے کہ اللہ کے بندے، جب تم اپنے باپ سے ملنے جاتے ہو، بادشاہ وقت سے ملنے جاتے ہو یا کسی بڑے سرکاری افسر سے ملنے جاتے ہو تو کیا جوتے ہاتھ میں رکھتے ہو؟ کیا صرف زیارت رسول اللہ ﷺ کے وقت ہی جوتے ہاتھ میں رکھنا ضروری ہے؟ اتنا قیمتی جوتا ہے آپ کا کہ اسکی خاطر آپ ساری عمر کے اعمال ضائع کروانے پر تیار ہیں؟ یہی وہ بے ادبی ہے کہ جو نہ چاہتے ہوئے بھی سرزد ہو جاتی ہے۔

بہت سے لوگ حضور ﷺ کے حوالے سے جب بحث کر رہے ہوتے ہیں تو حضور ﷺ کے بارے میں اس طرح مخاطب ہو رہے ہوتے ہیں جیسے کہ اپنے دوستوں کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔ قرآن پاک میں اس سے سختی سے منع کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ رسول ﷺ کے بلانے کو ایک دوسرے کو بلانے کی طرح نہ سمجھو۔ حضور ﷺ کے بارے میں اس طرح باتیں نہ کرو کہ جیسے تم اپنے دوستوں اور ساتھیوں کے بارے میں بات کرتے ہو۔ وہ بہت ادب کا مقام ہے۔ ہزار دفعہ بھی گلاب سے منہ دھولیں تب بھی انسان حضور ﷺ کا اسم مبارک لینے کے قابل نہیں ہوتا۔ جہاں حضور ﷺ کا اسم مبارک لیا جائے، وہاں درود شریف پڑھیں۔ فرمایا گیا ہے کہ اس سے بدتر محفل کوئی نہیں ہوتی کہ جس محفل میں لوگ جمع ہوں اور رسول اللہ ﷺ پر درود شریف نہ پڑھا جائے۔ اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنائیں کہ جس محفل میں بیٹھیں، کلاس روم میں جائیں یا دوستوں کے پاس جائیں تو سب سے پہلے اپنے دل میں درود شریف ضرور پڑھیں۔ ممکن ہو تو تھوڑا سا اونچی آواز میں پڑھ لیں تا کہ دوسرے بھی سن لیں۔ جو درود شریف پڑھنے میں شرمندگی محسوس کرتا ہو، اسکو دنیا و آخرت میں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

یہ باتیں بظاہر چھوٹی نظر آتی ہیں، مگر ان کے اثرات بہت بڑے ہیں۔ کوئی جان بوجھ کر تو گستاخی رسول ﷺ نہیں کرنا چاہتا۔ غلطی تو ان باتوں میں ہوتی ہے کہ جن کو انسان چھوٹا سمجھتا ہے۔ ان کا دھیان رکھنا نہایت ضروری ہے۔

سوال: ہم آپ کی محفل میں بیٹھتے ہیں تو ہم اپنے اندر عشق رسول ﷺ کی آگ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن بعد میں یہ آگ دھیرے دھیرے ٹھنڈی پڑ جاتی ہے۔

جواب: اپنے دلوں میں عشق رسول ﷺ کی آگ کو زندہ رکھنے کیلئے ایمان کی تجدید ضروری ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنے ایمان کی تجدید کرتے رہا کرو۔ شیطان بڑا ناپاک ہے۔ انسان کے دل میں وسوسے ڈال دیتا ہے، انسان کو گمراہ کرتا ہے۔ اسی لیے

حضور ﷺ سے اپنے تعلق کو قائم رکھنے کے لیے ذکر اللہ اور ذکر قلبی کی بات کی جاتی ہے۔ جب بھی انسان طریقت کے کسی سلسلے میں اپنے مرشد کے پاس جاتا ہے اور روحانیت اور تزکیہ کی پہلی سیڑھی چڑھنا شروع کرتا ہے، تو مرشد پہلی ہدایت ہی یہ کرتے ہیں کہ اللہ کا ذکر کرو۔ اقبالؒ نے بھی یہی کہا تھا کہ میں پوری دنیا گھوم کر آیا، لیکن پناہ ملی تو ”اللہ ہو“ کے ذکر میں ملی۔ ”اللہ“ کے ذکر کی طرف اشارہ قرآن کی اس آیت میں ہے، ”اپنے رب کے اسم کا ذکر کرو“ ”اللہ ہو“ کا ذکر ”لا الہ الا ہو“ سے نکلا ہے۔ طریقت کے سلسلوں میں ”اللہ ہو“ کے ذکر کے بعد کثرت سے درود شریف پڑھنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اس عمل سے شیطان کا مقابلہ کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی ہے۔

حضور ﷺ نے ایک اور حدیث شریف میں یہ بھی فرمایا ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ انسان اپنے دوستوں کے دین پر ہو جاتا ہے! لہذا اپنی محفلیں بہت احتیاط سے چنیں۔ آپ جس طرح کی محفل میں بیٹھیں گے، اسی طرح کے ہو جائیں گے۔ اسی لیے اللہ کے بندے، اولیاء اللہ، فقراء اور درویشوں کی محفلیں اور صحبتیں تلاش کرتے ہیں۔

حضور ﷺ سے نسبت اور تعلق کے لیے درود شریف لازمی ہے۔ آپ کا درود شریف جب حضور ﷺ تک پہنچتا ہے تو فرشتے آپ کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں۔ آپ کا نجات کے کسی بھی حصے میں ہوں، جب آپ درود شریف پڑھتے ہیں تو ملائکہ آپ کا درود و سلام حضور ﷺ تک پہنچاتے ہیں اور پھر اس محفل میں آپ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ درود شریف کی برکات کو کبھی چھوٹا نہ سمجھیے گا۔

ایک صحابیؓ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ ﷺ! جب میں دعا کرتا ہوں تو اس میں ۲۵ فیصد آپ ﷺ پر درود بھیجتا ہوں اور باقی اپنے لیے دعا کرتا ہوں، کیا یہ ٹھیک ہے؟ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ، اچھی بات ہے، لیکن اگر اس سے بھی زیادہ کرو تو بہتر ہے۔ صحابیؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! اب میں ۵۰ فیصد آپ ﷺ کے لیے درود شریف پڑھا کروں گا اور ۵۰ فیصد اپنے لیے دعا کروں گا، یہ ٹھیک ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ، یہ بہتر ہے لیکن اگر اس سے بھی زیادہ کرو تو اور بہتر ہے۔ صحابیؓ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ! اب میں ۷۵ فیصد آپ ﷺ کے لیے دعا کیا کروں گا اور ایک چوتھائی اپنے لیے کیا کروں گا۔ کیا یہ بہتر ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ، مگر اس سے بھی زیادہ کرو تو بہتر ہے۔ اس پر وہ صحابیؓ کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! آج کے بعد تو میں کبھی اپنے لیے کچھ نہیں مانگوں گا، صرف آپ ﷺ پر درود و سلام پڑھا کروں گا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ، پھر اللہ تم کو وہ کچھ دے گا کہ جو دعا مانگنے والے کو بھی نہیں ملتا!

تو حضور ﷺ سے تعلق قائم کرنے کیلئے بہترین نسخہ درود شریف ہے۔ ہمارے بزرگ ہمیں سکھاتے ہیں کہ بڑوں کے پاس خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔ جب انسان مسجد نبویؐ جائے تو یونہی منہ اٹھا کر نہیں چلے جانا چاہیے۔ یہ خلاف ادب ہے۔ جب کوئی شخص حج یا عمرہ کے لیے جا رہا ہوتا ہے، تو ہر دوست احباب اپنے ظرف کے مطابق اس سے کچھ چیزیں طلب کرتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ دعا کرنا کہ میری بیٹی کی شادی ہو جائے، میرا مقدمہ ٹھیک ہو جائے۔ کچھ بدنصیب ایسے بھی ہیں کہ جو مدینہ منورہ سے صرف کھل منگواتے ہیں یا گھڑی اور دیگر

چیزوں کی فرمائشیں کرتے ہیں۔ مگر بہت کم لوگ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو میرا سلام کہنا۔ یہ سب اپنے اپنے نصیب اور تربیت کی بات ہے۔

مسجد نبوی میں جانے کے آداب یہ ہیں کہ پہلے آپ اپنے آپ کو حضور ﷺ کے سامنے پیش کریں۔ ان پر سلام بھیجیں، خالی ہاتھ نہ جائیں بلکہ درود شریف اور نیک اعمال کے تحفے لیکر جائیں۔ ایسے تحفے کبھی ضائع نہیں ہوتے۔ دربار نبوی پر حاضری سے پہلے، اللہ کے بعض بندے عمرہ کرتے ہیں، اور پھر اس عمرے کو تحفہ سیدی رسول اللہ ﷺ کو مدینہ آکر پیش کرتے ہیں۔ جو تحفہ سیدی رسول اللہ ﷺ قبول فرمالیں، وہی دنیا و آخرت میں قبول ہے۔

اسکے علاوہ مسجد نبوی ﷺ میں آج بھی اولیاء، علماء اور فقراء کی ایک بہت بڑی جماعت رہتی ہے کہ جو صرف قرآن اور دین سیکھتے ہیں۔ اصحاب صفہ کی سنت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور پھر دوسروں کو دین سکھاتے ہیں۔ ان کا کوئی ذریعہ آمدن نہیں ہوتا۔ وہ حضور ﷺ کے مہمان ہوتے ہیں۔ تو جو اللہ کے بندے حضور ﷺ کی زیارت کے لیے مسجد نبوی حاضری کے لیے جاتے ہیں وہ اس بات کو بھی لازم کر لیتے ہیں کہ مسجد نبوی میں بیٹھے ہوئے فقراء کی اپنی استطاعت سے بڑھ کر خدمت کریں۔ اسکے جواب میں وہ فقراء آپ کے لیے دعائے خیر کرتے ہیں اور یہ دعا ضرور لگتی ہے۔ ان سے بات کرو تو بتاتے ہیں کہ مجھے پچاس سال روضہ مبارک پر ہو گئے ہیں، مجھے ستر سال روضہ مبارک پر ہو گئے ہیں۔ یہ تمام اولیاء حضور ﷺ کے مہمان ہوتے ہیں۔ ان کو تلاش کریں، خدمت کریں، ادب کریں اور ان سے دعائیں کروائیں۔ ان کی سفارش دربار نبوی ﷺ میں کبھی رد نہیں ہوتی۔

ان بزرگوں کے چہرے اتنے نورانی ہوتے ہیں کہ انسان کی نگاہیں نہیں ٹک پاتیں۔ وہ اتنے عاجز اور مسکین ہوتے ہیں کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے سے پہلے ہی ان کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں اور وجود اللہ کی خشیت سے لرزنے لگتا ہے۔ ایسے فقراء کو تلاش کریں۔ یہ ستونوں کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں۔ کوئی حبشی ہوگا، کوئی سوڈانی تو کوئی یمنی۔ ماشاء اللہ، پاکستان کے فقراء بھی ہیں کہ جو پچاس، ساٹھ، ستر سال سے مدینہ منورہ میں ہی آباد ہیں اور مسجد نبوی میں آنے والوں کیلئے دعائے خیر کرتے ہیں، ان کے دیئے ہوئے تحفے قبول کرتے ہیں۔ اگر کسی کا تحفہ رد کر دیا جائے تو وہ اپنی خیر منائے!

سوال: لفظ ”عشق“ ہمیں قرآن میں نہیں ملتا۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: لفظ ”عشق“، قرآن و سنت میں تو نہیں ملتا مگر درحقیقت ہم اپنا مطلب سمجھانے کیلئے بہت سے الفاظ ایسے بھی استعمال کرتے ہیں کہ جو قرآن و سنت میں موجود نہیں ہوتے۔ جس طرح نماز کا لفظ قرآن میں موجود نہیں ہے۔ قرآن میں تو ”صلوۃ“ ہے۔ روزہ بھی قرآن کی اصطلاح نہیں۔ ”خدا“ کا لفظ بھی قرآن میں نہیں ہے۔ یہ تمام الفاظ فارسی کے ہیں، اور اس تہذیب کی وجہ سے





اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح ”عشق“ کی اصطلاح ہے۔ عربی زبان میں عشق کا لفظی مطلب تھوڑا رومانوی سا ہوتا ہے۔ مگر جب تصوف، طریقت اور معرفت میں اللہ تعالیٰ سے محبت کے اظہار کیلئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کا کوئی منفی معنی نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب ”عشق حقیقی“ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے شدید محبت۔ سورہ البقرہ، آیت ۱۶۵ میں ہے: ”وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ“ عشق الہی یا عشق رسول ﷺ کی یہ اصطلاحیں کسی حوالے سے بھی بے ہودہ نہیں، بلکہ عشق کا لفظ شدت کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ لفظ فارسی اور اردو زبان میں علامہ اقبالؒ نے بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق  
عقل ہے محو تماشا لے لب بام ابھی

سوال: گستاخ رسول ﷺ کیلئے کیا حکم ہے؟

جواب: اسلامی معاشرے میں یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں کہ کوئی شخص جان بوجھ کر حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کر سکتا ہے۔ کیونکہ اگر کوئی مسلمان حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرے تو وہ دائرہ ایمان سے ہی خارج ہو جاتا ہے، اور اس کی سزا بڑی شدید ہے۔

حضور ﷺ کے دور میں بہت سے لوگوں نے حضور ﷺ کی شان میں گستاخیاں کیں۔ صحابہ کرامؓ کا دل چاہتا تھا کہ ان کو قتل کر دیں۔ بہت سے مواقع ایسے بھی آئے کہ حضور ﷺ نے صرف اس لیے صحابہ کرامؓ کو روکا کہ گستاخی کرنے والا بدنیت نہیں تھا، نہ سمجھی میں اس سے گستاخی سرزد ہوئی۔

ایک مرتبہ ایک بدو حضور ﷺ کے پاس آیا اور آپ ﷺ سے سختی سے بات کی۔ حضور ﷺ کے گلے مبارک میں موجود چادر بھی کھینچی، اور کہا: مجھے مال دیں اور سامان میرے اونٹ کے اوپر لدا دیں۔ اس بدتمیزی پر صحابہ کرامؓ اس شخص کو قتل کرنے کیلئے دوڑے، مگر حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو روک دیا اور اس بدو سے فرمایا، اچھا میرے پاس آؤ، کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا مجھے مال دیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”میں تمہیں سب کچھ دوں گا، کیا پھر تم راضی ہو جاؤ گے؟“ اس نے کہا: ”ہاں! پھر میں راضی ہو جاؤں گا۔“ حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے کہا کہ اس کے اونٹ پر مال لا دیں۔ صحابہ کرامؓ نے ایسا ہی کیا۔ اس پر وہ بدو بہت خوش ہو گیا۔ پھر حضور ﷺ نے اس سے پوچھا کہ کیا اب تم راضی ہو؟ تو اس نے کہا کہ ہاں میں راضی ہوں۔ پھر حضور ﷺ نے اس کو فرمایا کہ جاؤ اور اب یہ بات میرے صحابہ کو بھی بتا دو، کیونکہ وہ تم سے ناراض ہیں۔ تو وہ صحابہ کو بتا کر اونٹ پر بیٹھا اور چلا گیا۔ اسکے بعد حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو بلایا اور فرمایا کہ جس کا مفہوم یہ ہے کہ

دیکھو اس بدو کی مثال ایسے تھی کہ جیسے گاؤں یا شہر میں کسی کا اونٹ گم ہو جائے اور سب لوگ اس اونٹ کو پکڑنے کے لیے بھاگیں۔ پھر اونٹ کا مالک آئے اور اونٹ کو پیار کرے، اس کو چکارے، اسکے بعد اونٹ دوبارہ بھاگنا بند کر دے اور اپنے مالک کے پاس آجائے اور مالک پکڑ کر اس پر کاٹھی ڈال دے۔ حضور ﷺ نے مزید فرمایا کہ اس بدو جیسے لوگ میرے اونٹ ہیں، یہ تمہارے قابو میں آنے والے نہیں۔ اگر یہ میرے پاس آئیں گے تو میں محبت اور پیار سے ان کو سدھار دوں گا، اگر تم لوگ اس کو قتل کر دیتے تو یہ جہنم میں چلا جاتا!

صاحب بصیرت اور صاحب نظر لوگ اسی طریقے سے دلوں کو پھیر لیتے ہیں، لیکن اگر کوئی بالکل ہی بد بخت ہو جائے تو پھر اس کی سزا وہی ہے کہ جو ملعون راج پال کی ہوئی۔

علامہ اقبالؒ کے دور میں دو تین واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ چند گستاخوں نے حضور ﷺ کی شان میں گستاخانہ کتابیں لکھیں، ان میں سے ایک کو تو غازی عبدالقیومؒ نے، کہ جو کراچی میں تانگہ چلاتے تھے، قتل کیا، اور دوسرے کو غازی علم الدینؒ نے۔ عبدالقیومؒ کا کیس علامہ اقبالؒ کے پاس بھی آیا تاکہ وائسرائے سے بات کی جائے اور عبدالقیومؒ کی جان بچائی جاسکے۔ علامہ اقبالؒ سوچ میں پڑ گئے اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ علامہؒ نے پوچھا کہ عبدالقیومؒ کا کیا حال ہے؟ کیا وہ کمزور پڑ گیا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں! عبدالقیومؒ نے تو گستاخ رسول ﷺ کو قتل کیا ہے، وہ تو خوشی سے اعلان کرتا ہے کہ میں نے اس کافر کو قتل کیا ہے اور میں معافی کی بھیک نہیں مانگوں گا، میں نے تو شہادت خریدی ہے۔

اس پر اقبالؒ نے کہا کہ وہ شخص کہ جس نے شہادت خریدی ہے، اگر وہ زندہ رہا تو غازی اور مرگیا تو شہید۔ تم مجھ سے اس کی سفارش کافروں کے ہاں کروانا چاہتے ہو؟ میں اس



کی سفارش نہیں کروں گا، اس کو شہید کی موت مرنے دو۔ اقبالؒ نے اس واقع پر پوری ایک نظم بھی لکھی:

ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ!

پھر جب غازی علم الدین شہیدؒ نے گستاخ راج پال کو قتل کیا تو اقبالؒ نے روتے ہوئے فرمایا: ”اسی گلاں ای کر دے رہ گئے تے لوہاراں دامنڈا بازی لے گیا“۔ یعنی ہم باتیں کرتے رہ گئے اور لوہاروں کا بیٹا ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ میں بازی لے گیا۔ مسلمان معاشرے میں سب کچھ برداشت ہو سکتا ہے، مگر رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی برداشت نہیں ہو سکتی۔

یہ کام بزرگوں کو نمٹانے چاہئیں۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھٹکا ہوا ”اونٹ“ ہو، غلط فہمی میں گستاخی کر رہا ہو۔ ایسی صورت میں اسکی اصلاح ہو سکتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ المیہ بھی ہے کہ جس سے دشمنی ہوتی ہے، اس پر گستاخ رسول ﷺ کا الزام لگا کر قتل کروادیا جاتا ہے، ایسے معاملات میں انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ لیکن جو لوگ واقعی گستاخ رسول ﷺ ہوتے ہیں، ان کا پھر وہی انجام ہوتا ہے، کہ جس انجام تک عبدالقیومؒ اور علم الدینؒ نے گستاخانِ رسول ﷺ کو پہنچایا تھا۔

سوال: درود شریف پڑھنے کے آداب کیا ہیں؟

جواب: درود شریف دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ ہے کہ جس میں آپ اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ حضور ﷺ پر رحمت و برکت نازل فرما، وہ درود شریف ”اللھم“ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ درود اللہ سے دعا ہے کہ آپ رسول ﷺ پر رحمت نازل کریں۔ اس طرح کے ہزاروں درود شریف ہیں۔

دوسری طرح کے درود شریف وہ ہیں کہ جن میں آپ براہ راست حضور ﷺ کو مخاطب کر کے ان پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ آپ اللہ سے دعا نہیں کرتے بلکہ حضور ﷺ پر صلوٰۃ و سلام پیش کرتے ہیں۔ جیسے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ ﷺ!

آج مسجد نبویؐ میں جا کر لوگ دونوں طرح کے درود شریف پڑھتے ہیں۔ دونوں ہی جائز ہیں۔ آپ دنیا میں کسی بھی مقام پر ہوں، یہ دونوں طرح کے درود شریف پڑھ سکتے ہیں۔

درود شریف کو آپ آہستہ پڑھیں یا اونچی آواز میں یا پھر دل میں، سب کی برکت ایک ہی جیسی ہے۔ اور جہاں مرضی چاہیں درود شریف پڑھیں اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کچھ لوگ باقاعدہ روضہ پاک پر جا کر رسول اللہ ﷺ کو الصلوٰۃ والسلام پیش کرتے ہیں اور بعض کو عشق و جنون اتنا ہوتا ہے کہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہوں، آنکھ بند کر کے روضہ پاک پر چلے جاتے ہیں، اور پھر اس روحانی حاضری میں درود و سلام پیش کرتے ہیں۔



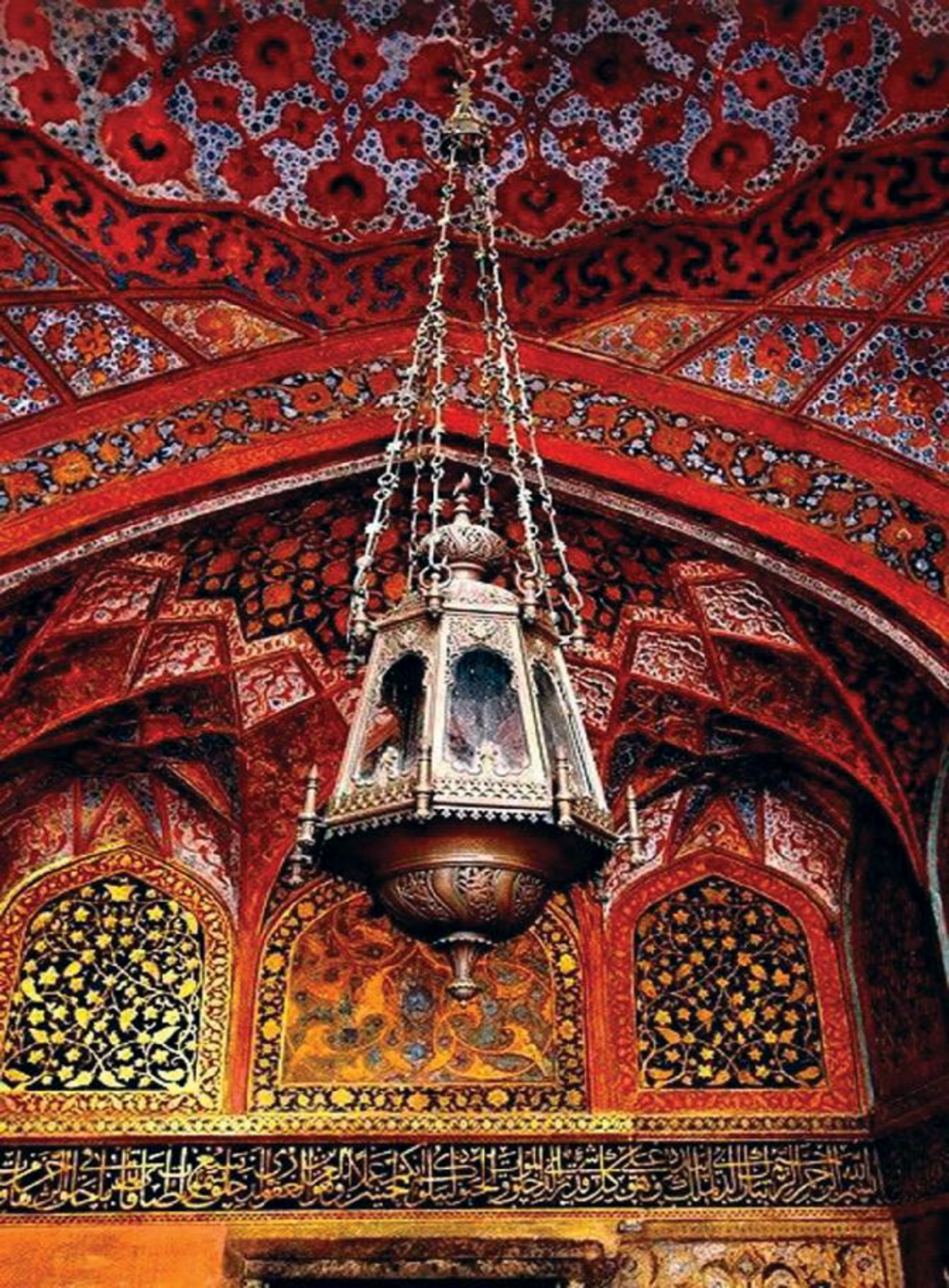


یاد رکھیں! جو حضور ﷺ سے محبت کرنے والے ہیں، وہ کبھی امت میں جھگڑا نہیں ڈالتے، ان کا آپس کا اختلاف باعث فساد نہیں بنتا۔ ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے مسلمان بھائیوں کا ادب کرو، حضور ﷺ کی امت سے پیار کرو، ان کا لحاظ کرو، ان کے ساتھ سختیاں نہ کرو، معاف کرنے والے بنو، گرفت کرنے والے نہ بنو، درگزر کرنے والے بنو، بدلہ لینے والے نہ بنو۔ جو معاملہ تم چاہتے ہو کہ اللہ تمہارے ساتھ کرے، تو وہی تم کو حضور ﷺ کی امت سے بھی رکھنا پڑے گا۔ اگر سختی کرو گے تو اللہ بھی تم پر سختی کرے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے بیان فرمایا جس کا مفہوم ہے کہ جس شخص کو نرمی عطا نہیں کی گئی، اس کو کوئی خیر نہیں عطا کی گئی۔

آج کل مسلمانوں کے بہت سے مسلک بن گئے ہیں۔ لیکن جس مرکز پر مسلمان اکٹھے ہو سکتے ہیں، وہ ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ ہے۔ امت کے احياء کا مرکز بھی یہی ہے اور مسلمانوں کے عروج اور اتحاد کا بھی۔ ان شاء اللہ آنے والے وقتوں میں جب ہم نے پاکستان کی تکمیل کرنی ہے، تو پاکستان میں جس نظریے کو عام کرنا ہے اور جو مسلک اپنے بچوں کو، اپنی آئندہ آنے والی نسلوں کو سکھانا ہے، وہ ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ ہے!











## دوسرا نام اسی دین کا ہے، ”فقر غیور“!

پچھلے ابواب میں ہم نے قرآن فہمی اور سنت مبارکہ سے حکمت حاصل کرنے کے آداب اور عشق و ادب رسول ﷺ پر بات کی تھی۔ علامہ اقبالؒ کہتے ہیں کہ اگر یورپ کو اسلام کے نام سے چڑھے، تو جان لیں کہ اسی دین کا دوسرا نام فقر غیور بھی ہے، یعنی غیرت مند فقر۔ دین کا مقصود اور حضور ﷺ کے اس دنیا میں تشریف لانے کے مقصد کے پیچھے، ایک روحانی اساس موجود ہے۔ وہ اساس یہ ہے کہ ایک ایسی ملت، ایک ایسی قوم پیدا کی جائے کہ جو رب کی عاشق بھی ہو، رسول اللہ ﷺ کا ادب بھی کرے اور دنیا میں وہ تہذیب قائم کر کے دکھائے کہ جس کی بنیاد فقر غیور، شجاعت، دلیری، عدل و انصاف، مساوات اور ایمان پر مبنی ہو۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے کلام میں قرآن پاک کی روح کی نمائندگی کی ہے۔ قرآن پاک کی خوبصورت ترین منظوم تشریح اور حضور ﷺ کی سنت کی حکمت کو اگر کسی نے بیسویں صدی میں کماحقہ بیان کیا ہے، تو وہ علامہ اقبالؒ ہی ہیں۔ اپنے کلام میں جس طرح آپ نے فلسفہ خودی اور فقر غیور، عشق حقیقی، شاہبازی اور بندہ مومن کی حیرت انگیز صفات بیان کی ہیں، وہ آپ ہی کا خاصہ ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے نزدیک دین کا وہ رہبانوی تصور کہ جس میں ایک بندہ عزاہ فقط نماز، روزے اور تسبیح و مناجات میں مگن رہے اور صرف جنت کا خواہشمند ہو، تو اس کا دین نباتات و جمادات کے مذہب سے مختلف نہیں ہے۔ اقبالؒ جس دین کو جانتے ہیں، وہ شیروں اور دیروں کا دین ہے،

جہاں مومن عزت کی زندگی جیتتا ہے اور غیرت کی موت مرتا ہے۔ جہاں اقبالؒ دین کے انقلابی تصور کو مرد مومن سے منسوب کرتے ہیں، اسی طرح وہ دین کے مایوس کن اور رہبانوی تصور کی نمائندگی کیلئے ”ملا“ کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اقبالؒ کے نزدیک ایک ملا میں اور کیڑے مکوڑوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ تو دنیا تبدیل کر سکتے ہیں، اور نہ ہی تاریخ، اور نہ ہی کفر کو ان سے کوئی خطرہ ہوتا ہے، بلکہ ایک ملا صرف دین میں فساد پھیلانے کا انجام دیتا ہے۔

دین ملا، فی سبیل اللہ فساد

اقبالؒ بندہ مومن کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ مرد آزاد و وسعت افلاک میں مسلسل تکبیر دیتا ہے، جبکہ ایک ملا پیوستہ زمین رہ کر صرف تسبیح و مناجات کرتا ہے۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل  
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات  
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست  
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

امت کے زوال کا سب سے بڑا سبب ہی یہ ہے کہ ہم نے ”مسلک مردان خود آگاہ و خدا مست“ کو ترک کر کے وہ مذہب اختیار کر لیا کہ جو تن آسانی اور غلامی کا سبق دیتا ہے۔ ایسا مسلک اور مذہب قوم و ملت و ملک کیلئے موت کا پیغام ہے۔

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اقبالؒ کی نظر میں ایک بندہ مومن اور ملا کے درمیان فرق ہی عشق کا ہے۔ ملا عقل پر چلتا ہے، جبکہ مومن عشق پر۔ اقبالؒ جب بندہ مومن کی صفات بتاتے ہیں تو اس میں عشق کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق رسول ﷺ اور عشق حقیقی کے بغیر مسلمانی بھی ”کافری“ ہے۔

عشق دمِ جبریلؑ، عشق دلِ مصطفیٰ ﷺ

عشق خدا کا رسول ﷺ، عشق خدا کا کلام



دوسرا نام اسی دین کا ہے، ”فقر غیور“!

جب حضور ﷺ سے آخری وقت میں جبریل امینؑ نے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ اس حیات مبارکہ کو جاری رکھنا چاہتے ہیں یا اپنے رب کے پاس لوٹنا چاہتے ہیں، تو سیدی رسول اللہ ﷺ نے اس اختیار کے باوجود فرمایا: ”اللھم الرفیق الاعلیٰ“۔ سیدی رسول اللہ ﷺ نے عشق حقیقی کو اختیار فرمالیا۔

حضور ﷺ کی حیات مبارکہ کو اٹھا کر دیکھئے، ایک انقلابی دعوت ہے، ایک طوفانی سفینہ ہے۔ اس زندگی میں ظاہری سکون نہیں تھا، وہاں تن آسانی، آرام اور آسائشوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ غزوہ ٔ خندق میں صحابہ کرامؓ خندق کھودتے وقت ترانے پڑھتے تھے کہ عیش تو آخرت میں ہی ملے گا! تمام صحابہؓ اس حقیقت سے واقف تھے کہ کلمہ ٔ طیبہ ادا کرنے کے بعد ان کی پوری زندگی ایک تصادم میں گزرے گی، اس دنیا میں تو فقط آزمائشیں اور تکالیف ہیں۔

اقبالؒ بھی اس حقیقت سے بہت اچھی طرح واقف تھے کہ اگر کوئی مسلمان کفر کے ساتھ حالت تصادم میں نہیں ہے، تو وہ صاحب ایمان ہی نہیں ہے۔

چوں من گویم مسلمانم بلرزم  
کہ دامن مشکلات ”لالہ“ را

نبوت کے تینیس سال اٹھا کر دیکھ لیجیے، حضور ﷺ کی زندگی میں وقت کے طاعوت سے تصادم کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ مگر اتنی خندہ پیشانی سے سب مشکلات برداشت کیں کہ ایک مرتبہ بھی اللہ تعالیٰ سے شکوہ نہ کیا۔ ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ حضور ﷺ کے پاس آئے اور شکوہ کیا کہ بھوک سے اس قدر بری حالت ہے کہ ہم نے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے ہیں۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے اپنا کرتا مبارک ہٹا کر دکھایا۔ آپ ﷺ کے پیٹ مبارک پر دو پتھر بندھے ہوئے تھے۔ یہ ہے فقر غیور!

ہمارے دین کا مقصد بھی ایک ایسی نسل تیار کرنا ہے کہ جو اتنی غیر متمند ہو کہ اگر جبرائیلؑ بھی اس سے کوئی حاجت پوچھیں تو وہ انکار میں جواب دے۔ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکا جا رہا تھا، تو جبرائیلؑ نے ابراہیمؑ سے آکر پوچھا: ”کیا کوئی حاجت ہے؟“ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: ”تم سے کوئی حاجت نہیں“۔ جبرائیلؑ نے پھر دریافت فرمایا: ”اللہ سے کوئی حاجت ہے؟“ ابراہیمؑ نے جواب دیا: ”اس کو پتا ہے!“ یہ ہے فقر غیور!

اگر کسی قوم کا ہر فرد اس غیرت سے آراستہ ہو تو پھر اس قوم کو شکست دینا ناممکن ہے۔ ہمارا المیہ ہی یہ ہے کہ ہم نے یہ فقر غیور کھو دیا ہے۔ قرآن پاک میں ایک جماعت کا ذکر ہے کہ جس کو کفار نے آگ میں ڈال دیا تھا اس لیے کہ وہ اللہ پر ایمان لے آئے تھے۔ قرآن میں

انہیں ”اصحاب الاخدود“ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ غیرت مند لوگ بھڑکتی آگ میں اپنے بیوی بچوں سمیت، بخوشی کود گئے لیکن اپنے ایمان پر سمجھوتہ نہ کیا۔ یہ ہے فقر غیور!

غیرت ہے طریقتِ حقیقی

غیرت سے ہے فقر کی تہائی

اصل فقر اور طریقتِ غیرت پر مبنی ہوتی ہے، نہ کہ مسکینی و ناامیدی پر۔ فقیر سے زیادہ غیرتمند وجود کائنات میں کوئی نہیں ہوتا۔ فقیر وہ نہیں ہوتا کہ جس کے پاس طاقت اور اختیار نہ ہو اور وہ زمین پر بیٹھا بس تسبیح و مناجات میں مگن ہر وقت ذلت اور مسکینی کی زندگی گزارے۔ بلکہ فقیر وہ ہوتا ہے کہ جس کی ظاہری غربت کے باوجود، بادشاہ وقت کو بھی اس کے جلال کی وجہ سے اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ اس کے آگے کوئی سفارش کر سکے یا کوئی تحفہ پیش کر سکے۔

ایک مرتبہ طاقتور عباسی خلیفہ، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے دربار میں حاضر ہوا اور اشرفیوں کی تھیلی آپ کی خدمت میں پیش کی۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جلال میں آگئے۔ آپ نے اس اشرفیوں کی تھیلی کو اٹھایا اور ہاتھوں سے نچوڑ دیا۔ اس میں سے خون کے قطرے ٹپکنے لگے۔ جلال میں خلیفہ کو فرماتے ہیں کہ کیا غریبوں کا خون چوس کر یہ دولت میرے لیے لائے ہو؟ خلیفہ یہ منظر دیکھ کر ہی دہشت سے بیہوش ہو گیا۔ یہ ہوتا ہے ایک فقیر کا فقر غیور اور جلال!

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی

نہیں ہے سبخر و طغرل سے کم شکوہ فقیر

طغرل اور سبخر بہت بڑے بادشاہ گزرے ہیں۔ اقبالؒ کے بقول جب کسی انسان کی خودی زندہ ہو جائے، تو پھر اس کا جلال دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ فقراء کا یہ جلال آپ کو پوری اسلامی تاریخ میں نظر آئیگا۔ امام مالکؒ مدینہ کے امام تھے۔ بادشاہ وقت اگرچہ پوری دنیا میں ظالم اور جابر حکمران کے طور پر مشہور تھا مگر اس کی جرأت نہیں ہوتی تھی کہ امام مالکؒ کے سامنے کسی کی سفارش بھی کر سکے۔

حضرت معین الدین چشتیؒ نے ظالم ہندو بادشاہ پر تھوی راج کے سامنے اسکو دھمکی دی کہ اسکو زندہ گرفتار کر کے مسلمان فوج کے حوالے کیا جائے گا۔ اندازہ کیجئے پر تھوی راج کی حیرانی اور دہشت کی کہ جب پھٹے پرانے کپڑوں میں بیٹھا ایک فقیر وقت کے طاقتور ترین بادشاہ کو اسکے انجام کی خبر دے رہا ہو۔ پر تھوی راج پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ وہ فقیر کو نقصان پہنچائے بغیر ہی واپس لوٹ گیا۔



حضرت نظام الدین اولیاء کو سلطان تغلق نے دھمکی دی کہ اگر اسکی واپسی تک وہ دہلی میں مقیم ہوئے تو سلطان، حضرت نظام الدین اولیاء اور ان کے تمام مریدوں کو قتل کروادے گا۔ مریدوں میں یہ خط پڑھ کر خوف اور سراسیمگی پھیل گئی، مگر حضرت نظام الدین نے اس خط کو کاٹ کر اس کے اوپر لکھ دیا ”ہنوز دلی دور است“، اور یہ خط تغلق کو واپس بھجوا دیا گیا۔ سلطان تغلق یہ پڑھ کر غیظ و غضب میں دیوانہ ہو گیا اور قسم کھائی کہ دہلی پہنچتے ہی حضرت نظام الدین اولیاء کا سر کاٹے گا۔ مگر جب وہ دہلی سے کچھ فاصلے پر اپنے محل میں مقیم تھا، تو محل کی چھت ناگہانی طور پر اس پر آگری اور وہ اپنے وزیروں سمیت ہلاک ہو گیا۔ پوری دنیا جان گئی کہ ایک فقیر کے جلال نے ظالم بادشاہ کو اس کے انجام سے دوچار کر دیا۔

اکبر بادشاہ نے حضرت مجدد الف ثانی پر ظلم کی انتہا کر دی تاکہ وہ اسکا دین الہی قبول کر لیں۔ اکبر کے دربار میں یہ بھی لازم تھا کہ دربار میں آنے والا ہر شخص بادشاہ کو سجدہ کیا کرے۔ حضرت مجدد الف ثانی نے سجدہ کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اکبر نے ان کو جھکانے کیلئے ایک دوسرا طریقہ آزما یا۔ اس نے ایک چھوٹا دروازہ بنوایا، تاکہ حضرت مجدد الف ثانی جب اس دروازے سے گزریں تو ان کو مجبوراً سر جھکانا پڑے۔ مگر مجدد الف ثانی نے اس دروازے میں پہلے اپنے پاؤں داخل کیے اور پھر سر۔ اپنی تمام تر قوت اور طاقت کے باوجود اکبر بادشاہ مجدد الف ثانی کے سامنے رسوا ہی ہوتا رہا اور اسی حالت میں ہلاک ہوا۔

ایک مرتبہ کچھ منافق، حضور ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ ہمیں دین کا علم سیکھنا ہے، لہذا اپنے کچھ معلم ہمارے ساتھ کر دیجیے۔ حضور ﷺ نے کچھ صحابیؓ ان لوگوں کے ساتھ روانہ فرمادیئے۔ ان منافقوں نے راستے میں دھوکہ دیا اور بہت سے صحابہ کرامؓ کو شہید کر دیا۔ مگر حضرت خنیبؓ کو زندہ گرفتار کر کے مشرکین مکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ مشرکین مکہ نے حضرت خنیبؓ کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے انہیں یہ کہا گیا کہ ایمان چھوڑ دو، ورنہ درختوں سے باندھ کر نیزوں سے چھیدا دیا جائے گا۔ اگر دوبارہ کافر ہو جاؤ گے، تو جان بخشی کر دی جائے گی۔ حضرت خنیبؓ نے موت کو آنکھوں کے سامنے دیکھنے کے باوجود نہ صرف ایمان چھوڑنے سے انکار کیا، بلکہ مرتے وقت ایسے جذباتی اشعار بھی کہے کہ جو آج بھی آنکھیں نم کر دیتے ہیں۔ ”اے اللہ! یہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ ایمان چھوڑ دو تو جان بچ جائیگی۔ واللہ! میرے لیے اب مرنا آسان ہے، مگر جہنم کی آگ میں جلنا آسان نہیں۔ یہ لوگ مجھے کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے ترک تعلق کر لو۔ اب جبکہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے حالت ایمان میں جان دینی ہے، تو مجھے اس بات کی پروا نہیں کہ میں کس کروٹ لٹا کر ذبح کیا جاتا ہوں۔ یا اللہ! رسول اللہ ﷺ نے جو ذمہ داری میرے ذمے لگائی تھی، وہ میں نے پوری کر دی۔ اب سیدی رسول اللہ ﷺ کو خبر کر دینا کہ ان لوگوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا!“

جب آپؐ کے جسم کو نیزے سے چھیدا جا رہا تھا تو ایک کافر نے آپؐ سے سوال کیا کہ کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ تمہاری جان بخشی ہو جائے



اور تم اپنے بستر پر آرام سے سو رہے ہو، اور تمہاری جگہ رسول اللہ ﷺ یہاں پر ہوں۔ اس پر بھی حضرت خبیبؓ نے جواب دیا: ”خدا کی قسم! میں تو یہ بھی نہیں چاہوں گا کہ حضور ﷺ کو ایک کانٹا بھی چبھے اور اس کے بدلے میری جان بخشی ہو۔“ یہ ہے فقر غیور!

جنگ احد کا واقعہ ہے کہ ایک انصاری صحابی حضرت سعد بن ربیعؓ لاپتہ ہو گئے۔ حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو ان کی تلاش کیلئے روانہ فرمایا۔ صحابہ کرامؓ نے دیکھا کہ وہ میدان جنگ میں اپنی آخری سانسیں لے رہے تھے۔ اس حالت میں بھی سعد بن ربیعؓ نے جب صحابہ کرامؓ کو دیکھا تو فرمایا: ”رسول اللہ ﷺ کو میرا سلام دینا اور کہنا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ﷺ کو جو پیغام پہنچانے کا فریضہ سونپا گیا تھا، آپ ﷺ نے اس کا حق پوری طرح ادا کر دیا ہے۔“ پھر انہوں نے مدینے کے انصار کو پیغام دیا کہ یاد رکھو اگر تم میں سے ایک فرد بھی زندہ ہو اور رسول اللہ ﷺ کو کوئی تکلیف پہنچی تو تم قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی بھی عذر پیش نہ کر سکو گے! یہ ہے فقر غیور!

ایک دفعہ میدان جنگ میں تین صحابیؓ زخمی پڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے پانی مانگا تو ایک شخص پانی کی مشک لیے ان کی جانب بڑھا۔ اتنے میں دوسری جانب سے آواز آئی: ”المعطش“ (پاس)، زخمی صحابیؓ نے خود پانی پینے کے بجائے، پانی پلانے والے شخص کو دوسری جانب جانے کا اشارہ کیا۔ وہ شخص ان دوسرے صحابیؓ کے پاس پہنچا تو اتنی دیر میں ایک اور صحابیؓ نے بھی پانی مانگ لیا۔ دوسرے صحابیؓ نے بھی اپنی پیاس پر اپنے بھائی کی پیاس کو ترجیح دی اور پانی پلانے والے شخص کو ادھر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ شخص اب ان تیسرے صحابیؓ کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہ تو شہید ہو چکے ہیں۔ وہ بھاگا بھاگا واپس دوسرے صحابیؓ کے پاس واپس آیا، مگر وہ بھی جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ اسکے بعد وہ پہلے صحابیؓ کی جانب لوٹا، مگر وہ بھی زخموں اور پیاس کی تاب نہ لا کر شہید ہو چکے تھے۔ تینوں صحابہؓ نے موت قبول کر لی، مگر ان کی غیرت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ اپنے زخمی بھائی سے پہلے پانی پی لیں۔ یہ ہے فقر غیور!

جنگ قادسیہ سے پہلے، ایران کے جرنیل نے مسلمانوں کے سفیر کو طلب کیا، تاکہ اُس قوم کو جان سکے کہ جو عرب کے ریکزاردوں سے اٹھی اور ایرانی سلطنت سے ٹکرا گئی۔ مسلمان فوج کے پاس وسائل کی کمی تھی، ایرانیوں کو یہ بھوکے ننگے ہی لگتے تھے، مگر غیرت کا یہ عالم تھا کہ مسلمان اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے۔ مسلمانوں کا سفیر پچھلے پرانے کپڑے پہنے، اپنے ضعیف و لاغر گھوڑے پر، جرنیل کے عالی شان خیمے میں پہنچا اور اپنے نیزے کی نوک سے قالین کو کاٹتے ہوئے، جرنیل کے روبرو جا کھڑا ہوا۔ ایرانی جرنیل نے مسلمانوں کو رسوا کرنے کی غرض سے، سفیر کیلئے کوئی کرسی نہ رکھوائی تھی، تاکہ سفیر کو کھڑے رہ کر ہی بات کرنی پڑے۔ مگر جب مسلمانوں کے سفیر نے یہ دیکھا کہ اس کے بیٹھنے کیلئے کوئی کرسی نہیں ہے تو وہ آگے بڑھا اور جرنیل کے ساتھ تخت پر ہی براجمان ہو گیا۔ تمام درباری اس ”گستاخی“ پر ششدر رہ گئے۔ ان کو وہاں سے زبردستی اٹھایا گیا کہ آپ یہاں نہیں بیٹھ سکتے۔ مسلمانوں کے سفیر نے کہا کہ میں اپنی مرضی سے یہاں نہیں آیا بلکہ آپ نے بلایا ہے۔ اگر آپ میرے لیے بیٹھنے کی جگہ نہیں بنا سکتے تو میں خود ہی بنا لیتا ہوں، میں تمہارے قالین پر نہیں، اللہ

کی زمین پر بیٹھوں گا۔ یہ کہہ کر اپنا خنجر نکالا، قالین کے ایک بڑے ٹکڑے کو کاٹ کر ایک طرف پھینک دیا اور پھر تنگی زمین پر بیٹھ کر بولے کہ اب بات کرو۔ اس فقیر کا جلال دیکھ کر ایرانی دربار پر دہشت طاری ہو گئی۔ یہ ہے فقر غیور!

شریعت پر چلنے کا مقصد ایک مسلمان میں یہ فقر غیور پیدا کرنا ہے۔ اقبالؒ کے نزدیک اگر یہ فقر غیور پیدا نہ ہو تو تمام عبادت بیکار ہے۔

یہ ذکرِ نیم شبی، یہ مراقبہ، یہ سرور

تری خودی کے نگہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

جب کسی قوم میں یہ فقر غیور پیدا ہو جائے تو پھر کائنات کی کوئی طاقت اس قوم کو شکست نہیں دے سکتی۔ یہی مسلمانوں کی طاقت اور عروج کا اصل راز ہے۔ مسلمانوں نے جب بھی دنیا میں عروج حاصل کیا تو اسکے پیچھے ان کی عسکری قوت، معاشی طاقت یا انتظامی صلاحیتوں کا دخل نہیں تھا۔ اگر کوئی طاقت تھی تو یہی دینی غیرت و حمیت اور عشق رسول ﷺ تھا کہ جسے اقبالؒ فقر غیور کہتے ہیں۔

فقر غیور کا تعلق فتوے سے نہیں تقوے سے ہے۔ علم سے نہیں، عشق سے ہے۔ حضرت خبیبؒ اس وقت یہ کر سکتے تھے کہ جھوٹ موٹ اسلام سے مکر جاتے اور بعد میں پھر اسلام لے آتے۔ دین میں اس بات کی اجازت ہے کہ اگر کوئی قتل کرنے لگے تو ایمان کو چھپایا جاسکتا ہے۔ مگر ان عظیم انسانوں نے ایمان کو نہیں چھپایا، اس سے نہیں مکرے، بلکہ گردنیں کٹوانے کو ترجیح دی۔ کیوں؟ اس لیے کہ جن لوگوں کو آنے والے نسلوں کیلئے مثال بننا ہوتا ہے، امت کی قیادت اور ان کی رہنمائی کرنی ہوتی ہے، وہ یہ سمجھوتے نہیں کیا کرتے، چاہے گردنیں ہی کیوں نہ کٹوانی پڑیں، سولی ہی کیوں نہ چڑھنا پڑے، کوڑے ہی کیوں نہ کھانے پڑیں، آگ میں ہی کیوں نہ ڈال دیا جائے۔

برتر از اندیشہء سود و زیاں ہے زندگی

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

یٹھوسلاطآنؒ کو بھی جب انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے کا مشورہ دیا گیا تو انہوں نے جواب دیا تھا: ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے“۔ اس مجاہد نے بھی میدان جنگ میں شہید ہونا قبول کر لیا، مگر کفار کے آگے ہتھیار نہ ڈالے۔

باطل دُوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے

شرکت میانہء حق و باطل نہ کر قبول!



ہماری امت کا المیہ کیا ہے؟ دنیا میں ایک ارب سے زائد مسلمان ہیں۔ اسرائیل اور فلسطین میں فقط تیس لاکھ یہودی بستے ہیں۔ اگر تمام دنیا کے مسلمان مل کر پھونک بھی ماریں تو وہ تیس لاکھ یہودیوں کو نیست و نابود کر دیں۔ لیکن جیسا کہ حضور ﷺ نے اپنی حدیث شریف میں فرمایا کہ جس کا مفہوم ہے کہ جب مسلمانوں پر دنیا کی محبت غالب آ جائیگی اور موت کا خوف طاری ہو جائیگا، تو دنیا کی باقی اقوام مسلمانوں پر یوں ٹوٹ پڑیں گی کہ جیسے بھوکے کھانے پر ٹوٹے ہیں۔ ہماری امت کا المیہ اب یہی دنیا کی محبت ہے۔ ہماری امت کے جوانوں کی خودی مرچکی ہے اور وہ فقر غیور ترک کر چکے ہیں۔ ہم میں عشق کی آگ بجھ چکی ہے۔

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے

مسلمان نہیں، راکھ کا ڈھیر ہے

آج وہ فقر غیور کے حامل مردانِ خود آگاہ و خدا مست ناپید ہیں اور جو باقی ہیں فقط مسکلوں، فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم راکھ کے ڈھیر! یہ عشق ہی ہے کہ جو اولادِ ابراہیم کو آتشِ نمرود میں کودنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم

عشق ہو جس کا جسور، فقر ہو جس کا غیور

ہم دنیا میں اس لیے خوار نہیں ہو رہے کہ ہم نمازیں نہیں پڑھتے، روزے نہیں رکھتے، حج نہیں کرتے۔ ہر سال حج کے موقع پر لاکھوں لوگ خانہ کعبہ میں موجود ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں مسجدیں بھی آباد ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان رسوا ہو رہے ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنی غیرت، فقر غیور اور خودی پر سمجھوتہ کر لیا ہے۔ اقبالؒ امتِ مسلمہ اور خاص طور پر عرب دنیا کی اس المناک صورتحال پر فرماتے ہیں:

خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب

بدنِ عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام

تمام مسلمان امت کے جسم میں جیسے خون باقی ہی نہیں رہا۔ بس بے جان گوشت کا لوٹھڑا ہیں، کیونکہ ان کی خودی، غیرت اور فقر غیور مر چکا ہے۔ ظالم حکمران چالیس چالیس سال سے کرسی سے چٹے ہوئے، عوام کا خون چوس رہے تھے۔ مگر قوم میں اتنی غیرت نہیں ہوتی کہ انہیں ہٹا کر ملک میں اللہ کا دین نافذ کر سکیں۔ آج صیہونیوں نے ایک مرتبہ پھر صلیبی جنگیں عراق اور شام پر مسلط کر دی ہیں، اور لاکھوں مسلمانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیا جا رہا ہے، مگر امتِ مسلمہ سوائے بے بسی سے تیکنے کے کچھ اور کرنے کے قابل نہیں ہے۔



دوسرا نام اسی دین کا ہے، ”فقر غیور“!

اسرائیل فلسطینیوں پر حملے کرتا ہے تو مصر بھی اپنی سرحد بند کر لیتا ہے تاکہ فلسطینیوں کو امداد نہ جاسکے۔ عرب حکمران اپنی غیرت، عزت، شجاعت، حمیت اور دلیری کو عرصہ ہوا فروخت کر چکے ہیں اور اب پوری امت کفار کے ہاتھوں رسوا ہو رہی ہے۔

بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ

اقبالؑ نے ایک جگہ فرمایا:

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو

کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

مسلمانوں کے دلوں میں اب عشق الہی اور عشق رسول ﷺ کی آگ بجھ چکی ہے۔ اسی لیے اقبالؑ نے دعا فرمائی:

اللہ کرے تجھ کو عطا فقر کی تلوار

قبضے میں یہ تلوار بھی آجائے تو مومن

یا خالدؓ جانباز ہے یا حیدرؓ کرار

فقر غیور ہی ہمارے بزرگوں کی وہ گمشدہ میراث ہے کہ اگر ہمارے ہاتھ آجائے تو ایک مرتبہ پھر یہ امت حضرت خالدؓ اور حیدرؓ کرارؓ کے وارث پیدا کرنے لگے گی۔ قوم میں جو بھی مجدد پیدا ہوگا، جو بھی امام برحق ہوگا، وہ سب سے پہلے اس قوم کو غیرت مند بنائے گا، اس میں شرم اور حیاء پیدا کرے گا، اس کی خودی بیدار کرے گا، انکو ایسا ”مردان آزاد“ بنائے گا کہ جو سرکٹو انا قبول کریں گے، لیکن سر جھکانا ان کو گوارہ نہیں ہوگا۔ جب تک کہ ایسی قوم نہ ہو، دنیا کی کوئی طاقت ان کو عزت نہیں دلواسکتی۔ عزت روپے پیسے دولت اور عسکری قوت سے نہیں ملتی، فقر غیور سے ملتی ہے۔

اے طائر لاہوتی! اس رزق سے موت اچھی

جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

## سوالات و جوابات

سوال: پہلے زمانے کے مسلمانوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں ہمارے لیے سبق بھی ہے۔ مگر پھر بھی آج کل کے مسلمان قرآن و سنت اور عزت و غیرت سے دور کیوں ہیں؟

جواب: مسلمان اگر اپنی تاریخ سے دور ہوئے ہیں اور غلامی کی روش اختیار کی ہے، تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ ترک کر دیا ہے۔ اب تک ہم نے جتنے بھی واقعات بتائے ہیں، ان میں سب سے اہم عنصر ”عشق رسول ﷺ“ ہے۔ یہ ترپ، یہ خواہش کہ مجھے بیشک ختم کر دیا جائے، مگر رسول اللہ ﷺ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی آواز بلند نہ ہونے دینا، اپنی جان، مال، عزت و آبرو آپ ﷺ پر قربان کرنے کیلئے ہر دم تیار رہنا، کوئی ایسا عمل نہ کرنا کہ آخرت میں اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے، یہ سب عشق رسول ﷺ کی ادائیں ہیں۔ ہم سب مسلمان گھرانوں میں تو ضرور پیدا ہوئے ہیں، مگر ہم نے اب تک بہ رضا و رغبت اسلام قبول نہیں کیا۔

بیعت عقبہ کے موقع پر مدینہ سے کچھ لوگوں کا وفد حضور ﷺ کے پاس مکہ آیا تاکہ آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر سکے۔ یہ ہجرت سے قبل کا واقعہ ہے۔ وہ لوگ بیعت کرنے لگے تو حضرت عباسؓ نے انہیں روکا اور کہا کہ بیعت کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔ حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو ساری دنیا سے جنگ مول لینا پڑے گی اور اپنی جان و مال کی قربانی دینی پڑے گی۔ مدینہ والے تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہو گئے پھر سوال کیا: ”اس کے بدلے کیا ملے گا؟“ حضور ﷺ نے جواباً فرمایا: ”جنت“۔ مدینہ والوں نے مزید کہا کہ جنت کا وعدہ اپنی جگہ سہی، مگر ہم سے ایک اور وعدہ کیجیے کہ آپ ﷺ کبھی بھی ہمیں چھوڑ کر نہیں جائیں گے! یہ عشق رسول ﷺ ہے! اگر مدینہ والے صرف زاہد ہوتے تو جنت کی خوشخبری پر راضی ہو جاتے، مگر وہ زاہد نہیں، عاشق تھے۔ جنت پر راضی نہ ہوئے، جنت والے کو طلب کر لیا۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ ”یثرب“ ”مدینۃ الرسول ﷺ“ کہلایا۔ اگر رسول اللہ ﷺ مکہ میں ہی رہتے تو آج کون مدینہ کا رخ کرتا؟ مدینہ والوں نے رسول ﷺ کو طلب کیا اور پھر رسول اللہ ﷺ نے بھی اہل مدینہ سے کیا ہوا وعدہ نبھایا اور پھر ساری زندگی مدینہ چھوڑ کر نہیں گئے۔ فقر غیور کے معاملات علم سے نہیں، عشق سے طے ہوتے ہیں!

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن  
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن

دوسرا نام اسی دین کا ہے، ”فقر غیور“!

بندہ تحمین و ظن! کرم کتابی نہ بن  
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب!  
عشق کی گرمی سے ہے معرکہ کائنات  
علم مقام صفات، عشق تماشاۓ ذات  
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات  
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب!  
عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دیں  
عشق کے ادنیٰ غلام صاحب تاج و نگین  
عشق مکان و ملیں، عشق زمان و زمیں  
عشق سراپا یقین، اور یقین فتح باب!  
شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام  
شورش طوفاں حلال، لذت ساحل حرام  
عشق پہ بجلی حلال، عشق پہ حاصل حرام  
علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے ام الکتاب!









## خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں

علامہ اقبالؒ کا تصور خودی انسان کو عشق حقیقی کی دعوت دیتا ہے۔ یہ عشق حقیقی جب فقر کی سان پر چڑھتا ہے، تو پھر بندہ مومن بنتا ہے کہ جس کی اذان سے لرزتا ہے شبستان وجود، کہ جو وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل بھی دیتا ہے اور جس سے خدا خود پوچھتا ہے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی ”خودی“ اس کی ”حقیقت انسانیہ“ ہے۔ خودی اس کی وہ طاقت ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان کائنات میں تبدیلیاں لاتا ہے۔ خودی سے متعلق ایک اور مقام پر اقبالؒ فرماتے ہیں کہ:

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی

یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

شہداء کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ جو اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہنے کا حکم ہے، مگر یہاں اقبالؒ اس راز سے بھی پردہ اٹھا رہے ہیں کہ اگر کوئی بندہ مومن اولیاء اللہ کا مقام حاصل کر لے، اپنی خودی کو زندہ کر لے تو موت صرف اس کے جسم کو چھوٹی ہے، اس کے وجود کے مرکز سے دور رہتی ہے۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا

ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے!

بابا بلھے شاہؒ نے بھی اسی تصور کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ:

بلھے شاہ اسماں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہو

یعنی قبر میں تو کوئی اور جائے گا، ہم تو کبھی نہیں مریں گے۔

حضرت باقی باللہؒ سے ان کے ایک مرید نے سوال کیا کہ ”فنا فی اللہ“ اور ”بقا باللہ“ میں کیا فرق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ جو میری نماز جنازہ پڑھانے آئے، اس سے پوچھ لینا۔ حضرت باقی باللہؒ کے انتقال کے وقت، لوگ صفیں بنا کر نماز جنازہ پڑھانے والے کا انتظار کرتے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک شخص برآمد ہوا کہ جس نے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا تھا۔ اس شخص نے آکر نماز جنازہ پڑھائی اور ایک طرف کو جانے لگا۔ مریدوں نے روک کر تعارف کروانے کا کہا، تو اس شخص نے اپنا نقاب ہٹا دیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ خود حضرت باقی باللہؒ تھے کہ جو اپنی نماز جنازہ خود پڑھانے آئے تھے۔ پھر اس وجود نے جنازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ”فنا فی اللہ!“ اور پھر اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ”بقا باللہ!“۔

خودی کی تلوار کو تیز کرنا پڑتا ہے۔ چھری بے شک چھری ہے، لیکن جب تک اس کی دھاڑ نہیں ہے، اس وقت تک وہ کاٹنے کے قابل نہیں ہوتی۔ انسان کی خودی، اس کے اندر موجود عشق الہی اور عشق رسول ﷺ کی آگ، اس وقت تک نہیں بھڑکتی کہ جب تک کہ اسے فقر کی بھٹی میں نہ پکایا جائے۔ اس سفر کیلئے مرشد سے تربیت ضروری ہے۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف

کہ مشقتِ خاک میں پیدا ہو آتشِ ہمہ سوز

یہ فیضانِ نظر تھا یا کہ کتب کی کرامت تھی

سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آدابِ فرزندِ

اپنی خودداری، عزت نفس، غیرت اور حیا کی حفاظت کیے بغیر نہ تو خودی کی حفاظت ممکن ہے اور نہ ہی فقر غیور کا حصول۔ انسان جہاں بھی اپنی غیرت اور عزت نفس پر سمجھوتہ کرتا ہے، اپنی خودی کے جوہر کو کھودیتا ہے۔

مرا طریق امیری نہیں، فقیری ہے  
خودی نہ بچ، غربی میں نام پیدا کر!

تاریخ اسلام اور اقبالؒ کے کلام سے ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب تک انسان عشق رسول ﷺ میں جان دینے پر آمادہ نہ ہو، جب تک اپنے نظریے اور عقیدے کیلئے سب کچھ قربان کرنے پر تیار نہ ہو، تب تک خودی اور فقیری کی حفاظت مشکل ہے۔ ہمیں زکوٰۃ دینے کا طریقہ بتایا گیا ہے، لینے کا نہیں۔ اسلام شیروں اور لیروں کا دین ہے، بزدلوں اور بے غیرتوں کا نہیں۔ اس دین کی روح جلالی ہے اور اس کا اظہار جمالی۔



## سوالات و جوابات

سوال: آپ تصوف کو کس طرح بیان کریں گے؟

جواب: جتنے بھی نام آپ آجکل سنتے ہیں، چاہے وہ فقہ کے نام ہوں یا طریقت کے سلاسل کے، خواہ تصوف، عشق یا خودی کی باتیں ہوں، یہ ساری اصطلاحیں ہیں کہ جو دین کے مختلف پہلوؤں کو سمجھانے کیلئے ہیں۔

خلفائے راشدین کے دور میں نہ تو کوئی جنبلی تھا، نہ کوئی مالکی، اور نہ ہی شافعی، نقشبندی، قادری، چشتی اور سہروردی۔ تصوف کی اصطلاح بھی اس وقت نہیں تھی۔

ایک انگریز مسلمان نے تصوف کی بہت خوبصورت تشریح کی ہے۔ کہتے ہیں کہ شروع میں تصوف حقیقت تھی، مگر اس کا نام نہیں تھا۔ آجکل اس کا صرف نام ہے، مگر حقیقت نظر نہیں آتی۔ یعنی تصوف کا صرف نام ہی رہ گیا ہے اور اس کی حقیقت گم ہو گئی ہے۔

انسان کی روحانی اساس کی طرف لوٹنے اور قلب کا تزکیہ کرنے کے طریقہء کار کو تصوف کا نام دیا گیا ہے۔ لیکن یہ کسی بھی صورت میں خافقاہی تصور نہیں ہے اور نہ ہی رہبانیت۔

مسلمانوں کا زوال تب ہوتا ہے کہ جب ان میں علمائے سو کی تعداد بڑھ جاتی ہے۔ یعنی ایسے علماء کہ جو بادشاہ وقت کے ظلم کا ساتھ دیتے

ہیں اور دین میں فتنوں کا باعث بنتے ہیں۔ علمائے حق کی تعداد ہر دور میں کم ہی رہی ہے۔ اسی طرح طریقت اور روحانیت کا سلسلہ خود صحابہ کرامؓ سے شروع ہوا۔ نقشبندی سلسلہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے شروع ہوا۔ قادری، چشتی اور سہروردی سلسلے کا آغاز سیدنا علیؓ سے ہوتا ہے اور یہ سارے سلاسل اوپر جا کر حضور ﷺ سے جاملتے ہیں۔ انہی روحانی سلسلوں کا نام بعد میں تصوف پڑ گیا۔

یہ شریعت کے خلاف نہیں ہے۔ جو تصوف شریعت سے باہر ہو، یا مایوسی اور قنوطیت کا پیغام دے، وہ اسلامی تصوف ہی نہیں ہے۔ اقبالؒ اس ضمن میں فرماتے ہیں:

یہ حکمت ملکوتی، یہ علم لاہوتی

حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ ذکر نیم شعی، یہ مراقبہ، یہ سرور

تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید

جس کا یہ تصوف ہو، وہ اسلام کر ایجاد

یعنی یہ بڑی بڑی حکمت کی باتیں اچھی تو بہت ہیں، لیکن اگر یہ مسلمانوں کے درد کا علاج نہیں کر سکتیں، تو کوئی فائدہ نہیں۔ ایک آدمی رات کو اٹھ کر ذکر اور مراقبہ کرتا ہے، مگر غیرت مند انسان نہیں بنتا اور اپنی خودی کی حفاظت نہیں کرتا، تو ایسے ذکر اذکار اور مراقبہ بے فائدہ ہیں۔ اسلام مایوسی اور ناامیدی کا تصوف نہیں دیتا۔ اس میں توفیق کا سفینہ ہر وقت طوفانوں سے ٹکراتا رہتا ہے:

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار

فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

مولانا ابوالحسن علی ندوی ہندوستان کے ایک بہت بڑے عالم گزرے ہیں۔ انہوں نے ایک بہت خوبصورت کتاب لکھی ہے ”تصوف و سلوک یا تزکیہ و احسان“۔ انہوں نے اس کتاب میں اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قرآن میں جس چیز کو ”تزکیہ و احسان“ کہا گیا ہے، بعد کے آنے والے ادوار میں صرف اصطلاح کو بدل کر ”تصوف و سلوک“ کا نام دے دیا گیا۔ حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ میں ایک اہم بات یہ تھی کہ آپ ﷺ تزکیہ فرماتے ہیں اور تزکیہ فرمانے کے طریقے کو ہی بعد میں تصوف کا نام دیا گیا ہے۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں



اگر تصوف شریعت کے دائرے میں ہے اور اس کے اندر ہندوانہ اور عجمی رسم و رواج شامل نہیں ہوئے، تو پھر وہ عین اسلام کے مطابق ہے، عین دین ہے۔ جتنے بھی طریقت کے لوگ ہیں، مثلاً نقشبندی، قادری، چشتی، سہروردی، یہ سب عشق رسول ﷺ کی تعلیم دینے والے سلاسل ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو انسان کے تزکیہ قلوب کی بات کرتے ہیں اور انسان کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت سکھاتے ہیں۔ یہ فرقے نہیں ہیں، مکاتیب فکر ہیں، تربیت کے سلاسل ہیں۔

سوال: اقبالؒ جس بندہ مومن اور خودی کی بات کرتے ہیں، وہ اصل میں کیا ہے؟ اور آجکل کے دور میں بندہ مومن ہمیں کہاں مل سکتا ہے؟

جواب: بندہ مومن تو ہر دور میں موجود ہوتے ہیں۔ یہ تو نہیں ہوتا کہ اللہ کے بندے اس دنیا سے ختم ہو جائیں۔ اقبالؒ جب کہتے ہیں کہ:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو

یہ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

یعنی اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو وہ یہ دیکھ سکتی ہے کہ اللہ کے یہ بندے ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ پچھٹے پرانے کپڑے پہن کر بھی بیٹھے ہونگے، مگر انکے پاس موسیٰؑ والے معجزات ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایسے فقراء کی حقیقت جاننا چاہتے ہیں تو اشفاق احمد، ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب کی کتابوں کو پڑھیں۔ کتنے بابوں، اولیاء اور فقراء کا ذکر کیا ہے انہوں نے، کہ جو اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں، اگرچہ ان کے روپ مختلف ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روحانی دنیا کا نظام چلانے پر مامور ہوتے ہیں۔

مگر آجکل جو بڑے بڑے پیر حکومت اور سیاست میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے اکثریت صرف فراڈ ہے۔ نہ تو ان میں روحانیت ہے، نہ ہی انکی نگاہ بلند ہے، نہ سخن دلنواز ہے اور نہ ہی جاں پر سوز۔ اقبالؒ ایسے پیروں پر سخت طنز کرتے ہیں:

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

یعنی جن خانقاہوں میں پہلے عقاب رہا کرتے تھے، اب وہاں کوئے بستے ہیں۔ یہ صاحب میراث پدر نہیں ہیں۔ یعنی ان کے باپ دادا



کی میراث ان کے پاس نہیں ہے۔ ان کے باپ دادا ولی رہے ہونگے، مگر یہ سب تو اسلاف کے نام پر کمار ہے ہیں۔ اسلاف کے کفن بیچ کر کھارہے ہیں۔

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ، وہ خرمن تم ہو  
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو  
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے  
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

اقبالؒ نے بہت سخت الفاظ استعمال کیے ہیں، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زمین سے فقراء، اولیاء اور اللہ کے بندے ختم ہو گئے ہیں۔ ان کو تلاش کرنا پڑے گا۔ مسجد نبوی سے لیکر دنیا کے کونے کونے تک اللہ کے بندے اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ ان سے نگاہ لیٹی ہوگی، فیض لینا ہوگا۔

اللہ کے اولیاء پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ مختلف روپ میں ہونگے۔ کیا پیڑ تہارے والدین اولیاء اللہ میں سے ہوں۔ ان کی عزت کرو۔ کیا پیڑ کہیں کوئی انجینئر یا ڈاکٹر کی شکل میں ولی ہو۔ کہیں وہ ریلوے کا قلی ہوگا، کہیں سرکاری افسر اور کہیں فوجی۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اولیاء اللہ کس روپ میں ڈیوٹی کر رہے ہیں۔ لوگوں کے ظاہر کو دیکھ کر ان کے باطن پر فتوے نہ لگانا۔

ممتاز مفتی الکھنجر اور اپنی دیگر کتابوں میں واضح لکھتے ہیں کہ قدرت اللہ شہاب بھی ڈیوٹی پر مامور ایک اللہ کے ولی تھے، اور انکو ایسے اولیاء کی طرف سے پاکستان کے بارے میں ہدایت آتی تھیں کہ جو کبھی اونٹ گاڑی والے نظر آتے تھے، کبھی جوتیاں سیدھی کرنے والے اور کبھی ایک مجذوب قلندر۔

ہم نے کبھی شعوری طور پر ایسے اولیاء اللہ کو تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مسجد نبوی میں ہمیں ایک بہت خوبصورت تجربہ ہوا۔ مسجد نبوی ماشاء اللہ اولیاء و فقراء کا مرکز ہے۔ پوری دنیا کے خوبصورت ترین اولیاء و فقراء مسجد نبوی میں بیٹھتے ہیں اور جن کو یہ راز معلوم ہے، وہ ان کو تلاش بھی کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم باب ابو بکر صدیقؓ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ ملک شام کی ایک جماعت آئی (شام کو تو ماشاء اللہ اولیاء کی سرزمین کہتے ہیں)، اور ان نوجوانوں نے ہم سے پوچھا کہ آپ مسجد نبوی کے اولیاء کو جانتے ہیں؟ ہمارا کسی ولی سے تعارف کروائیں۔ ہمیں دعا کروانی ہے۔

حضور ﷺ کی ایک حدیث شریف بھی ہے کہ جس کو حضرت علیؓ نے روایت کیا ہے اور جس کا مفہوم ہے کہ ملک شام میں ہر وقت چالیس ابدال ڈیوٹی پر موجود رہتے ہیں اور جب ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جاتا ہے تو اللہ اسکی جگہ کسی دوسرے ولی کو متعین کر دیتا ہے۔ انہی ابدال کے صدقے اللہ بارش برساتا ہے، لوگوں کو رزق دیا جاتا ہے اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کی جاتی ہے!

تو ماشاء اللہ یہ جو تجسس اور طلب ہے، بے حد ضروری ہے۔ آپ مسجد نبوی صرف عبادت کے لیے ہی نہ جائیں، بلکہ وہاں جا کر اللہ کے بندوں، اولیاء و فقراء کی تلاش بھی کریں۔ جو وہاں موجود ہیں، ان کی خدمت کریں۔ ان سے دعائیں لیں۔ ان کی دعائیں آپ کو فائدہ دیں گی۔ تزکیہ کتابیں پڑھ کر نہیں ہوتا، بلکہ اللہ کے کسی ولی کی دعا چاہیے ہوتی ہے، اور پھر اس کے بعد انسان کا وجود ہی تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے، کہ نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔

سوال: سر! آج کے دور میں ”مرشد“ کس طرح تلاش کیا جاسکتا ہے؟

جواب: حقیقی اور اصلی معنوں میں تو ”مرشد“ صرف اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ باقی جتنے بھی مرشد ہوتے ہیں، وہ بھی آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کی طرف ہی لے کر جاتے ہیں۔ کوئی مرشد اپنی طرف نہیں بلاتا۔ جو اپنی طرف بلائے، وہ مرشد ہو ہی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں مرشد کے حوالے سے، واضح قاعدہ بیان فرماتا ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ جس کو اللہ ہدایت دے، وہی ہدایت پاتا ہے اور جس کو اللہ گمراہ کر دے، پھر تم نہیں پاؤ گے کہ کوئی ولی اس کا مرشد بنے! اس آیت سے اچھی طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ جب اللہ کسی کو ہدایت دینا چاہتا ہے، تو اسے کسی مرشد کے پاس بھیج دیتا ہے اور جب اللہ کسی کو گمراہ کرتا ہے تو پھر کوئی ولی اس کا مرشد بننے پر راضی نہیں ہوتا۔

سب سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ حضور ﷺ ہمارے نبی تو ہیں، مگر ہمیں شعوری طور پر بھی حضور ﷺ کو اپنا مرشد تسلیم کرنا چاہیے۔ ہمارے بزرگوں نے ہمیں یہی سکھایا ہے، اور یہی رزق ہم آپ کے ساتھ بانٹیں گے۔ ہمیں ہمارے بزرگوں نے حکم دیا کہ شعوری طور پر حضور ﷺ کو اپنا مرشد تسلیم کرو اور روضہ پاک ﷺ پر جا کر یہ درخواست پیش کرو کہ سیدی ﷺ آ پکو قبول کر لیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے آگے صحابہ کرام بھی درخواستیں دیا کرتے تھے اور چودہ سو سال سے امت مسلمہ بھی یہی کرتی آئی ہے کہ آپ ﷺ پر درود پاک بھیجا جا رہا ہے، سلام پیش کیا جا رہا ہے اور درخواستیں بھی پیش کی جا رہی ہیں۔ حضور ﷺ کی خدمت میں ختے بھیجے۔ حضور ﷺ پر کثرت سے درود شریف پڑھیں۔ ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کبھی آپ کو خالی ہاتھ نہیں لوٹائے گا۔

اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے کہ وہ تین طرح سے لوگوں سے بات کرتا ہے۔ ایک طریقہ وحی کے ذریعے ہے۔ وحی کا مطلب "Inspiration" یعنی الہام ہے۔ قرآن میں لکھا ہے کہ اللہ شہد کی مکھی پر بھی وحی کرتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ آپ کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتا ہے تو آپ کے دل میں یہ بات آ جاتی ہے کہ یہ اچھی بات ہے یا بری۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے الہام کر دیا انسان پر، اس کا تقویٰ بھی اور اس کے گناہ بھی۔ یہ الہام بتاتا ہے۔ اللہ کے ہدایت دینے اور رہنمائی کرنے کا ایک طریقہ یہ وحی کا طریقہ ہے کہ جس طرح اللہ







نے حضرت ابراہیمؑ کی رہنمائی کی۔ پہلے حضرت ابراہیمؑ نے چاند کو دیکھا، تاروں کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا خدا ہے۔ پھر سورج کو دیکھا تو کہا کہ یہ میرا خدا ہے، لیکن بعد میں خود بخود اللہ تعالیٰ نے اندر سے ان کی رہنمائی کی۔ باہر سے تو کسی آدمی نے حضرت ابراہیمؑ کی رہنمائی نہیں کی۔ یہ Inspiration یا الہام ہر انسان کو ہو سکتا ہے۔

دوسرا طریقہ ہے ”وراء الحجاب“، یعنی پردے کے پیچھے سے۔ مطلب یہ کہ اشارے آئیں گے۔ آپ کو اللہ کی نشانیاں نظر آئیں گی۔ اللہ کہتا ہے کہ جب وہ اپنی رحمت بھیجنا چاہتا ہے تو پہلے نشانیاں بھیجتا ہے۔ جیسے بارش سے پہلے بادل آتے ہیں۔ آپ کے کام آسان ہونے لگیں گے، آپ کو راستہ مل جائے گا۔ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی اور اشفاق صاحب کی کتابیں پڑھیں، وہ بتائیں گے کہ کس طرح حالات بنتے چلے گئے اور اللہ تعالیٰ ان کی رہنمائی کرتا رہا۔ ہر انسان کے ساتھ زندگی میں ایسے معاملات ہوتے ہیں کہ اس کو محسوس ہو جاتا ہے کہ کہاں اللہ تعالیٰ رکاوٹ ڈالنا چاہ رہا ہے اور کہاں راستے کھول رہا ہے۔ انسان کو اللہ کے اشارے سمجھنا ہوتے ہیں۔

ممتاز مفتی تو یہ تک لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک فقیر سے ملوانا تھا۔ وہ اپنے خیال میں ٹرین میں بیٹھے اور لاہور کے اسٹیشن پر اتر گئے۔ اور جب اترے تو اس کے بعد سارا منظر ہی تبدیل ہو گیا۔ وہ کالا شاہ کا کو میں کھڑے تھے۔ حیران ہوئے کہ یہ کیا ہوا؟ مجھے لاہور کا اسٹیشن دکھایا گیا اور میں لاہور کے اسٹیشن پر ہی اتر تھا۔ ممتاز مفتی خدا نخواستہ پاگل نہیں تھے جو یہ باتیں لکھ رہے تھے۔ جب پتہ لگا کہ یہ کالا شاہ کا کو ہے تو رات کے دس بجے ویرانے میں ڈر لگنے لگا کہ میں کہاں اتر گیا ہوں؟ پھر ایک اسٹیشن ماسٹر نے آکر کہا کہ چل تجھے ایک بابا بلا رہا ہے۔ ممتاز مفتی اسکی رہنمائی میں چلتے گئے تو دیکھا کہ ایک کوٹھری میں ایک بابا بیٹھا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ بڑی مشکل سے ٹرین روک کر تجھے بلایا ہے میں نے..... یہ کیا راز تھے؟ یہ کون سی دنیا ہے؟ تو اللہ پر دے کے پیچھے سے رہنمائی کرتا ہے۔

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ کی طرف کوئی اللہ کا بندہ آجائے، کہ جس کی زبان سے آپ کو پیغام مل جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ذریعے بھی اور پھر ان کے بعد آنے والے فقراء اور اولیاء کے ذریعے بھی وہ پیغام آپ تک پہنچ جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ نے ایک مرتبہ بارش کے موقع پر بچوں سے کہا کہ پھسلنا نہیں، تو ایک بچے نے مڑ کر جواب دیا کہ امام آپ نہ پھسل جائیے گا، اگر آپ پھسل گئے تو ساری امت پھسل جائے گی! امام ابو حنیفہؒ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کہنے لگے کہ یہ بچے کی آواز نہیں تھی، یہ غیب کی آواز تھی، مجھے پیغام دیا گیا ہے!

تو یہ تین طریقے ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ آپ سے باتیں کرے گا۔ رب کے طالب بنیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ادب کریں۔ یہ خواہش اپنے اندر پیدا کریں کہ مجھے عشق رسول ﷺ سے اپنی خودی کو بیدار کر کے اس کو فکری سان پر چڑھانا ہے۔ مجھے فقر کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ اگر آپ کی طلب سچی ہے تو یقیناً کچھ نہ کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے آپ کی رہنمائی نہ ہو



یا کوئی اللہ کا ولی آپ کا مرشد نہ بنے۔

فقیر دینے والا، صدقہ کرنے والا ہوتا ہے۔ بڑے دل والا اور معاف کرنے والا ہوتا ہے۔ اگر دنیا اسے دکھ دے، تو وہ طاقت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دیتا ہے۔ یہ تصور آجکل کی دنیا میں تو ممکن ہی نظر نہیں آتا کہ روپیہ پیسہ، طاقت، اختیار کے باوجود بھی کوئی انسان اپنے دشمن سے کہے کہ میں نے تجھے اللہ کیلئے معاف کیا۔ فقر کا آغاز ہی اس منزل سے ہوتا ہے کہ جب آپ اپنی خودی کی حفاظت کرنے والے بن جاتے ہیں۔ آپ بھوکا مرنا پسند کرتے ہیں، مگر جھولی پھیلا نا نہیں۔ کسی کا تحفہ قبول نہیں کرتے اگر یہ احساس ہو جائے کہ اس نے ترس کھا کر تحفہ دیا ہے۔

اقبال کے ہاں غربت کا عجب عالم تھا۔ کئی بار کھانے کے پیسے بھی نہ ہوتے۔ اقبال کے عقیدت مند دنیا بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک نواب صاحب کو یہ اندازہ ہوا کہ اقبال کی حالت بڑی خستہ ہے، تو انہوں نے اس زمانے میں کئی ہزار کا تحفہ اقبال کی خدمت میں بھجوایا۔ اقبال کو جب یہ پتہ چلا کہ انہوں نے ترس کھا کر یہ تحفہ بھیجا ہے، تو اقبال کی غیرت اسے قبول نہ کر سکی اور وہ تحفہ واپس بھجوادیا، اور پھر اس پر باقاعدہ ایک نظم بھی لکھی:

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول

جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات!

آج ہمارے ہاں پوری قوم کو بھیک منگا بنا دیا گیا ہے۔ صدر سے لیکر عام سیلاب زدہ شخص تک، ہر کوئی بھیک مانگنے پر لگا ہوا ہے۔ یہ قوم اس قدر مقروض ہو چکی ہے کہ ملکی آمدنی کا ایک بڑا حصہ صرف سود اور قرض کی ادائیگی میں ہی صرف ہو جاتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر قومی حمیت اور غیرت کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ حالانکہ ہمارا دین تقسیم کرنے کا حکم دیتا ہے، مانگنا نہیں سکھاتا۔

اللہ بھی اسی قوم پر اپنا کرم کرنا پسند کرتا ہے کہ جو غیرت مند، دلیر اور شجاع ہوتے ہیں۔ اللہ بے غیرت اور بے حیا قوم پر اپنا کرم نہیں کرتا۔ اپنے کردار کو غیرت مند رکھیں۔ پھر دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ کیسے کرم کرتا ہے۔ کروڑوں روپے کی رشوت آپکے سامنے رکھی ہو، مگر آپ جوتے کی ٹھوکر پر اس کو رد کر دیں۔ حرام صرف سو یا شراب ہی نہیں ہے۔ آٹا، چینی، دال چاول بھی حرام ہے، اگر حرام کمائی سے خریدا گیا ہو۔

دینے میں ایک ہوٹل کے منیجر نے ہم سے یہ بات کہی کہ پاکستان سے کچھ افراد عمرہ کرنے آئے تھے۔ ان میں کچھ FIA کے افسران بھی تھے اور چند پولیس والے بھی۔ ان میں سے ایک نے ہوٹل کے منیجر کو بتایا کہ ہماری اوپر کی آمدنی اس سال بہت اچھی ہو گئی، تو ہم

نے سوچا کہ عمرہ ہی کر لیں، (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔

جب امت میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ رزق بے شک حرام ہو، کوئی فرق نہیں پڑتا، ہم نیکیاں کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ دے دیں گے، تو سمجھ لیں کہ سخت عذاب آنے والا ہے۔

حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک شخص لمبا سفر کر کے آتا ہے، عمرہ اور حج کرنے کیلئے۔ وہ کعبہ کے پردوں سے لپٹ لپٹ کر روبرو ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول نہیں کرتا کیونکہ اس کا وجود حرام میں پلا ہوتا ہے۔ فقر غیور کی پہلی شرط ہی رزق حلال ہے۔ اللہ کے اولیاء اور فقراء کا یہ حال ہے کہ کسی کے ہاں کھاتے نہیں، اگر یہ پتہ ہو کہ رزق حرام یا مشکوک ہے۔

ہمارے ہاں آجکل کسی کو بھی پروا نہیں ہے کہ کس کا رزق کہاں سے آتا ہے؟ حرام کا پیسہ یا سود اور رشوت کا۔ بس جس کے پاس جہاں سے پیسہ آتا ہے، کھانے کو تیار ہے۔ اللہ کے بندے بھوکے مر جایا کرتے ہیں، مگر حرام نہیں کھاتے۔ امام مالکؒ تین تین دن فاقہ کرتے تھے، لیکن کسی کا تحفہ بھی قبول نہیں کرتے، اگر شک ہوتا کہ کہیں اس کا رزق حرام نہ ہو۔

ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ کی والدہ نے ان کو اپنا دودھ پلانا بند کر دیا۔ کیونکہ علامہ اقبالؒ کے والد محترم جن صاحب کے ہاں نوکری کرتے تھے، وہ انگریزوں کے ہاں ملازم تھے۔ تو علامہ اقبالؒ کی والدہ کو شک تھا کہ شاید اقبالؒ کے والد کی ملازمت حرام ہے۔ لہذا انہوں نے اقبالؒ کو اپنا دودھ ہی پلانا بند کر دیا اور بکری رکھ لی۔ وہ بکری کا دودھ اقبالؒ کو پلاتی تھیں۔ جب اقبالؒ کے والد نے ہاتھ جوڑے کہ میں صرف کپڑے سینے کا کام کرتا ہوں، میرا رزق حلال ہے اور مجھے صرف کام کی مزدوری ملتی ہے، تو تب کہیں جا کر ان کی والدہ نے اقبالؒ کو اپنا دودھ پلانا شروع کیا۔

کم از کم اپنی اور اپنے دوستوں اور اپنے محبت کرنے والوں کی حد تک، اپنے رزق کی حفاظت کریں۔ حلال رزق کمائیں، حرام رزق آپ کے اندر نہ جائے۔ وہ حکایت یاد کریں کہ جو بچپن میں آپ نے سنی ہوگی۔ ایک بادشاہ نے سوچا کہ اپنے محل کی تعمیر کے لیے ایک درخت کٹوا دیتا ہوں۔ اس درخت پر چڑیوں کا گھونسلہ تھا۔ چڑیا اور چڑا پریشان بیٹھے تھے کہ ہمارا درخت کٹ جائے گا، تو ہم کہاں گھر بنائیں گے۔ چڑے نے کہا کہ فکر نہ کرو۔ اگر بادشاہ نے میرا گھر تباہ کیا تو میں اس کی سلطنت تباہ کر دوں گا۔ چڑیا نے پوچھا کہ تم اس بادشاہ کی سلطنت کیسے تباہ کرو گے؟ چڑے نے کہا کہ میں ایسے شخص کو جانتا ہوں کہ جس کا رزق حرام ہے۔ میں اس کے رزق میں سے چند دانے اٹھا کر لاؤں گا اور بادشاہ کے رزق میں ملا دوں گا۔ بادشاہ حرام رزق کھائے گا، تو اس کے مال سے برکت ختم ہو جائے گی، اس پر لعنت پڑ جائے گی، اس پر سے اللہ کی رحمت اٹھ جائے گی اور پھر اس کی سلطنت بھی ختم ہو جائے گی۔

ہمارے بزرگوں کا حال یہ تھا کہ بادشاہ وقت ان کو اپنے دربار میں بلایا کرتے تھے، مہمان ٹھہراتے تھے، عزت کرتے تھے، مگر وہ بزرگ

تین تین دن بھوکے رہتے، بادشاہ کے محل کا کھانا نہیں کھاتے تھے کہ شاید اس نے لوگوں پر ظلم کر کے مال جمع کیا ہو۔ جب لوگ اس طرح سے اپنے رزق کی حفاظت کریں گے، تو ہی فقر غیور کا آغاز ہوگا۔ پھر انسان نہ بھیک قبول کرے گا، نہ امداد اور نہ ہی حرمت رسول ﷺ پر سمجھوتا کرے گا۔ جب ایسی نسل پیدا ہوتی ہے کہ جس کی خودی فقر کی سان پر چڑھی ہو، تو اس کے بعد اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی، کہ اس کے جوانوں کی خودی پھر ہوتی ہے صورتِ فولاد!







## میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ امم کیا ہے

علامہ اقبالؒ نے اپنا پورا کلام جس نسل کیلئے لکھا، اس نسل کو قیام پاکستان کے بعد پیدا ہونا تھا۔ اقبالؒ اس نسل کی تربیت کرنا چاہتے تھے کہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو عروج عطا کرنا ہے اور جس کے ذریعے امت کا احیاء ہونا ہے۔ اسی نوجوان نسل کی تربیت اب ہماری ذمہ داری ہے اور اب ہم اقبالؒ کے کلام کی مدد سے اس نسل کو تیار کریں گے، ان شاء اللہ۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم ”ایک نوجوان کے نام“ میں امت مسلمہ کے نوجوانوں کو مخاطب کر کے بہت پر اثر باتیں کی ہیں۔ گو کہ یہ نظم آج سے نوے سال پہلے لکھی گئی، مگر اسے دیکھیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ آج کے نوجوانوں کو مخاطب کرتی ہو۔ اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے کیلئے امت کو جن ذرائع اور جس علم و فرقان کی ضرورت ہے، وہ سب کچھ اقبالؒ نے اس نظم میں جتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے، وہ یقیناً اقبالؒ ہی کا خاصہ ہے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ امم کیا ہے

شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

آؤ تمہیں بتاؤں کہ قومیں کیسے عروج حاصل کرتی ہیں۔ آغاز میں ان کے افراد جفاکش اور دلیر ہوتے ہیں، وہ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔ صلاح الدین ایوبیؒ نے کہا تھا: ”میں نہیں جانتا کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا یا نہیں، مگر یہ ضرور جانتا ہوں



کہ اسلام کے دفاع کیلئے تلوار کی ضرورت ہے۔“

ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ کار تھا۔ ان کے کپڑے بے شک پھٹے پرانے ہوتے، مگر ان کی تلواروں کی دھار بہت تیز ہوتی تھی۔ ان کے پاس اسلحے کی رسد اور کوئی خاص کمک بھی نہیں تھی، مگر جب یہ آندھی حجاز سے اٹھی تو اس نے قیصر و کسریٰ کے ایوانوں کو اپنی پلیٹ میں لیکر، قصہ پارینہ بنا دیا۔ آج تک انسانی عقل اس تاریخی معجزے پر دنگ ہے۔ حضور ﷺ نے جب پردہ فرمایا تو گھر میں شاید کھانے کو بھی کچھ نہ تھا، مگر دیوار پر ہر طرح کے ہتھیار، تلواریں اور نیزے لٹکے ہوئے تھے۔ مسلمانوں کے بارے میں تو خود کافروں نے یہ گواہی دی ہے کہ رات کو یوں لگتا ہے کہ جیسے یہ راہب ہیں، جنہیں اس دنیا سے کوئی غرض ہی نہیں، مگر دن میں ایسے لگتا ہے کہ جیسے ان کی ساری زندگی گھوڑے کی پشت پر ہی گزرتی ہے۔

تاریخ میں جس قوم نے بھی عروج حاصل کیا ہے، وہ جفاکشی، جرأت، شجاعت اور غیرت کے ذریعے ہی حاصل کیا ہے، جب وہ قومیں ناچ گانے کی محفلوں، فنون لطیفہ، عیش و عشرت، تن آسانیوں اور سہل پسندی میں پڑ گئیں، تو زوال کا شکار ہوئیں۔ جس دن مسلمان دوبارہ جفاکشی، عزت و غیرت اور دلیری کو اپنالیں گے، اسی دن وہ عروج کی راہ پر دوبارہ گامزن ہو جائیں گے۔ ایک یہودی نے کہا تھا کہ جس دن فجر کی نماز میں اتنے مسلمان ہوں گے کہ جتنے جمعہ کی نماز میں ہوتے ہیں، تو اسی دن سے مسلمانوں کے عروج کا آغاز ہو جائیگا۔

پہلے مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر، فرغانہ وادی میں اپنے چچا شیبانی خان کے ہاتھوں شکست سے دوچار ہونے کے بعد، اپنی تھوڑی سی فوج لیکر افغانستان آگیا اور پھر اس نے وہاں سے ہندوستان کا رخ کیا۔ مگر اس سے پہلے وہ افغانستان کی ایک وادی میں برفباری کی وجہ سے پھنس گیا۔ خطرہ یہ پیدا ہو گیا کہ سب لوگ برفباری کے اس طوفان میں ہی مرجائیں گے۔ سپاہی اپنے بادشاہ کو بچانے کی غرض سے وہاں ایک غارتلاش کر کے، اس میں الاؤ جلاتے ہیں اور بابر کو اس میں پناہ لینے کا مشورہ دیتے ہیں، گو کہ پوری فوج خود سردی میں ہی ٹھہر رہی ہوتی ہے۔ اس موقع پر بابر نے یہ تاریخی جملہ کہا: ”ہمہ یاراں دوزخ، ہمہ یاراں بہشت“۔ یعنی میں دوستوں کے ساتھ ہی دوزخ میں رہوں گا اور دوستوں کے ساتھ ہی جنت میں بھی۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ ساری رات کھلے آسمان تلے برف میں ہی بسر کی۔

بابر گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سفر کیا کرتا تھا۔ دریا تیر کر پار کر لیتا۔ اسی جفاکشی کا نتیجہ تھا کہ وہ ہندوستان آیا اور مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی کہ جو تین سو سال تک قائم رہی۔ اسی مغل سلطنت کے آخری دور میں ان کی تن آسانی کا یہ عالم تھا کہ مغل بادشاہ اور سپہ سالار پالکیوں میں بیٹھ کر میدان جنگ میں آنے لگے۔ حال یہ ہو گیا کہ مردوں کے بجائے، ہجڑوں کی فوج بنائی گئی۔ ایسی حالت میں انگریزوں کا مقابلہ کیسے ممکن تھا، تباہی اور زوال ناگزیر تھا!

چینیوں کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ ماؤ زے تنگ نے انقلاب برپا کرنے کیلئے ایک ہزار میل کا پیدل سفر کیا۔ چینی عوام بھی اٹھارہ



اٹھارہ گھنٹے بغیر تنخواہ کے کام کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے بعد آزاد ہونے کے باوجود اب وہ دنیا کی بڑی معاشی اور عسکری طاقت بن چکے ہیں۔ لگتا یوں ہے کہ چین بہت جلد دنیا کی واحد عالمی طاقت کا روپ دھار لے گا۔

اقبالؒ جو انوں کو مخاطب کر کے مزید فرماتے ہیں:

ترے صوفے ہیں افرونگی، ترے قالین ہیں ایرانی  
 لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی  
 امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل  
 نہ زور حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلطانی  
 نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں  
 کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی  
 عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں  
 نظر آتی ہے اُس کو اپنی منزل آسمانوں میں  
 نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے  
 امیدِ مردِ مومن ہے، خدا کے راز دانوں میں  
 نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر  
 تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

یہ آج سے نوے سال پہلے کی بات ہے کہ جب خلافت عثمانیہ کا زوال ہوا۔ اس وقت امتِ مسلمہ کا کوئی خطہ آزاد نہیں تھا، حتیٰ کہ مکہ و مدینہ اور افغانستان میں بھی انتشار تھا۔ مغل حکومت تو ۱۸۵۷ء میں ہی تباہ ہو گئی تھی۔ خلافت عثمانیہ بھی ۱۹۲۴ء میں زوال کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ مسلمان کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ایسا وقت بھی ہم پر آئے گا کہ کوئی مسلمان خطہ آزاد نہیں رہے گا، خلافت تباہ ہو جائے گی اور امت کا شیرازہ بکھیر دیا جائے گا۔ مسلمان ذلت کی ایسی انتہا پر پہنچ چکے تھے کہ ایک انگریز ایجنٹ لارنس آف عربیہ نے تمام عرب ریاستوں میں بغاوت برپا کروا کر مسلمانوں کو اس طرح آپس میں لڑوایا کہ خانہ کعبہ کے پردوں میں بھی ترک مسلمانوں کو گولیاں مار کر شہید کیا گیا۔

انگریز جنرل ایلن بی اردن گیا اور اس نے وہاں بغاوت برپا کروائی۔ یوں فلسطین بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ صرف ایک کافر مسلمانوں کی حکومتوں کے تختے الٹنے کیلئے کافی تھا۔ اس وقت چند ہی لوگ مسلمانوں کی عزت و آبرو بچانے کیلئے قربانیاں دے رہے



تھے۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، وہ امت کے زوال کے نشانات دیکھنے کے باوجود اپنا فرض ضرور ادا کرتے ہیں اور حتیٰ الامکان اس زوال کو ٹالنے کی کوشش بھی۔ وہ گیدڑ جیسی سو سالہ زندگی پر شیر جیسی ایک دن کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی موت کے بعد ہی کفار کو اپنی فتح کا یقین ہوتا ہے۔ ٹیپو سلطانؒ کی شہادت کے بعد ہی انگریزوں میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی تھی کہ: ”اب ہندوستان ہمارا ہے۔“

مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ جب تک ان کا ہاتھ تلوار کے دستے پر رہا، دنیا کی کوئی طاقت مسلمانوں کو شکست نہ دے سکی۔ جب مسلمانوں نے جہاد کا راستہ ترک کر دیا، تو ان پر ذلت اور رسوائی مسلط کر دی گئی۔ یہ اللہ کا قانون بھی ہے اور تاریخ کی حقیقت بھی۔

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل

نہ زور حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلمانی

اگر تمہیں قیصر و کسریٰ کی بادشاہت بھی مل جائے، تو بھی تم عزت حاصل نہیں کر سکتے، کیونکہ تمہارے پاس نہ تو حضرت علیؑ جیسی طاقت ہے اور نہ ہی حضرت سلمان فارسیؓ جیسا استغناء۔ سیاسی اور عسکری طاقت بھی ایک شیر اور دلیر کے ہاتھ میں ہی اچھی لگتی ہے، نہ کہ بزدلوں اور بے غیرتوں کے پاس!

حضرت سلمان فارسیؓ کی کہانی تو آپ کو معلوم ہی ہوگی۔ وہ ایران سے چلے تھے، سچ کی تلاش میں۔ نہ جانے کتنے مذہب تبدیل کیے مگر انکی تلاش کا اختتام اس وقت ہوا کہ جب آپؐ کو زیارت النبی ﷺ نصیب ہوئی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپؐ نے ساری زندگی عاجزی اور مسکینی میں ہی گزاری۔ سبھی صحابہ کرامؓ کا یہی حال تھا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کا فقر بہت مشہور تھا۔ ہر صحابی کی کوئی نہ کوئی منفرد شان ہے۔ صداقت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ اللہ کے دین اور عدل کے معاملے میں بہت سخت ہیں۔ حضرت عثمان غنیؓ کا غنا ضرب المثل ہے اور حضرت علیؓ معرفت، فقر، طاقت، غرض، بہت سی خصوصیات کے حوالے سے مشہور ہیں۔

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں

کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ سلمانی

تہذیبِ حاضر کی چمک دمک میں مسلمان کو وہ عزت و آبرو اور مقام نہیں مل سکتا کہ جس کا وہ خواہاں ہے۔ مسلمانوں کی معراج صرف استغناء میں ہے۔ استغنا کا لفظ ”غنی“ سے نکلا ہے۔ ایک غنی وہ ہوتا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال و زر سے نوازا ہو اور وہ بے دریغ اللہ کی راہ میں خرچ کرے، جیسے کہ حضرت عثمان غنیؓ۔

دوسرا غنی وہ ہوتا ہے کہ چاہے وہ غریب ہی کیوں نہ ہو، مگر اسے دنیا اور اسکے مال و دولت کی کوئی پروا نہ ہو، جیسے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ۔ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مسلمان کی معراج ہی اس شان بے نیازی میں ہے کہ وہ دنیا و مافیہا کو اپنی ٹھوکروں میں رکھے۔ حضور ﷺ نے بھی فرمایا ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ تم لوگ شرک کرنے لگو گے، لیکن مجھے یہ خوف ضرور ہے کہ تم لوگ دنیا کی محبت میں مبتلا ہو کر مال و دولت جمع کرنے لگو گے!

حضور ﷺ نے مسلمانوں کو نصیحت کی تھی کہ بہت زیادہ جاگیریں اور جائیدادیں نہ بناؤ ورنہ تم اس دنیا ہی کے ہو کر رہ جاؤ گے! استغناء



کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان دنیا میں اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کرے۔ ایک طاقتور مومن ایک کمزور مومن سے بہتر کہا گیا ہے۔ ایک مالدار مومن ایک مسکین مومن سے بہتر ہے کہ وہ دینے والا ہاتھ رکھتا ہے۔

مسلمانوں کو ان کی دنیاوی ذمہ داریاں پوری کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ تعلیم حاصل کرنا، صدقہ و خیرات کرنا، حلال روزی کمانا، یہ سب دنیاوی ذمہ داریاں ہیں، مگر چونکہ اللہ ”الصد“ ہے، یعنی بے نیاز ہے، لہذا اللہ کے بندے بھی دنیا سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ وہ دنیا تقسیم کرنے والے ہوتے ہیں، دنیا جمع کرنے والے نہیں۔ قرآن پاک میں کہا گیا ہے کہ قیامت کے روز سونے چاندی کے سکے جمع کرنے والوں کو وہی سکے گرم کر کے ان کے جسم میں داغے جائیں گے اور انہیں کہا جائیگا کہ یہ وہ مال و دولت ہے کہ جو تم دنیا میں جمع کیا کرتے تھے۔

کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ زکوٰۃ کتنی دینی چاہیے۔ انہوں نے پوچھا: ”فقہ کی زکوٰۃ پوچھ رہے ہو، محبت کی یا پھر فقر کی؟“ اس شخص نے حیرت سے کہا: ”زکوٰۃ تو ایک ہی ہوتی ہے“۔ بزرگ نے فرمایا: ”فقہ کی زکوٰۃ یہ ہے کہ تمہارے پاس اگر سو روپے پڑے ہیں تو سال گزرنے کے بعد اس میں سے اڑھائی روپے اللہ کی راہ میں مستحقین کو دے دو۔ محبت کی زکوٰۃ یہ ہے کہ اڑھائی روپے خود رکھو اور باقی ساڑھے ستانوے روپے مستحقین کو دے دو۔ فقر کی زکوٰۃ یہ ہے کہ جو اڑھائی اپنے لیے رکھے تھے وہ بھی تقسیم کر دو!

ایسے کردار ہمیں آج کی تہذیب میں ملنا مشکل ہیں، لیکن موجود ہیں۔ ایسا جلال اور جمال، اللہ تعالیٰ سے قرب اور تعلق، موجودہ تہذیب اپنانے سے نہیں مل سکتا۔ لہذا اقبالؒ نے نوجوانوں کو نصیحت کی ہے کہ مغرب کی تقلید نہ کرو۔ مغرب جس تہذیب کو کچھ کر تھوک چکا ہے، ہماری نوجوان نسل اب اسے اپنانا چاہ رہی ہے۔ کیونکہ ذرائع ابلاغ اور معیشت پر مغربی تہذیب ہی قابض ہے اور ہمارے نوجوان مغربی تعلیمی اداروں سے ہی پڑھ کر آتے ہیں، لہذا اپنے ہمراہ ان کی تہذیب اور اقدار بھی لے آتے ہیں۔

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں

نظر آتی ہے اس کو اپنی منزل آسمانوں میں

جب کسی مرشد کامل کی نگاہ، ایک مسلمان میں عشق رسول ﷺ کی آگ بھڑکا دیتی ہے، تو اس کے وجود میں ایک ایسا طوفان برپا ہو جاتا ہے کہ جو ایک بندہ مومن کو اپنی معراج حاصل کرنے کیلئے بے چین رکھتا ہے۔ اقبالؒ اس طوفان کے برپا ہونے کی دعا کرتے ہیں کہ:

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اقبالؒ جس جذبے کو خودی کا نام دیتے ہیں، وہ انسان کے وجود میں یہی آتش شوق ہے کہ جو اللہ کی طرف اٹھتی ہے، نہ شرقی ہوتی ہے اور نہ ہی غربی!

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی  
گھر میرا نہ دلی، نہ صفا ہاں، نہ سمرقند

قرآن پاک کی سورہ نور کی آیت ۳۵ کا مفہوم ہے: ”اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق جس میں ایک چراغ رکھا ہو۔ چراغ ایک شیشے کے اندر اور شیشہ چمکتے ستارے کی مانند ہو۔ یہ چراغ زیتون کے ایسے شاداب درخت کے روغن سے روشن کیا جاتا ہو کہ جو نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اس کا روغن اتنا شفاف ہو کہ جیسے آگ کے چھوئے بغیر ہی بھڑک اٹھے گا۔ گویا نور کے اوپر نور۔ اللہ اپنے نور کی طرف ہدایت جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے.....!“

.....

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے

امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

جب امت کو زوال آتا ہے تو اس وقت سب سے بڑی مصیبت کہ جو قوم کے قائدین، علماء اور عوام میں پیدا ہوتی ہے، وہ مایوسی ہے۔ اسی لیے مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔ جب قوم مایوس ہو جاتی ہے تو ترقی و عروج کی طرف جانے کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ اگر عروج کی طرف لے جانا ہے، تو سب سے پہلے قوم کو امید دلانی ہوگی، حوصلہ دینا ہوگا۔ ڈاکٹر مرتے ہوئے مریض کو بھی تسلی دیتا رہتا ہے کہ ان شاء اللہ، تم صحت یاب ہو جاؤ گے، اسے یہ نہیں کہتا کہ ان شاء اللہ، تھوڑی دیر میں تم فوت ہونے والے ہو۔

دشمن کی جانب سے ہماری قوم پر پہلا حملہ ”نفسیاتی“ ہوگا۔ ہم پر نفسیاتی جنگ مسلط کی جائیگی۔ قوم میں یہ احساسات پھیلائے جائیں گے کہ وہ تباہ و برباد ہو چکی ہے، غلامی قبول کرنے کے سوا اب اور کوئی چارہ نہیں، مغرب کی غالب طاقتوں سے مقابلہ ناممکن ہے، ہمیں اپنے دفاع کو ترک کر کے معیشت کو بہتر بنانے پر توجہ دینی چاہیے اور اس کیلئے مغربی سودی نظام کو قبول کرنا لازم ہے وغیرہ وغیرہ۔ ہماری قوم تو ویسے ہی صوبائیت، فرقہ واریت اور تعصبات کا شکار ہے۔ ذرائع ابلاغ اور دیگر ذرائع سے قوم میں مایوسی پھیلا دی جاتی ہے تاکہ بالکل ہی مایوس ہو کر اٹھنے کے قابل تک نہ رہے۔

اقبالؒ اسی لیے فرماتے ہیں کہ کبھی ناامید نہ ہونا، کیونکہ ناامیدی زوالِ علم و عرفان ہے۔ ناامیدی پیدا ہوگئی تو علم عرفاں، حکمت، تدبیر اور



حوصلہ سب ختم ہو جائے گا، انسان طاقت رکھتے ہوئے بھی بے حوصلہ ہو کر دشمنوں کے آگے ہتھیار ڈال دے گا۔

جب تاتاریوں نے بغداد پر پہلے بولا تو اس وقت بغداد عالم اسلام کا سب سے بڑا شہر تھا۔ وہاں لاکھوں کی تعداد میں کتابیں موجود تھیں۔ بیت الحکمت تھا۔ کئی سو سال کی تہذیب تھی۔ ہمارے تحقیقی مراکز بغداد میں واقع تھے۔ ۱۲۵۸ء میں جب تاتاری بغداد میں داخل ہوئے تو مسلمانوں پر دہشت طاری ہو گئی، کیونکہ تاتاریوں کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ تھا۔ حالت یہ تھی کہ کسی کمرے میں دس بارہ مسلمان مرد بیٹھے ہوتے اور وہاں ایک تاتاری عورت داخل ہوتی اور انہیں حکم دیتی کہ سر جھکا کر بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد وہ ایک ایک کر کے سب کی گردن اتارتی جاتی اور کسی مسلمان مرد میں جرأت نہیں ہوتی کہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ گردنیں اڑانے کے دوران

اگر اسکی تلوار ٹوٹ جاتی تو وہ باہر جا کر دوسری تلوار لے آتی، مگر اس دوران کوئی بھی مسلمان ہلنے کی جرأت نہ کرتا۔ مایوسی کا عالم اس قدر شدید تھا کہ حواس شل ہو چکے تھے اور کوئی تدبیر نہ دیتی تھی!

مایوسی ایسی لعنت ہے کہ ایک بار طاری ہو جائے تو پھر اٹھی ہتھیاروں کا ہونا بھی کام نہیں آتا، شکست مقدر بن جاتی ہے۔ دوسری جانب اگر اپنے نظریے اور مقصد پر یقین ہو تو بے سروسامان ہو کر بھی عالمی طاقتوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

ویت نامیوں کے پاس امریکیوں کے مقابلے میں کیا تھا؟ افغانستان کے مجاہدین کے پاس روسی طاقت کے مقابلے میں کونسے ہتھیار تھے؟ چیچنیا اور بوسنیا کے مسلمان بھی بے سروسامانی کا شکار تھے، کشمیر اور فلسطین کے لوگوں کے پاس تو بطور ہتھیار صرف پتھر ہیں، مگر وہ سب دشمن کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں، کیونکہ ان کی آنکھوں میں امید کی شمع روشن ہے۔ ایک فلسطینی بچہ بھی یہ نہیں کہتا کہ اسرائیلیوں سے معاہدہ کر لو۔ اگر امید زندہ ہو تو قوم لازماً عروج حاصل کر کے ہی رہتی ہے۔

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ مرد مومن کی امید اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہوتی ہے۔ جب مرد مومن یہ امید کرتا ہے کہ اللہ اسکو کبھی رسوا نہیں کرے گا، تو اللہ کبھی بھی اپنے بندے کا مان نہیں توڑتا۔ حضور ﷺ کی ایک حدیث ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ جب وہ اللہ پر کسی بات کی قسم کھالیں تو اللہ کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ انکی قسم کو توڑ دے!

اللہ کے بندوں نے جب اللہ پر قسم کھالی کہ پاکستان ضرور بنے گا، تو پاکستان بن کر رہا۔ جب انہوں نے قسم کھائی کہ پاکستان ایٹمی طاقت بنے گا، تو پھر پاکستان پوری دنیا کی مخالفت کے باوجود، ایٹمی طاقت بھی بنا۔ انہوں نے قسم کھائی کہ پاکستان میں موجود کفر کا نظام ختم کر کے یہاں خلافت راشدہ کا نظام نافذ کریں گے تو انشاء اللہ، اللہ کی لاج رکھے گا۔ اگر انہوں نے قسم کھارکھی ہے کہ مسلمانوں کو متحد کر کے United States of Islam قائم کریں گے، تو اللہ یہاں بھی ان کی لاج رکھے گا۔

اللہ تعالیٰ لوگوں سے ان کے گمان کے مطابق ہی سلوک کرتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عذاب دے گا، تو انہیں اللہ تعالیٰ عذاب ہی دیتا ہے۔ جو یہ گمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کریگا، تو اللہ ان کی مغفرت کر دیتا ہے۔ لہذا بحیثیت قوم سب سے پہلا کام جو ہمیں کرنا ہے، وہ امید کو زندہ رکھنا ہے۔ تمام تر مصیبتوں کے باوجود اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ ہم پھر سے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہمارے بزرگوں پر اس سے بھی بڑی بڑی مصیبتیں آئیں، مگر انہوں نے مقابلہ کیا اور مصیبتوں کو شکست دی۔ بغداد تباہ ہوا تو اسی کی راکھ سے خلافت عثمانیہ کی بنیاد پڑ گئی، کیونکہ بغداد کو تباہ و برباد کرنے والے تاتاریوں ہی کو مسلمان کر لیا گیا۔

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

اللہ کی حکمت بہت وسیع ہے۔ انسان کو کیا معلوم کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں روس اور امریکہ سے لڑنا پڑیگا، تب ہمیں فتح نصیب ہوگی۔ مگر ان معاشروں میں تو معاشی اور معاشرتی کینسر سرایت کر چکا ہے، لہذا وہ تہذیبیں تو اپنے خنجر سے آپ خود کشی کر رہی ہیں۔ اقبالؒ تو پہلے ہی مغرب کو متنبہ کر چکے تھے کہ:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کشی کرے گی

جوشاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا

یعنی ہمیں تو شاید ان سے لڑنے کی ضرورت بھی نہ پڑے، کہ وہ خود ہی اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہیں۔ ہمیں صرف خود کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا ہے، اپنی خودی کو بیدار کرنا ہے، اپنے یقین کو زندہ رکھنا ہے، اپنے نظریے اور اپنی روحانی اساس پر، اپنے معاشرے اور تہذیب کی تعمیر نو کرنی ہے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر

تو شاہیں ہے، بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

کہتے ہیں کہ امت اسوقت تباہ ہوتی ہے کہ جب اس کے علماء فاسد ہو جائیں۔ سب سے بدترین علماء وہ ہیں کہ جو حکمرانوں کے درباروں میں پائے جاتے ہیں اور سب سے اعلیٰ علماء وہ ہیں کہ جن کے در پر طاقتور حکمران حاضری دیتے ہیں۔ تمام عظیم مسلمانوں، علماء اور حکمرانوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ دنیا برتنے ضرور تھے، مگر دنیا میں ڈوبے نہیں تھے۔ ان میں زورِ حیدری بھی تھا، فقرِ بوذر بھی، اور استغناءِ سلمانی بھی۔ یہ ہمارے بزرگوں کی میراث ہے اور ہمیں اس کو دوبارہ حاصل کرنا ہے۔



## سوالات و جوابات

سوال: اقبالؒ کہتے ہیں، اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی، کہ ایک ہوں جنیدی اور اردشیری۔ اس میں جنیدی اور اردشیری سے کیا مراد ہے؟

جواب: آنے والے دور میں جو نسل پیدا ہونی ہے اور جس طرح کی حکمرانی مسلمانوں کو عطا ہونی ہے، وہ جنیدی اور اردشیری کا مجموعہ ہونی چاہیے۔ انسانیت کی فلاح اسی جنیدی اور اردشیری نسل کی یکتائی میں ہے۔ جنیدی سے مراد حضرت جنید بغدادیؒ کی روحانیت ہے۔ وہ اللہ کے ولی، درویش اور فقیر کامل تھے۔ دوسری جانب اردشیر ایران کا ایک طاقتور بادشاہ گزرا ہے، لہذا یہاں اردشیری سے مراد عسکری، سیاسی، معاشی اور اقتصادی طاقت ہے۔ اقبالؒ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب سیاسی، معاشی اور عسکری طاقت کسی ایسے حکمران کے ہاتھ میں آجائے گی کہ جو اللہ کا ولی بھی ہوگا، تو پھر دنیا میں انقلابی تبدیلی آجائے گی۔ انسانیت کی فلاح اسی میں ہے کہ انقلاب ”آمریتِ رحمانی“ کے تحت لے آیا جائے، یعنی (Benevolent Dictatorship)۔

جارج برنارڈ شاؤ نے بھی کہا تھا کہ اگر حضور ﷺ جیسے کوئی وجود دنیا کے مطلق العنان حکمران بن جائے تو پوری دنیا میں جنگیں ختم ہو جائیں گی اور امن قائم ہو جائیگا۔ یہ ایک مغربی مفکر کے الفاظ ہیں۔

اقبالؒ اپنی کتاب: "Reconstruction of Religious Thought in Islam" میں Spiritual Democracy کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ جدید جمہوریت تو سیکولر اور لادین ہے۔ یہ تو فحش جمہوریت ہے۔ اس میں



جس کے پاس بھی چیخنے چنگھاڑنے والے لوگ ہوں، پیسہ ہو، ذرائع ابلاغ کی طاقت ہو، وہی طاقت اور فراڈ کے زور پر برسرِ اقتدار آتا ہے۔ اقبالؒ نے اس مغربی جمہوریت کے مقابلے میں ”روحانی جمہوریت“ کا تصور دیا ہے، کہ جو ”آمریتِ رحمانی“ ہی کی دوسری شکل ہے۔

خلفائے راشدین کے دور میں حکومت کا انداز کیا لادین آمریت تھی؟ نہیں! کیا وہ مغربی جمہوریت پر مبنی تھا؟ نہیں! تب نہ تو سیاسی جماعتیں تھیں اور نہ ہی انتخابات ہوتے تھے۔ نہ ہی ہر پانچ سال کے بعد خلیفہ کو اتار کر نیا انتخاب ہوتا تھا، نہ ہی قومی اسمبلی تھی، نہ سینیٹ کا وجود تھا اور نہ ہی پیشہ ور سیاستدان۔

آمریت اس لیے نہیں تھی کہ خود خلیفہ سے زیادہ کوئی شخص عاجز نہیں ہوتا تھا۔ حکمرانی خلیفہ کی نہیں، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تھی۔ خلیفہ صرف ان کے نمائندے کے طور پر اللہ کے احکامات کو نافذ کرنے کا ذمہ دار تھا۔ جنیدی اور ادشیری کے مجموعے کی مثالیں دیکھنی ہیں تو خلفائے راشدین کا طرز زندگی اور طرز حکمرانی دیکھیں۔ ہماری تاریخ میں بہت سے عظیم حکمران گزرے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ، حاکم مصر و شام کہ جنہوں نے تمام صلیبی فوجوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور انہیں شکست دی۔ پوری دنیا پر آپکار عب و دب بہ تھا۔ مگر جب انکا انتقال ہوا تو کفن تک کے پیسے نہ تھے۔ چندہ جمع کر کے آپ کے کفن و دفن کا بندوبست کیا گیا۔ یہ کس نے کہا ہے کہ جب آپ ملک کے بادشاہ بن جائیں تو عوام کا پیسہ لوٹ کر اپنے سوس اکاؤنٹ کھلوائیں۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان حکمرانوں کیلئے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ ان کے ہاتھ پاک ہوں، بلکہ ان کے دل و نگاہ بھی پاک صاف ہونے چاہئیں۔ اقبالؒ کہتے ہیں:

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے

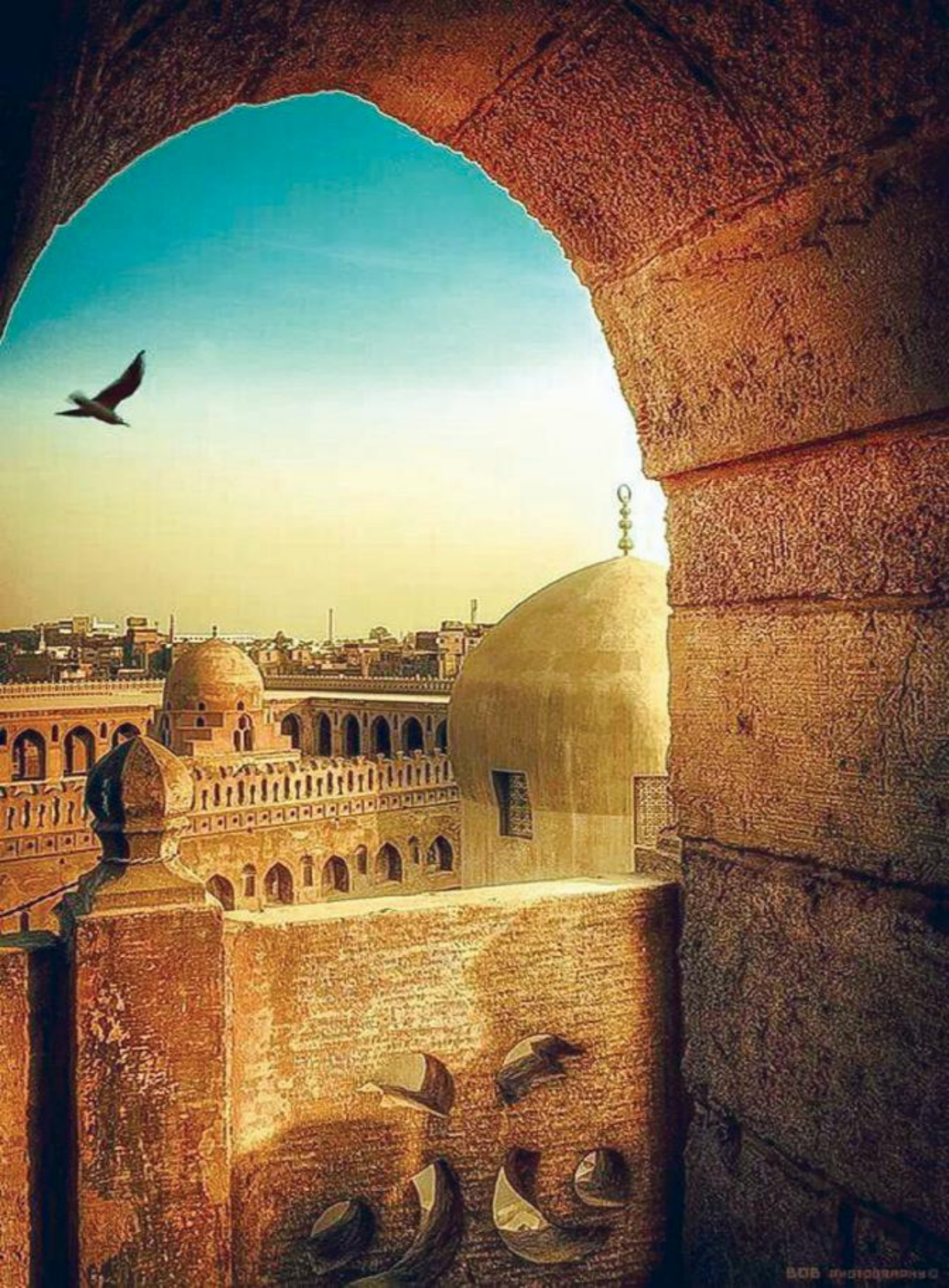
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بے باک نہیں ہے

جب دل و نگاہ ہی پاک صاف نہ ہوں، تو طبیعت میں بے شرمی، بے غیرتی اور بے حیائی آتی ہے، چاہے کوئی فرد ہو یا کوئی حکمران یا کوئی قوم۔ قائدہ ایک ہی ہے۔

حجاج بن یوسف کے دور میں کئی صحابہ کرامؓ کی اولادوں کو شہید کیا گیا۔ ایک نیک بزرگ کو جب شہید کیا گیا تو اتنا خون بہا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ حجاج بن یوسف حیران رہ گیا کہ اتنا خون کیونکر بہہ سکتا ہے۔ اس نے حکیم کو بلا کر اس امر کی طبی وجہ پوچھی تو حکیم نے بتایا کہ عموماً جب لوگوں کو موت نظر آتی ہے تو انکا خون خشک ہو جاتا ہے، لیکن یہ اتنا بے خوف شخص تھا کہ موت اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اسے کوئی فرق نہیں پڑا اور اس نے انتہائی بے خوفی سے جان دی۔ اقبالؒ نے بھی مرد مومن کی یہی نشانی بتائی ہے کہ:

نشان مرد مومن با تو گویم

چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست



جب مرد مومن کی موت کا وقت آتا ہے تو اس کے چہرے پہ مسکراہٹ آ جاتی ہے۔

جنیدی اور اردشیری خصوصیات کا حامل قائد عوام کے ساتھ کیا کریگا؟ اس کا جواب اقبال یوں دیتے ہیں۔

تو نے پوچھی ہے امامت کی حقیقت مجھ سے

حق تجھے میری طرح صاحبِ اسرار کرے

ہے وہی تیرے زمانے کا امام برحق

جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

موت کے آئینے میں تجھ کو دکھا کر رخِ دوست

زندگی تیرے لیے اور بھی دشوار کرے

ایک وقت آئیگا، ان شاء اللہ، کہ جب اللہ اس امت کو ایسے حکمران عطا کرے گا کہ جن کے پاس مکمل طاقت اور اختیار بھی ہوگا، ان کے پاس ہیبت و جلال بھی ہوگا، ان کے پاس وقت کی بہترین ٹیکنالوجی اور ہتھیار بھی ہوں گے، مگر ان کا دل فقیر ہوگا۔ وہ دولت جمع کرنے والے نہیں، بلکہ تقسیم کرنے والے ہوں گے۔ وہ جائیدادیں بنانے والے نہیں، بلکہ صادق اور امین ہوں گے۔ جب ان کا انتقال ہوگا تو ان کے دونوں ہاتھ خالی ہوں گے۔ وہ اللہ کے ولی ہوں گے۔ وہ جنیدی اور اردشیری ہوں گے۔

قرآن پاک میں ذوالقرنین کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ ذوالقرنین فرماتے ہیں کہ جسے وہ دنیا میں سزا دیں گے، اللہ اسے آخرت میں اس سے بھی زیادہ سزا دیگا اور جس کو وہ دنیا میں نوازیں گے، اللہ اسے آخرت میں مزید نوازے گا۔ یہ ہوتا ہے ایک فقیر اور درویش حکمران کا اختیار!

ایسے حکمران دنیا میں اللہ کی حجت ہوتے ہیں، اللہ کی دلیل ہوتے ہیں، اللہ کا سایہ ہوتے ہیں۔ امت ان کی پناہ میں محفوظ رہتی ہے۔

ایسے حکمران اللہ تعالیٰ لوگوں کو تحفے کے طور پر دیتا ہے اور ان اقوام کو تحفے میں دیتا ہے جو ان کی قدر کرنا جانتے ہوں۔ جو قوم اللہ کے بھیجے ہوئے ایسے حکمران یا مجدد کا مذاق اڑائے اور ان سے بغاوت کرے، تو اس قوم پر صرف اللہ کا عذاب ہی نازل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اقبال بھی تحفے کے طور پر ہمیں عنایت فرمائے۔ اگر ہم اس تحفے کی قدر نہیں کریں گے تو اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہوگا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے کسی بزرگ کی بہت تعریف سنی تو ان سے ملنے چلا گیا۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہے کہ محل کے خیمے لگے ہوئے ہیں اور سونے کی کیلیں پیوست ہیں۔ وہ بہت حیران ہوا کہ اللہ کے بندے ہیں اور دنیا میں عیش و عشرت کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ بزرگ

اس شخص کی حیرانی بھانپ گئے اور کیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: ”میں نے یہ زمین میں گاڑی ہوئی ہیں، دلوں میں نہیں۔“ دنیا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اگر یہ دنیا تمہارے ہاتھ سے چلی جائے اور تمہیں اس پر دکھ اور تکلیف محسوس ہو، تو اس کا مطلب ہے کہ دنیا تمہارے دل میں گر گئی ہے۔ ایسا حکمران کہ جس کی نظر میں دنیا کے مال و دولت کی کوئی حیثیت نہ ہو، اور وہ اپنی طاقت اور اختیار کو صرف اللہ کی طرف سے امانت سمجھ کر امت کی خیر میں استعمال کرے، تو اس سے بڑی نعمت امت مسلمہ کو حاصل نہیں ہو سکتی۔

دنیا آئے یا جائے، اللہ کا بندہ بے نیاز ہوتا ہے۔ جب انسان اس طرح دنیا میں رہتا ہے تو یہ دنیا اسے نقصان نہیں پہنچاتی۔ پھر اس دنیا میں رہنا فتنے کا باعث نہیں بنتا۔ لیکن اگر دنیا میں ڈوب جائے تو پھر مال، اولاد، خواہشات، سب فتنہ بن جاتی ہیں۔

ہمارے بزرگ ہمیں نصیحت کرتے ہیں کہ دنیا میں بطح کی طرح رہو۔ وہ پانی میں رہتے ہوئے بھی گیلی نہیں ہوتی۔ اقبالؒ کے سارے کلام کا مقصد ہی یہ ہے کہ ایسی نسل پیدا کی جائے جو فقر غیور کی حامل ہو، جو استغنائے سلمائی رکھتی ہو، فقر بو ذرا در زور حیدریؒ کی حامل ہو۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ہمیں جلد ایسی نسل دستیاب ہوگی۔ ہم ”شکوہ تقدیر یزداں“ نہیں کرتے، کیونکہ ہم خود اللہ کی تقدیر ہیں۔ اللہ کے بندوں کی زندگیوں میں مایوسی کا لفظ نہیں ہوتا۔ وہ پر امید رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو عروج دینا چاہتا ہے، تو اسے امید کی روشنی عطا کرتا ہے، پھر اس قوم پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ اس روشنی کی قدر کرتی ہے یا نہیں۔ ہمارے اس دور میں امید کی وہ کرن کہ جس نے آنیوالی نسلوں کے راستوں کو روشن کرنا ہے، وہ اقبالؒ ہیں!





بَابُ الْحَشَةِ







## قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

ان شاء اللہ، آنے والے وقتوں میں پاکستان کی نوجوان نسل اسم محمد ﷺ سے ہی دہریں اجالا کرے گی۔ اس نوجوان نسل کی تربیت کیلئے ہی حلقہء یاراں تحریر کیا گیا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اس نوجوان نسل کو جو خودی اور فقر غیور کا پیغام دیا اور عشق حقیقی کی دعوت دی، وہی قوموں کے عروج و زوال کا راز ہے۔ مسلمانوں نے جب بھی ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ کا لحاظ رکھا، اللہ تعالیٰ نے انکو دنیا میں عزت، عروج، طاقت اور قوت عطا فرمائی اور جب بھی مسلمان اللہ کے رسول ﷺ کے حوالے سے بے ادب ہوئے، فقر غیور ان کے ہاتھ سے چلا گیا اور جب مسلمان ”حب الدنیا“ اور ”کراہیت الموت“ میں مبتلا ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت و رسوائی مسلط کر دی۔ لیکن اب انشاء اللہ، دوبارہ اس دین کے احیاء کا وقت ہے۔ اب دوبارہ ملت بیضا کی شیرازہ بندی ہے۔



## سوالات و جوابات

سوال: آج کے دور میں حضور ﷺ سے اس حد تک فیض لینا کیسے ممکن ہے کہ جس طرح صحابہ کرامؓ لیا کرتے تھے؟ اور مسجد نبوی میں حاضری کے آداب کیا ہیں؟

جواب: حضور ﷺ خاتم النبیین ﷺ ہیں۔ یہ اس وقت کیلئے بہت بڑی بشارت ہے۔ اسکا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کوئی اور نبی نہیں آئیگا، بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ آپ ﷺ کا فیض قیامت تک جاری رہے گا۔ اسی لیے اب کسی اور نبی کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ حضور ﷺ کی نسبت اور تعلق آج بھی اپنی امت کے ساتھ اسی طرح قائم ہے کہ جس طرح چودہ سو سال قبل تھا۔ یہ ایک بہت بڑا روحانی راز اور حقیقت ہے۔ آپ ﷺ سے قبل کسی بھی نبی کی ایسی نسبت اور تعلق اپنی قوم کے ساتھ نہیں رہا۔ حضور ﷺ پر درود بھیجنا، آپ ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری دینا، آپ ﷺ سے محبت کا اظہار کرنا، آپ ﷺ کے سامنے درخواستیں پیش کرنا اور پھر حضور ﷺ کا اپنی امت پر اس طرح نگاہ رکھنا کہ ان کے ہر معاملے کا دھیان کیا جائے، یہ ایک ایسی رحمت خاصہ ہے کہ جو سیدی رسول اللہ ﷺ سے پہلے کسی اور نبی یا امت کو عطا نہیں ہوئی۔

یہ سب ہم یوں ہی نہیں کہہ رہے۔ تاریخ اسلام میں اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ حضور ﷺ سلطان نورالدین زنگیؒ کے خواب میں تشریف لائے تھے اور ان کو خبردار کیا تھا کہ دو صلیبی مدینہ میں آپ ﷺ کے روضہ مبارک کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ ان کی سرکوبی کی جائے۔ نورالدین زنگیؒ اس سعادت پر دھاڑیں مار مار کر روئے کہ نبی کریم ﷺ نے مجھے اس خدمت کیلئے منتخب کیا۔ انکی خوش نصیبی دیکھیے۔ زیارت نبی ﷺ تو برحق ہے۔ اب بتائیے کیا سلطان نورالدین زنگیؒ کو اس طرح فیض نہیں ملا کہ جس طرح صحابہ کرامؓ کو ملا کرتا تھا؟

حضور ﷺ کے صدقے، آپ ﷺ کے غلاموں کو بھی یہ اختیار حاصل ہے کہ روحانی دنیا کے تکوینی نظام میں اپنا کردار ادا کر سکیں، چاہے ظاہری وجود کے ساتھ ہوں یا روحانی طور پر۔

سلطان محمد فاتحؒ کے خواب میں حضرت ابوالیوب انصاریؒ تشریف لائے، اور قسطنطنیہ فتح کرنے کی بشارت دی۔ اسی طرح حضرت معین الدین چشتیؒ، سلطان غوری کے خواب میں تشریف لائے اور اسکو ہندوستان پر حملہ کر نیکی ترغیب اور فتح کی خوشخبری دی۔ طارق بن زیادؒ کے خواب میں تو خود حضور ﷺ تشریف لائے اور بشارت دی کہ میں اندلس جا رہا ہوں، تم بھی وہاں پہنچو۔ تبھی تو طارق بن زیادؒ نے وہاں جا کر کشتیاں جلا دیں، کہ حضور ﷺ کا حکم ہے، اب میں واپس نہیں جاسکتا۔

حدیث شریف میں ہے کہ جس نے خواب میں میری زیارت کی، اس نے مجھے ہی دیکھا کیونکہ شیطان میرے روپ میں نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں ہم ایک نہایت ہی منفرد کتاب ”زیارت النبی ﷺ بحالت بیداری“ کا حوالہ پچھلے ابواب میں تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ وہ اس بات پر پورا یقین رکھتے ہیں کہ آج کے دور میں بھی لوگ حضور ﷺ سے اسی طرح فیض لے سکتے ہیں کہ جس طرح صحابہ کرامؓ لیا کرتے تھے، مگر کیونکہ یہ بات اکثر دماغوں کو ناگوار گزرتی ہے، اسی لیے خاموش رہتے ہیں۔

یہ بات لوگوں کو ناگوار کیوں گزرتی ہے؟ اس لیے کہ ہم اللہ اور رسول ﷺ کی معرفت کو عقل سے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ یہ عقل کے معاملے میں ہی نہیں۔ اللہ کی معرفت عقل سے نہیں، قلب سے عطا ہوتی ہے۔

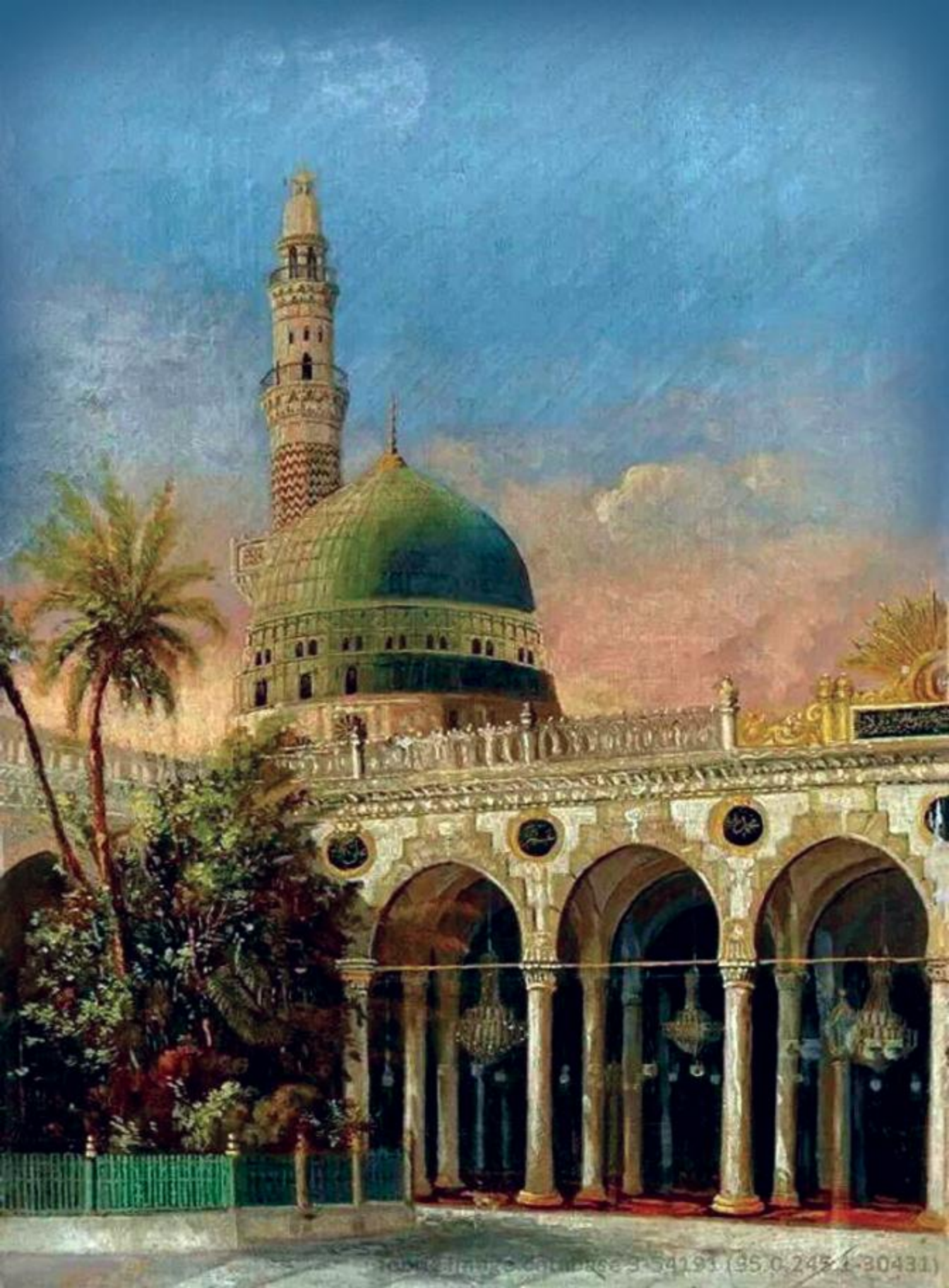
گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور

چراغِ راہ ہے، منزل نہیں ہے

یہ بات کہ آج کے دور میں حضور ﷺ کا فیض کیسے حاصل ہو سکتا ہے، یہ عقل سے سمجھنے والی بات نہیں ہے، محسوس کرنے والی بات ہے۔ عقل یہ بات کیسے مان سکتی ہے کہ حضور ﷺ لوگوں کے خواب میں تشریف لائیں اور انہیں نہ صرف انکے ذاتی بلکہ امت کے اجتماعی مسائل کا حل بھی بتائیں۔ یہ عشق، پیار، جنون اور مستی کی بات ہے۔ یہ بڑے فیض اور کرم کے معاملے ہیں۔ آنکھ کا پردہ رہتا ہے، لیکن یہ بھی رسی ہے۔ زیارت النبی ﷺ حالت بیداری میں بھی اسی طرح ثابت ہے کہ جس طرح خواب میں اور فیض رسول ﷺ آج بھی اسی طرح جاری کہ جیسے دور صحابہؓ میں۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ مسجد نبوی، اصل میں دربار نبوی ﷺ ہے۔ پوری کائنات کے فیصلے اسی دربار سے جاری ہوتے ہیں۔ جب آپ بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار میں جاتے ہیں، تو انکا پروٹوکول ہوتا ہے۔ دربار نبوی ﷺ کا بھی اپنا ایک الگ ہی پروٹوکول ہے۔ آپ نے اکثر یہ سنا ہوگا کہ مسجد نبوی میں وہی جاسکتا ہے کہ جس کو بلاوا آئے۔ ظاہر ہے بادشاہ کی دعوت کے بغیر تو آپ بادشاہ کے دربار میں نہیں جاسکتے۔ اور اگر وہاں جا کر بے ادب اور گستاخ ہو گئے، تو مار بھی پڑے گی۔ لیکن اگر مودب ہو گئے تو پھر فیض لے کر آئیں گے۔

بزرگ کہتے ہیں کہ انسان کو تمام دنیاوی اختیارات، عہدے، طاقت اور روپیہ پیسہ مسجد نبوی میں جوتیوں والی جگہ پر چھوڑ کر جانا چاہیے۔ وہاں ہم نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ مسجد نبوی میں جا کر بھی بادشاہ بنے پھرتے ہیں، وہاں بھی خود کو جرنیل، پیر، عالم اور حکمران وقت سمجھتے ہیں۔ اس دربار میں تو عاجزی چاہیے، اگر نہیں۔ مسجد نبوی میں عاجز، مسکین اور فقیر بن کر جانا چاہیے۔ وہاں پر دنیا کا بڑے سے بڑا رتبہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ وہاں سب سے بڑا رتبہ یہ ہے کہ آپ غلام رسول ﷺ ہوں، عاشق رسول ﷺ ہوں، فقیر ہوں دربار نبوی کے۔



ہم نے وہاں ایسا بھی دیکھا ہے کہ مشین گنوں سے لوگوں کو پیچھے دھکیلا جا رہا ہوتا ہے، کیونکہ کسی بادشاہ یا شہزادے کو وہاں حاضری دینا ہوتی ہے۔ کیا حضور ﷺ ایسی متکبر حاضری کو قبول فرمائیں گے؟

حضرت زین العابدینؓ جب طواف فرمایا کرتے تھے، تو رش کے باوجود لوگ آپؓ کو دیکھ کر راستہ کھول دیا کرتے۔ جبکہ بادشاہ وقت کا حال یہ تھا کہ لوگوں کو کوڑے مار مار کر اپنا راستہ بنواتا تھا۔ اس پر بادشاہ نے حضرت زین العابدینؓ سے فرمایا کہ آپؓ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں، لہذا لوگ آپؓ کو راستہ دیتے ہیں، میں لوگوں کے جسموں پر حکومت کرتا ہوں، لہذا مجھے کوڑے مار مار کر راستہ بنوانا پڑتا ہے۔

مسجد نبوی میں داخلے سے پہلے اذن لینا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اجازت ضرور لیں۔ پروٹوکول پورا کریں اور بزرگوں نے ہمیں جو طریقے بتائے ہیں، ان کے مطابق جب روضہ رسول ﷺ پر حاضری دینے جائیں تو پہلے کچھ صدقہ ضرور دیں۔ قرآن پاک میں بھی آیات ہیں کہ جن کا مفہوم یہ ہے کہ جب حضور ﷺ سے مشورہ کرنے جاؤ، تو پہلے صدقہ ضرور دو۔ ان آیات کی روشنی میں ہی پھر حضرت علیؓ نے حضور ﷺ کے پاس جانے سے قبل کچھ صدقہ کرنے کی سنت اختیار کر لی۔ آج بھی بزرگ اسی طریقے پر عمل کرتے ہیں۔ روضہ مبارک کی جانب پشت نہیں کرتے۔ اپنے جوتے، موبائل فون اور دیگر غیر ضروری چیزیں پرے چھوڑ کر آتے ہیں۔ ادب کا انتہائی پہلو برقرار رکھا جاتا ہے۔ وہاں آوازیں بلند نہیں کی جاتیں۔ جو وہاں آواز بلند کرتا ہے، اس کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔ حضور ﷺ کے عاشق اور پیار کرنے والے تو سرگوشیوں میں بات کرتے ہیں۔

وہاں چونکہ رش بہت زیادہ ہوتا ہے، لہذا ادھکے لگتے ہیں۔ بہت امکانات ہوتے ہیں کہ انسان کو غصہ آجائے، لہذا بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں لڑائی جھگڑا نہیں کیا جاسکتا، یہ ناقابل معافی جرم ہے۔ پروفیسر اقبال عظیم نے کیا خوب کہا ہے:

غلامان محمد ﷺ دور سے پہچانے جاتے ہیں

دل گرویدہ گرویدہ، سر شوریدہ شوریدہ

اکثر لوگوں کی خواہش ہوتی ہے کہ حضور ﷺ کے روضہ پاک کے قریب بیٹھیں یا ریاض الجنۃ میں بیٹھیں، اگرچہ نیند آرہی ہوتی ہے، بھوک لگی ہوتی ہے، وضو کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے، مگر اس لیے نہیں اٹھتے کیونکہ وہاں سے اٹھنے کا دل نہیں چاہ رہا ہوتا۔ یہ غیر محتاط انداز ہے۔ روضہ پاک ادب کا مقام ہے۔ جب نیند آئے، بھوک لگے یا وضو کرنا ہو تو وہاں سے اٹھ جائیں۔ صرف عقیدت اور ثواب کی لالچ میں وہاں بیٹھ نہ رہیں، کیونکہ ان حالتوں میں بے ادبی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ انسان ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ وہاں ڈھیلا پڑنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مسجد نبوی کے بہت سے فقراء نے تو ہمیں یہاں تک کہا ہے کہ ان کی جرأت نہیں ہوتی کہ حضور ﷺ کے ”مواضع شریف“، یعنی جہاں آپ ﷺ کا چہرہ مبارک ہے، وہاں جا کر سلام پیش کریں، بلکہ وہ قدیم شریفین کی طرف جا کر سلام پیش کرتے ہیں



یا پھر دور سے ہی سلام پیش کر دیتے ہیں۔ مگر یہ ادب اور عشق کا اپنا اپنا انداز ہے۔ ایسے بھی کئی فقراء ہیں کہ اگر مولاجہ شریف کی جانب سے دن میں کئی مرتبہ سلام نہ پیش کر لیں، تو انہیں چین ہی نہیں آتا۔

مسجد نبوی سے باہر نکلنے سے پہلے بھی سیدی رسول اللہ ﷺ سے اجازت ضرور لیں، دوبارہ حاضری کی اجازت کے ساتھ۔ حضور ﷺ کے عاشق جب بھی مدینہ شریف سے واپسی کی اجازت طلب کرتے ہیں، تو سیدی ﷺ کے پاس دوبارہ حاضری کی درخواست دے کر نکلتے ہیں۔ قرآن پاک میں واضح احکامات موجود ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس کسی کام کیلئے جمع ہو، تو ہرگز وہاں سے روانہ نہ ہو جب تک کہ رسول اللہ ﷺ سے اجازت نہ طلب کر لو! عشاق رسول ﷺ آج بھی پوری عقیدت سے اس حکم پر عمل کرتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ قرآن پاک کی کوئی بھی آیت، خاص طور پر وہ کہ جن کا تعلق ادب رسول ﷺ سے ہے، منسوخ نہیں ہے۔

جب آپ ان آداب کا خیال رکھیں گے تو یہ حاضریاں آپ کے لیے بہت خیر و برکت کا باعث ہوں گی۔ مسجد نبوی میں حاضری کائنات کا خوبصورت ترین تحفہ ہے، خوش نصیب ترین لوگوں کو ہی ملتا ہے، اس کی قدر کیجیے گا۔

اقبال جب یورپ سے واپس آئے تو والد نے کہا کہ اقبال آپ یورپ سے آتے ہوئے راستے میں حرمین شریفین میں بھی حاضری دیتے آتے۔ اقبال یہ سن کر رونے لگے اور صرف اتنا کہا کہ کس منہ سے جاتا۔ عشق اور پیار کا یہ بھی ایک انداز ہوتا ہے۔ کچھ فقراء ادب کے مارے حضور ﷺ کے سامنے جاتے ہی نہیں۔

کچھ عاشق ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کو حضور ﷺ خود مدینہ آنے سے روک دیتے ہیں۔ امام جامی کا واقعہ اس حوالے سے ایک مستند دلیل ہے کہ جب خود سیدی رسول اللہ ﷺ نے مکے کے گورنر کو خواب میں آکر حکم دیا کہ ان کے عاشق جامی، کہ جو حج پر آئے ہوئے تھے، کو مدینہ آنے سے روکا جائے، اور اس کی وجہ سیدی ﷺ نے یہ فرمائی کہ جامی اتنے بڑے عاشق ہیں کہ اگر انہوں نے روضہ پاک پر آکر حضور ﷺ پر سلام پڑھا، تو سیدی رسول اللہ ﷺ کو اس کا جواب بہ نفس نفیس دینا پڑے گا۔ مکہ کا گورنر انتہائی ادب سے امام جامی کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے ہاتھ چومے، ان کو عزت و احترام سے اپنے گھر لایا اور پھر حضور ﷺ کا پیغام دے کر درخواست کی کہ سیدی مدینے تشریف نہ لے جائیے۔ یہ اسلامی تاریخ کا ایک انتہائی حیرت انگیز اور رقت آمیز واقعہ ہے۔

بہت سے عاشق رسول ﷺ جب حج و عمرہ ادا کرنے جاتے ہیں، تو اپنے ساتھ بڑی رقم لے کر جاتے ہیں اور اس رقم سے مسجد نبوی ﷺ کے فقراء کی کفالت کرتے ہیں اور پھر ان لوگوں سے دعائیں کرواتے ہیں۔ ایسے فقراء حضور ﷺ کے مہمان ہوتے ہیں اور عشاق رسول ﷺ ان کی کفالت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ صاحب نظر اور اہل بصیرت لوگ ایسے فقراء کو تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مسجد نبوی میں فقراء بھی ہیں اور مساکین بھی۔ اولیاء اللہ بھی ہیں اور غریب فاقہ کش بھی۔ عشاق رسول ﷺ جب بھی مسجد نبوی جاتے ہیں تو ان دونوں طبقات کے بزرگوں کو تلاش کرتے ہیں، خدمت کرتے ہیں اور ان سے دعا لیتے ہیں۔



کائنات میں تمام اولیاء اور فقراء کا روحانی ہیڈ کوارٹر مسجد نبوی ﷺ ہے۔ اسی لیے وہاں اگر ادب کے ساتھ جائیں گے تو خوش نصیب ہونگے۔

سوال: تقدیر، نصیب اور قسمت، انکا آپس میں کیا تعلق ہے اور کیا یہ ایک ہی چیز کے مختلف نام ہیں؟

جواب: یہ مختلف نام ہیں، ایک ہی تصور کے۔ بنیادی طور پر تقدیریں دو طرح کی ہیں۔ ایک تقدیر وہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے لکھ دی ہے اور اس میں آپ کا کوئی اختیار یا دخل نہیں ہے۔ یعنی آپ کس کے گھر پیدا ہونگے، آپ کی شکل و صورت کیا ہوگی، کہاں پیدا ہونگے، یہ سب آپ کے اختیار میں نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب اس کائنات کو تخلیق کیا تو ازل سے ابد تک کی بھی ایک تقدیر لوح محفوظ میں لکھ دی ہے۔ قیامت کب واقع ہوگی، ملائکہ کی تعداد کیا ہوگی، کتنے انسانوں نے اس دنیا میں آنا ہے، جانور اور کیڑے مکوڑے کس تعداد میں پیدا کیے جائیں گے، کتنے درخت اور پودے تخلیق ہونگے، کتنی کائناتیں اور کہکشاںیں وجود میں لائی جائیں گی، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی تقدیر میں، اس کی تخلیق سے پہلے ہی لکھ دیا ہے۔ اس کو ”تقدیر مطلق“ کہتے ہیں۔

دوسری تقدیر، ”تقدیر معلق“ ہے کہ جو دعائے تبدیل کی جاسکتی ہے۔ جب انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھیجا تو اس کو نہ صرف اشرف المخلوقات بنایا، بلکہ خلیفۃ اللہ فی الارض بھی نامزد کیا۔ پوری کائنات اللہ تعالیٰ کی حقیقت کا بوجھ نہ اٹھا سکی، مگر اس امانت کو انسان نے اٹھا لیا۔ اس اعلیٰ ترین عہدے کے ساتھ انسان کو یہ اختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنی تقدیر خود مرتب کر سکے۔

حضور ﷺ کے دور میں ایک صحابی کی بہن نے کسی دوسری خاتون کو پتھر مار کر انکا دانت توڑ دیا۔ قصاص میں فیصلہ کیا گیا کہ ان خاتون کے دانت بھی پتھر مار کر توڑے جائیں گے۔ مگر وہ صحابی اللہ تعالیٰ پر قسم کھا کر بول اٹھے کہ خدا کی قسم! میری بہن کے دانت نہیں توڑے جاسکتے۔ حالانکہ عدالت کا فیصلہ آچکا تھا، مگر اچانک ہی مدعی دیت لینے پر راضی ہو گئے اور انکی بہن کے دانت ٹوٹنے سے بچ گئے۔ اس پر حضور ﷺ نے مسکرا کر فرمایا کہ اللہ کے کچھ بندے ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ اللہ پر کسی بات کی قسم کھالیں تو اللہ کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ انکی قسم کو توڑ ڈالے! ان صحابی کا اللہ پر اتنا ایمان تھا کہ انہوں نے اپنی تقدیر اور نصیب کو تبدیل کر لیا۔

حضرت عمرؓ جب ایمان نہیں لائے تھے، تب بھی رسول اللہ ﷺ کو آپ بہت پسند تھے۔ حضور ﷺ نے آپ کے ایمان لانے کی دعا کی، اور اس کے نتیجے میں حضرت عمرؓ کے نصیب اور تقدیر تبدیل ہو گئی۔ اسی لیے حضرت عمرؓ کو مطلوب الرسول ﷺ بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا کہ میرا بیٹا مرنے کے قریب ہے اس کیلئے دعا فرمائیے۔ حضرت علیؓ نے اس کو حکم دیا کہ فلاں لڑکی سے اس کا نکاح کر دو، اسکی زندگی بچ جائے گی، اس شخص نے ایسا ہی کیا۔ اور پھر اس لڑکی کی زندگی بچ بھی گئی۔ اس شخص نے حضرت علیؓ

سے ایسا کرنے کی وجہ پوچھی تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے اس لڑکی کا نصیب دیکھا تھا، اس میں بیوہ ہونا نہیں لکھا تھا۔ اس لیے میں نے تمہیں حکم دیا کہ اس بچی سے اپنے بیٹے کا نکاح کر دو کہ اس کے بعد تمہارا بیٹا وفات نہیں پائے گا، کیونکہ اس بچی کی تقدیر میں بیوہ ہونا نہیں لکھا۔

اگر کوئی شخص خود اپنی تقدیر نہ لکھے، تو وہ اللہ کی لکھی ہوئی تقدیر پر ہی زندگی گزارتا ہے، یا پھر اسکی تقدیر کو کسی دوسرے کی تقدیر کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے۔

بندہ مومن کو یہ اختیار اللہ نے دیا ہے کہ وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تقدیر معلق کو اپنی دعا سے تبدیل کر والے۔ اسی لیے اقبالؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر بندہ مومن حضور ﷺ سے وفا کرے، تو پھر وہ لوح و قلم کا بھی مالک ہو جاتا ہے، کہ یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں!

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے

.....

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات

مومن فقط احکامِ الہی کا ہے پابند

حضور ﷺ کی ایک حدیث شریف ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ تقدیر کو کوئی چیز نہیں بدل سکتی، سوائے دعا کے!

.....

سوال: اقبالؒ اپنے ایک شعر میں یہ فرماتے ہیں کہ موت کا فرشتہ انسان کے ”وجود کے مرکز“ سے دور رہتا ہے۔ یہاں وجود کے مرکز سے کیا مراد ہے، اور حقیقی انسان اجزاء کیا ہیں؟

جواب: انسان کے وجود میں ظاہر و دو مرکز ہیں۔ ایک جسم ہے، دوسرا انسان کی روح ہے۔ مگر ”حقیقت انسان“ نہ روح ہے نہ بدن۔

اگر نہ ہو تجھے الجھن تو کھول کر کہہ دوں

وجودِ حضرت انسان نہ روح ہے نہ بدن!

اقبالؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

فرشتہ موت کا چھوٹا ہے گو بدن تیرا

ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے!

انسان کی حقیقت اس کا وہ نفس ہے کہ جس کو حقیقت انسان کہتے ہیں۔ انسان کی اس اصل حقیقت میں ایک مرکز ہے کہ جسے ”قلب“ کہتے ہیں۔ قلب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نور وصول کرتا ہے۔ اسی طرح انسان کے وجود میں ایک اور مرکز بھی ہے کہ جو شیطان کا شر وصول کرتا ہے۔ شیطان کا شر وصول کرنے والے ریسور کو ”نفس امارہ“ کہتے ہیں۔ نفس امارہ برائی کی طرف اکساتا ہے۔

دنیا میں برقی سگنل تو ہر جگہ آرہے ہیں، مگر جب آپ ریڈیو یا ٹیلی ویژن آن کر کے اسے ٹیون کرتے ہیں، تبھی اس میں سے آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ اسی طرح انسان کے وجود میں بھی کئی ریسور موجود ہیں۔ آپ اپنے قلب سے خیر کے سگنل وصول کرتے ہیں اور نفس امارہ سے بدی کے۔ اور یہ جنگ انسان کے وجود میں ہر وقت جاری رہتی ہے۔ اللہ نے انسان کے وجود میں نیکی اور شر دونوں عناصر ڈالے ہوئے ہیں۔

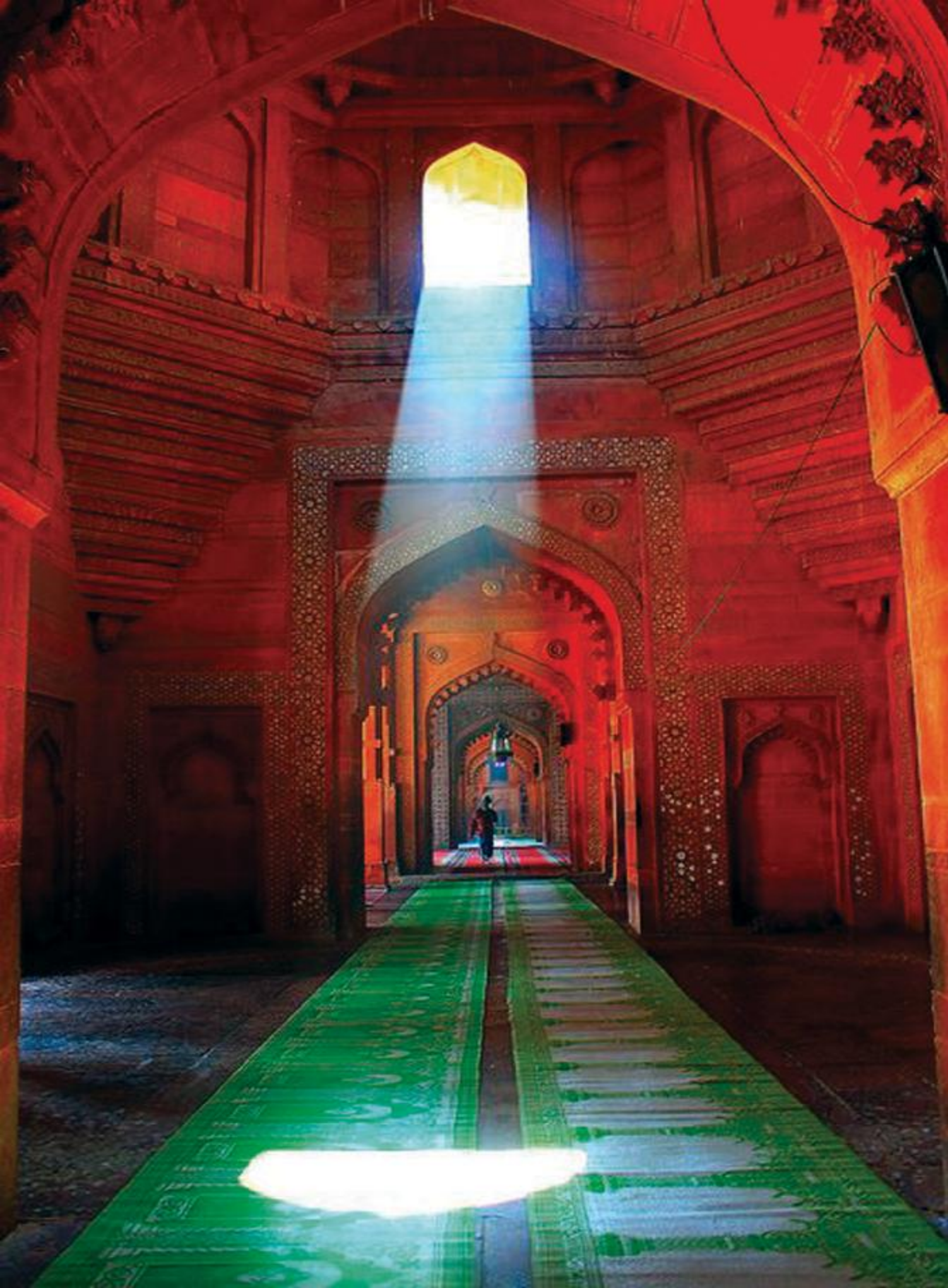
قرآن میں قلب کے تین درجات بتائے گئے ہیں۔ پہلا قلب منیب ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جب اللہ کے ذکر سے قلب کو غذا ملنی شروع ہوتی ہے، عشق رسول ﷺ سے اس کی تربیت ہوتی ہے، نگاہ مرد مومن اس کو ملتی ہے، تو پھر قلب منیب ترقی کر کے قلب سلیم بن جاتا ہے۔ اور جب قلب سلیم کی مزید تربیت کی جاتی ہے، اسے سنوارا جاتا ہے، تو وہ قلب شہید بن جاتا ہے۔ یہ تینوں قرآن کی اصطلاحیں ہیں۔ یہ قلب کے تین درجات ہیں۔

اسی طرح نفس کا سب سے کم تر درجہ نفس امارہ ہے۔ جو انسان کو گناہ اور برائی کی جانب اکساتا ہے۔ یہ بھی قرآن کی اصطلاح ہے۔ آپ نفس کی تربیت کرتے ہیں، اس کی اصلاح کرتے ہیں۔ مگر نفس کو مارا نہیں جاسکتا۔ اردو میں ایک اصطلاح استعمال ہوتی ہے ”نفس کو مارنا“ یہ غلط ہے۔ نفس کو مارا نہیں جاتا، اس کو قابو کیا جاتا ہے، اس کی اصلاح کی جاتی ہے، ضبط نفس کیا جاتا ہے۔ نفس کو مارو گے تو خود مر جاؤ گے۔ جب نفس کی اصلاح کی جاتی ہے تو وہ بہتر ہو کر نفس لواہمہ بن جاتا ہے۔ جس کو آپ ”ضمیر“ بھی کہتے ہیں۔ یہ انسان کو برے کاموں پر ملامت کرتا ہے۔ یہی نفس جب مزید ارتقاء پذیر ہوتا ہے، بہتر ہوتا ہے، اس کی مزید تربیت اور تزکیہ ہوتا ہے، تو پھر وہ نفس مطمئنہ بن جاتا ہے۔ یہ آخری مقام ہے۔ قرآن پاک میں ہے: اے نفس مطمئنہ! لوٹ آؤ اپنے رب کے پاس، اس حالت میں کہ تم اس سے راضی ہو اور وہ تم سے راضی!

اسی لیے صحابہ کرامؓ کے نام کے ساتھ ”رضی اللہ تعالیٰ عنہ“ لگاتے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ ان سے راضی ہے۔ سب صحابہ کرامؓ نفس مطمئنہ کے اس درجے تک پہنچ چکے تھے۔

انسان کی عقل کو کام کرنے کیلئے غذا چاہیے۔ اب یہ غذا آپ اسے قلب سے دیتے ہیں یا نفس امارہ سے، یہ آپ کا کام ہے۔ اگر انسان کی





عقل کو نفس امارہ سے قوت مل رہی ہے، تو وہ شیطان بن جاتا ہے۔ اس کو Evil Intellect (شیطانی دماغ) کہتے ہیں۔ یہ پھر جھوٹ، فساد، قتل و غارتگری وغیرہ برپا کرتا ہے۔ اور اگر انسان کی عقل کو قلب نیب، قلب سلیم اور قلب شہید سے قوت مل رہی ہو، تو پھر وہ عقل سلیم کا حامل ہوتا ہے، کہ جو قلب سلیم سے توانائی لیتی ہے۔ عقل سلیم ہی انسان کی رہنمائی کرتی ہے، اور مودب عقل ہوتی ہے کہ جو فطرت کی حدود کو جانتی اور سمجھتی ہے۔

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ یہ عقل سلیم ہی وہ چراغِ نبی ہے کہ جو آپ کو شریعت سکھاتی اور دنیا میں زندگی گزارنے کا راستہ دکھاتی ہے۔ بندہ مومن دنیا میں ہر طرح کا کام کرتا ہے۔ حکمت عملی بنانا ہو، تحقیق کرنی ہو، انجینئرنگ، طب غرضیکہ کوئی بھی کام کرنا ہو، وہ سب کچھ کریگا، مگر وہ زمین پر فساد پیدا نہیں کریگا۔ کیونکہ اس کی عقل کو قلب سے فیض مل رہا ہوتا ہے۔ اور جب ایک شیطان آدمی، Evil Genius دنیا میں منصوبہ بندی کرتا ہے، تو وہ صرف فساد پیدا کرتا ہے۔ یورپ اور امریکہ کی جدید تہذیب دیکھیے۔ انہوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی حدیں پار کی ہوئی ہیں، لیکن دنیا میں صرف فتنہ و فساد برپا کر رہے ہیں، کیوں؟ اس لیے کہ ان کے پاس قلب نہیں ہے، نفس امارہ ہے۔

یہ ہمارا چیلنج ہے۔ یہی ہمارا امتحان اور اصل آزمائش ہے کہ نفس امارہ کو نفس لواۓ میں اور نفس لواۓ کو نفس مطمئنہ میں تبدیل کریں۔ قلب تو ہے ہی خیر کا ذریعہ۔ مگر اس کو بھی ارتقاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا آغاز ذکر الہی سے ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد فقر، استغناء اور معرفت کا سفر شروع ہوتا ہے۔ حقیقت انسانیکہ کو جانے بغیر نہ تو قلب کا تزکیہ ہوتا ہے اور نہ ہی نفس سنوارا جاسکتا ہے۔ یہ کام مرشد کرتے ہیں۔

سوال: علم اور معرفت میں کیا فرق ہے؟

جواب: جو فرق عقل اور قلب کا ہے، وہی فرق علم اور معرفت کا بھی ہے۔ عقل علم حاصل کرتی ہے۔ قلب معرفت حاصل کرتا ہے۔ علم اور عقل کا تعلق دنیاوی معاملات سے ہے۔ جیسے ہم اپنی زندگی کیسے گزاریں؟ اپنا سماجی، معاشی اور سیاسی نظام کیسے بنائیں؟ سائنس، ٹیکنالوجی، طب اور انجینئرنگ وغیرہ میں کیسے کام کریں؟ ان سب کا تعلق عقل سے ہے۔ ان کا تعلق انسان کے ان دنیاوی معاملات سے ہے کہ جو دنیا گزارنے کیلئے ضروری ہوتے ہیں، حتیٰ کہ شریعت کا تعلق بھی عقل سے ہی ہے۔

لیکن جب حقیقت انسانیکہ اور معرفت کی بات آتی ہے، معرفت رسول ﷺ اور معرفت الہی کی بات ہوتی ہے، تو اس علم کو معرفت کہتے ہیں کہ جس کا تعلق انسان کی روحانی جہت سے ہے۔ عقل کی حد میں یہ بات نہیں آتی کہ جنت کیا ہے، دوزخ کیا ہے، ملائکہ کیا ہیں، آخرت کیا ہے، انسان کا قلب کیا ہے، نفس امارہ، نفس لواۓ اور نفس مطمئنہ، کیا ہیں، روح کیا ہے، عرش کیا ہے، کرسی کیا ہے، سات آسمان کیا ہیں، لوح محفوظ کیا ہے، قلم اعلیٰ کیا ہے اور تقدیر کیا ہے! یہ عقل کے معاملات ہی نہیں ہیں۔ کوئی ماہر نفسیات یا ریاضی دان انہیں نہیں سمجھ

سکتا۔ جو عقل سے ان کو سمجھنے کی کوشش کریگا، ہلاک ہوگا۔ سمجھدار عقل، یا عقل سلیم وہی ہوتی ہے کہ جو اپنی حدود کو پہچانے اور موقوف رہے۔ وہ عقل کہ جو شتر بے مہار کی طرح ہر اس معاملے میں دخل دے کہ جو اس کی حدود سے بھی باہر ہوں، تو وہ گمراہی، ضلالت اور فساد پھیلاتی ہے۔

یہ بات کہ حضور ﷺ معراج پر تشریف لے گئے اور وہاں سے واپس بھی آ گئے، جبکہ ان کے دروازے کی کنڈی ابھی تک بل رہی تھی اور بستر بھی گرم تھا، عقل میں آنے والی نہیں ہے۔ عقل کو اپنی حدود سمجھنی چاہیے۔ فتنہ تب پھیلتا ہے کہ جب عقل معرفت کی حدود میں دخل اندازی کرنے لگتی ہے۔

علم و عقل کی حدود کہاں تک ہیں؟ اس کی مثال بزرگوں نے یہ بتائی ہے کہ جب حضور ﷺ معراج پر تشریف لے کر گئے تو جبرائیل امینؑ سدرۃ المنتہیٰ پر رک گئے، اور رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اس سے آگے نہیں جاسکتا، میری حد یہاں تک ہی ہے۔ میں اس سے آگے گیا تو میرے پر جل جائیں گے! علم کی معراج وہیں تک ہے، کہ جہاں سے آگے جبرائیل امینؑ کے پر جلتے ہیں۔ جبرائیل امینؑ عقل کی معراج کی نمائندگی کرتے ہیں۔

سدرۃ المنتہیٰ سے نیچے عالم صفات یعنی ”صفات کی دنیا“ ہے۔ یہ وہ دنیا ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ کی صفات کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن سدرۃ المنتہیٰ کے بعد ذات کا سفر شروع ہو جاتا ہے۔ ذات کی معرفت آ جاتی ہے۔ وہاں پہ صفت نہیں جاسکتی۔ عقل بھی ایک صفت ہے۔ عقل ایک تخلیق ہے۔ عقل ایک تحفہ ہے کہ جو انسان کو دیا گیا ہے دنیا گزارنے کیلئے، لہذا یہ صفت، ذات کی حدود میں دخل نہیں دے سکتی۔ لیکن انسان کا قلب وہ صلاحیت رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، حضور ﷺ کی حقیقت اور حقیقت انسانیہ کی معرفت حاصل کر سکے۔

قلب مومن عرش اللہ، یعنی مومن کا قلب اللہ کا عرش ہوتا ہے۔

ہمارے قرآن اور دین میں دونوں علوم موجود ہیں۔ طلاق کیسے دینی ہے، وراثت کی تقسیم کیسے کرنی ہے، یہ سب عقل کے معاملات ہیں۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ عہد الست کی بھی بات کرتا ہے، الست برسکم، کہ جب تمام انسانوں کو جمع کر کے، کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے، ان سے عہد لیا گیا تھا۔ یہ عقل میں آنے والی بات ہی نہیں ہے۔ حضور ﷺ کی حدیث شریف ہے کہ زمانے کو برا مت کہو، کہ زمانہ خود اللہ ہے! محدثین اس حدیث کی تشریح نہیں کرتے، کیونکہ یہ عقل میں آنے والی بات ہی نہیں ہے۔

سورہ البقرہ، آیت ۳۰ میں اللہ انسان کی تخلیق سے پہلے کے واقعات بیان کرتا ہے کہ جس میں ”انسی جاعل فی الارض خلیفہ“ کے وقت سے شروع ہو کر سجدہء آدم، ابلیس کا انکار، جنت میں آدم کا قیام، شیطان کا وسوسہ اور پھر جنت سے نکالے جانے کے واقعات ہیں، تو یہ تمام معاملات بھی عقل کی حدود سے ماوراء ہیں۔ ان پر صرف ایمان لایا جاسکتا ہے یا پھر حق الیقین کے درجے پر فائز ہو کر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، کہ جو صرف معرفت سے ہی ممکن ہے۔ اسی لیے اقبالؒ عقل اور عشق کی حدود کا تعین فرماتے ہیں:





عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری

مرے درویش! خلافت ہے جہاں گیر تری

.....

عقل گو آستان سے دور نہیں

اس کی تقدیر میں حضور نہیں

بندہ مومن کی خلافت پوری کائنات میں ہے۔ جب پوری کائنات میں آپ کی ڈیوٹی ہے تو پھر آپ کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ دنیا کے کس حصے میں، آپ نے کونسا ہتھیار استعمال کرنا ہے۔ جب دنیا کے معاملات ہوں تو عقل سے کام لو اور جب اللہ کی معرفت، حضور ﷺ اور حقیقت انسانیہ کے معاملات ہوں، تو پھر عشق اور قلب سے کام لو۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام

اس زمین و آسمان کو بیکراں سمجھا تھا میں

یہ علم اور حکمت کی نشانی ہے کہ انسان اپنی حدود کا تعین کر لے۔ عقل کو وہیں استعمال کریں کہ جہاں عقل کی ضرورت ہو۔ آج حضور ﷺ سے فیض کیسے حاصل ہو سکتا ہے، آج نسبت رسول ﷺ کیسے قائم ہو سکتی ہے، یہ عقل کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ جب انسان ان کو عقل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو گستاخی اور بے ادبی کرتا ہے۔ یہ ادب کے مقام ہیں۔ یہاں پر چپ رہنا بہتر ہے بہ نسبت گستاخی کے۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

یعنی کوئی بڑا عالم یا بزرگ بھی آپ کو قرآن کے راز نہیں دے سکتا، جب تک کہ قرآن آپ کے وجود پر خود نازل نہ ہو۔ صرف کتابیں پڑھنے سے آپ کو قرآن کی حکمت اور معرفت نہیں ملے گی۔ اس کیلئے آپ کو قرآن میں ڈوبنا پڑے گا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ قرآن آپ کے قلب پر نازل ہو۔ یہ حدود ہیں۔ انسان جب ان حدود کو جان لیتا ہے تو مودب ہو جاتا ہے۔ جب عقل اور دل مودب ہو جائیں، تو پھر راز کھلنا شروع ہو جاتے ہیں، کہ:

ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں









## مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

آنے والے وقت میں جس نسل سے اللہ تعالیٰ کو کام لینا ہے، اس کا اخلاق، کردار اور افکار اتنے حیرت انگیز ہوں گے کہ آج کی دنیا میں یہ سب ناقابلِ یقین معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبالؒ کی زبان سے اس امت کو نہایت ہی حیرت انگیز خوشخبریاں دی ہیں۔ اقبالؒ نے اپنا سارا کلام اس نسل کیلئے کہا ہے کہ جس کو پاکستان بننے کے بعد، آنے والی صدیوں میں دنیا کی امامت ملنے والی ہے۔ بندہ مومن کی وہ صفات بتائی ہیں، آنے والے وقت کی وہ خوبصورت ترین تصویر دکھائی ہے کہ جو اب مسلمان امت کی تقدیر ہے اور جس کا آغاز اس مدینہ ثانی، پاکستان کے قیام سے ہو چکا ہے۔ اقبالؒ ایک جراتمند، پراسرار اور دلیر وجود کی تصویر کھینچتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیتے ہیں کہ یہ پوری کائنات صرف اسی مومن جانباز ہی کی میراث ہے۔ جس حلقے میں مومن کام کرتا ہے، جہاں پہ اسکی ذمہ داری لگائی گئی ہے وہ صرف یہ دنیا ہی نہیں ہے۔

عالم ہے فقط مومن جاں باز کی میراث

مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

مگر مومن ہے کون؟ جس کا حضور ﷺ سے ذاتی تعلق نہ ہو، حضور ﷺ سے عشق، محبت اور روحانی نسبت نہ رکھتا ہو، اقبالؒ اسے مومن ہی تسلیم نہیں کرتے۔ اسی حوالے سے ہم اقبالؒ کے کلام میں سے ہی بندہ مومن کی صفات اور اسکے مقام کی بات کرتے ہیں اور اس پر بھی

تفصیل سے بات کریں گے کہ ”صاحب لولاک“ ہونے کا کیا مطلب ہے۔ کیونکہ یہ وہ راز ہے کہ جسے سمجھنا ضروری ہے۔ بار بار اقبالؒ عشق اور یقین کی بات کرتے ہیں۔ بار بار اقبالؒ یہ بات کرتے ہیں کہ بندہ ءمومن تقدیر کا پابند نہیں، خود تقدیر ساز ہوتا ہے۔ بار بار اقبالؒ یہ بات کرتے ہیں کہ بندہ ءمومن جب تک حضور ﷺ سے وفا نہیں کریگا، تب تک وہ کاتب تقدیر نہیں ہو سکتا۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

تم اگر مومن ہو تو جو چاہو گے، حاصل کر لو گے، مگر مومن ہونے کی شرط وہی ہے کہ:

مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے!

ایک بہت بڑا ذہنی خلیان یہ پھیلا دیا گیا ہے کہ آیا آج حضور ﷺ سے نسبت اور تعلق قائم بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اسی شک کو ڈالنے کیلئے ابلیس بھی اپنے چیلوں کو بتاتا ہے کہ:

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا

روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو

یہ مسلمان بھوکا رہ لے گا، مگر یہ موت سے نہیں ڈرتا۔ تم اس کی معیشت تباہ کر دو، یہ ایک بار پھر اٹھے گا، کیونکہ اس کا اپنے نبی ﷺ کے ساتھ ایک روحانی تعلق ہے۔ لیکن اگر تم ایک دفعہ حضور ﷺ سے اس کا تعلق توڑ دو، اس کو حضور ﷺ کے معاملے میں شک میں مبتلا کر دو، اسکے بعد تم دیکھو گے کہ یہ امت کس طرح تباہ ہوتی ہے۔ آج بھی دین کے معاملے میں جتنے بھی فتنے اٹھے ہیں، ان میں یہ بات آپ قدر مشترک پائیں گے کہ وہ حضور ﷺ کے عشق اور ادب کے معاملے میں گستاخ اور بے ادب ہو گئے۔ اگر کسی عالم، جماعت، مسلک یا فرقے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں تو صرف یہ دیکھ لیجئے کہ حضور ﷺ کے ادب کے معاملے میں وہ کس قدر محتاط ہیں۔ اگر ادب کے تقاضے پورے کرتے ہیں، تو وہ حق پہ ہیں، لیکن اگر بے ادب اور گستاخ ہیں تو جان لیجئے وہ ایک گمراہ جماعت ہے، چاہے کتنے ہی بڑے بڑے دعوے کیوں نہ کرے۔

اقبالؒ کا سارا کلام حیرت انگیز طور پر اسی بات پر زور دیتا ہے کہ نسبت رسول ﷺ قائم کرنا واجب ہے۔ ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ اگر حضور ﷺ تک نہیں پہنچے ہو تو جو کچھ بھی کر رہے ہو، وہ سب ”بولہسی“ ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ اگر تم حکومتیں بھی قائم کر لو، نظام قائم کر لو، بڑی بڑی سلطنتیں بنا لو، اگر رسول اللہ ﷺ سے تعلق نہیں تو سب بولہسی ہے۔

اقبالؒ کے کلام میں یہ خاص بات ہے کہ وہ ایک طرف تو جدید عالمی جغرافیائی سیاست، کہ جس کے تحت ملک تقسیم ہو رہے ہیں، تو میں بن رہی ہیں، تو مومن کا عروج و زوال ہو رہا ہے، کے حوالے سے بندہ ء مومن کو اس کا مقصد اور حذف دیتے جا رہے ہیں، اور دوسری جانب بیک وقت اس کا روحانی تزکیہ بھی کرتے جا رہے ہیں، اس کو قرآن و سنت کی حکمت بھی سکھا رہے ہیں، حقیقت الہیہ، حقیقت محمدیہ، حقیقت انسانیہ اور زمین سے لیکر عرش تک، ساری خدائی کی معرفت بھی دے رہے ہیں۔ علامہ کا پورا کام ایک شاہکار ہے۔ اقبالؒ کی کوئی بھی ایک نظم اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کو اس میں یہ دونوں پہلو نظر نہ آئیں۔ ایک بہت خوبصورت نظم سے آغاز کرتے ہیں:

اعجاز ہے کسی کا یا گردشِ زمانہ!

ٹوٹا ہے ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ

یہ کسی کا معجزہ ہے، جادو ہے یا زمانے کی گردش ہے کہ جس کے تحت تو مومن کا عروج و زوال ہوتا ہے، فطرت کا تقاضا ہے یا مکافاتِ عمل ہے کہ جو کچھ آج ہم ایشیا میں دیکھ رہے ہیں کہ مغربی اقوام اپنی تمام تر قوت کے باوجود ایشیاء میں شکست کھانا شروع ہو گئی ہیں اور ان کا اختیار اور قوت ٹوٹنے لگا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ یہ بات کب کہی جا رہی ہے۔ یہ شعر انہوں نے ۱۹۲۰ء میں کہا تھا۔ کہاں ٹوٹا تھا اس وقت سحرِ فرنگیانہ؟ اس وقت تو پوری مسلمان دنیا غلام تھی، پورا ایشیا غلام تھا۔ اس وقت تو یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا کہ مسلمان کبھی آزاد ہو سکیں گے۔ اس وقت تو چین بھی آزاد نہیں تھا۔ وہ بھی پاکستان بننے کے بعد آزاد ہوا۔ ایشیا میں سحرِ فرنگیانہ کہاں ٹوٹا؟ یہ کمال دیکھئے۔ اسی بات پر زور دینے کی ضرورت ہے کہ اقبالؒ جو بات کرتے ہیں، جو پیش گوئی کر رہے ہیں، اس میں پیغمبرانہ بصیرت نظر آتی ہے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ ایسا ہو جانا چاہیے۔ وہ جس یقین اور مشاہدے سے بات کرتے ہیں، یہ بات انسان کو جھنجھوڑ ڈالتی ہے۔ ایک بزدل اور شکی آدمی پر، اقبالؒ کی بات سن کر ہی خوف طاری ہو جاتا ہے، کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص اس قدر یقین اور بے خوفی سے بات کر سکے۔

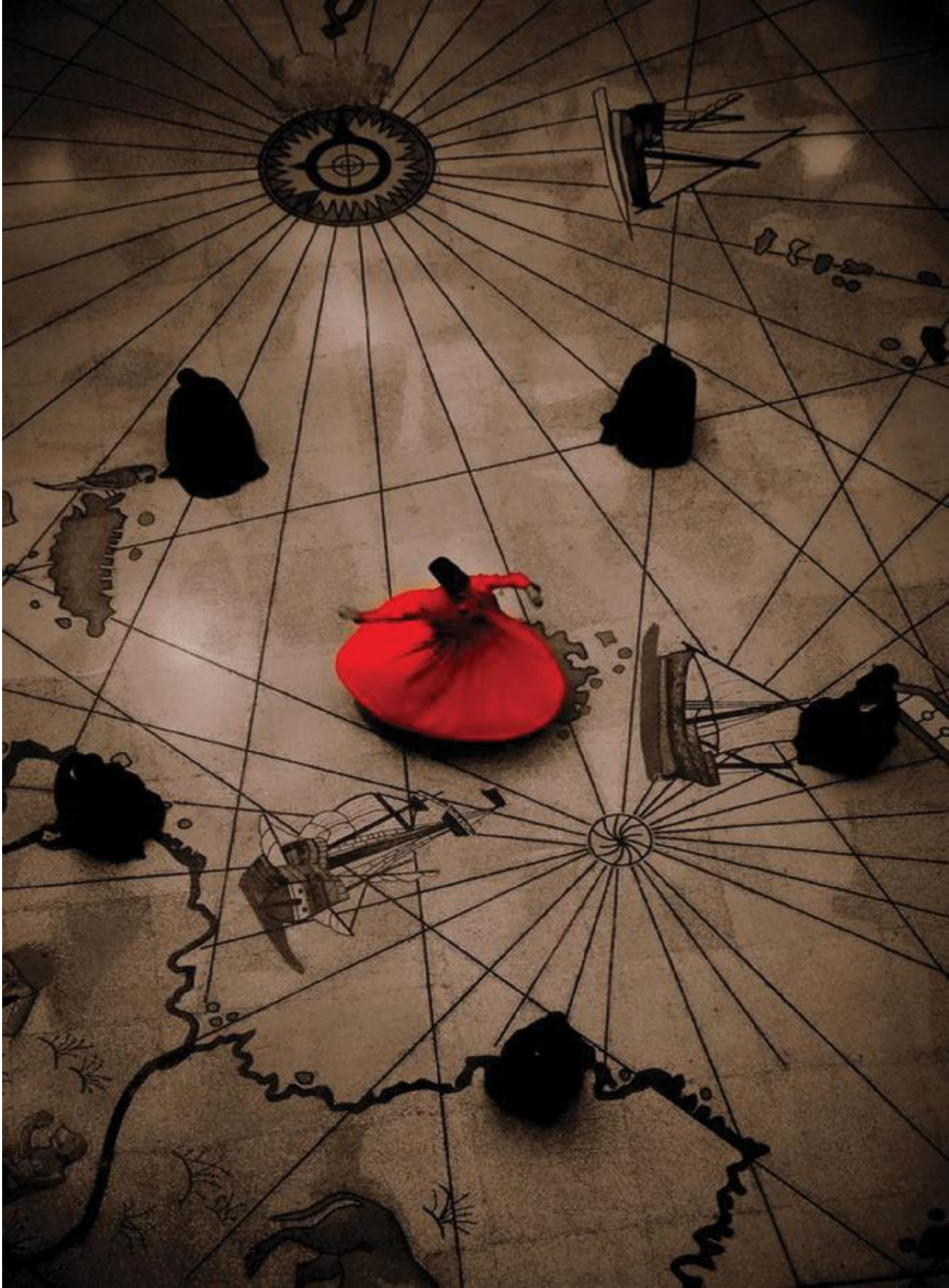
حضورِ حق میں اسرائیل نے میری شکایت کی

یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے برپا

۱۹۳۰ء کا خطبہ الہ آباد اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ مغرب کی ریاستوں کو الگ ہو جانا چاہیے یا وہاں ایک الگ مسلم ریاست بننی چاہیے۔ بلکہ انہوں نے پورے یقین اور مشاہدے سے کہا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ایسا ہو رہا ہے! انہوں نے خوشخبری سنائی، بشارت دی۔

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد

مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد





مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

اللہ کے بندوں کو واقعات کے ظہور ہونے سے سالوں پہلے، صدیوں پہلے یاد ہائیں پہلے بتا دیا جاتا ہے۔ وہ اپنے مشاہدے کی آنکھ سے دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ ان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ لوح محفوظ میں اللہ تعالیٰ نے کیا تقدیر لکھ دی ہے۔ یہ بات حضور ﷺ کی سنت سے ثابت ہے۔ حضور ﷺ نے قیامت تک آنے والے کئی اہم واقعات کو بیان فرمایا ہے۔ حضور ﷺ نے قیامت کی تمام نشانیاں پہلے سے ہی بیان فرمادی ہیں اور اتنی تفصیل سے بیان فرمائی ہیں کہ صحابہ کرامؓ کہتے تھے کہ جو یاد رہ گئیں، سورہ گنیں، بہت سی نشانیاں تو ہم بھول ہی گئے۔ یعنی اتنی کثرت سے آپ ﷺ نے یہ نشانیاں بیان فرمائی ہیں۔ حضور ﷺ کے سامنے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کے تمام واقعات رکھ دیئے تھے۔

ایک مرتبہ نماز پڑھتے پڑھتے حضور ﷺ نے ہاتھ آگے بڑھایا اور پھر پیچھے کھینچا۔ صحابہ کرامؓ نے وجہ پوچھی۔ فرمایا کہ میرے سامنے جنت رکھ دی گئی تھی۔ میرا دل چاہا کہ ہاتھ بڑھا کر اسکے پھل توڑ لوں۔ پھر دوزخ دکھائی گئی اور میں نے ہاتھ کھینچ لیا۔ یہ یقین کی آخری حد ہے کہ آپ ﷺ کو مشاہدہ کر دیا گیا۔ معراج پہ آپ ﷺ یہ سب مشاہدات کر کے آئے تھے۔ حضور ﷺ کیلئے کچھ غیب نہیں ہے۔ غیب تو ہمارے لیے ہے۔ آپ ﷺ تو ہر چیز کا مشاہدہ کر کے آئے ہیں، جنت، دوزخ، عذابِ قبر وغیرہ۔ اللہ نے آپ ﷺ کو ہر چیز دکھا دی۔ اللہ کے بندوں کو بھی اللہ یہ اجازت دیتا ہے اور حضور ﷺ کی خیر و برکت اور عشق میں ہونے کی وجہ سے، اللہ تعالیٰ اپنے ایسے بندوں پر کئی راز کھولتا ہے، مثلاً یہ کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے، اور پھر ان کی زبان سے بڑی بڑی پیش گوئیاں کہلوائی جاتی ہیں۔ حضرت نعت اللہ شاہ ولیؒ آٹھ سو سال پہلے ایک بزرگ گزرے تھے، کہ جنہوں نے آج تک کی تمام پیش گوئیاں اپنے مشہور قصیدے، ”قصیدہ نعت اللہ شاہ ولیؒ“ میں تفصیل سے بیان کی ہیں اور ہر گزرتے دور میں ان کا سچا ہونا ثابت ہوتا جا رہا ہے۔

اقبالؒ خود اپنے بارے میں ایک موقع پر فرماتے ہیں:

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آسکتا نہیں

محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ

سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

خرد (Intellect) یعنی عقل سلیم نے مجھ کو بصیرت اور حکمت عطا کی ہے اور عشق الہی اور عشق رسول ﷺ نے مجھے یہ جرأت عطا کی، کہ میں ایسی اذان دے سکوں کہ جو کائنات کو لرزادے۔

اقبال ”حکیم الامت“ کہلاتے ہیں، اپنے کلام میں جگہ جگہ اپنا تعارف بھی کرواتے جاتے ہیں۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر

میرے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑ گڑانے، آہ وزاری اور دعاؤں کے نتیجے میں، اللہ تعالیٰ نے بالآخر مجھ سے کلام کرنا شروع کر دیا ہے اور کائنات کے راز کھولنے شروع کر دیئے ہیں۔

یہ بات اقبالؒ نے یوں ہی نہیں کہی۔ یہ بندہ مومن کا وہ مقام ہوتا ہے کہ جب اسکے سامنے سے پردے ہٹنے لگتے ہیں، اسکے قلب کی آنکھ وہ کچھ دیکھنے لگتی ہے کہ جو چشم سر نہیں دیکھ پاتی۔ پھر وہ جو بھی بات کرتا ہے، وہ سنی سنائی نہیں ہوتی، قیاس پر مبنی نہیں ہوتی، ایمان بالغیب نہیں ہوتا، بلکہ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کے درجات پر فائز ہو کر وہ اپنی اذان دیتا ہے۔ اس موقع پر ایک بندہ مومن کیلئے اپنے اندر برپا اس طوفان کو قابو رکھنا ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ خطرہ یہی ہوتا ہے کہ کہیں وقت سے پہلے بہت سے راز فاش نہ ہو جائیں۔ تاریخ اسلام میں جب بھی کسی فقیر یا مجدد نے راز کھولے ہیں، تو صرف حکم کے تحت ہی کھولے ہیں ورنہ اس سفر میں بغیر اجازت اللہ کے راز کھولنے کی سزا سولی ہے، جیسے کہ منصور اور سرمد کے ساتھ ہوا۔ اقبالؒ نے بھی راز کھولے ہیں مگر حکم الہی اور اذن رسول ﷺ سے۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا

کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

.....

وہ لوگ کہ جو اللہ کی طرف سے ڈیوٹی پر مامور ہوتے ہیں، دین کا دفاع اور اسکو نافذ کرنے کی ذمہ داری جن کو دی جاتی ہے، جو انقلاب برپا کرتے ہیں، جو قوموں کی قیادت اور امامت کرتے ہیں، ان کے لیے اقبالؒ ایک بڑی گہری نصیحت کرتے ہیں:

تغیر آشیاں سے میں نے یہ راز پایا

اہلِ نوا کے حق میں بجلی ہے آشیانہ

کہ جب میں نے ایک سکون کی زندگی گزارنی شروع کی، اپنے آپ کو ایک مقام پر پابند کر لیا، گھر اور اولاد کے سکون میں مطمئن ہو گیا، تو میں نے محسوس کیا کہ میری بلند پروازی متاثر ہونے لگی، میرا عشق اور جنون مانند پڑنے لگا، میری جرأت رندانہ کند ہونے لگی، اور

میں اپنے اس طوفانی سفر سے بھٹک کر راہ گم کر بیٹھا۔

اگر سلطان صلاح الدین ایوبی کو کھیتی باڑی پر لگا دیا جائے، تو سلطان صلاح الدین ایوبی ختم ہو جائیں گے۔ وہ شہسوار گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کیلئے بنا تھا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ کو کوئی انتظامی ذمہ داری نہیں دی گئی۔ ان سے حدیث، تفسیر، فقہ، اور قرآن و سنت کا کوئی علمی کام نہیں لیا گیا۔ ان کو نمازیں پڑھانے کے لیے آگے کر بھی دیا جاتا، تو چھوٹی سورتیں پڑھتے۔ جب لوگ حضرت خالدؓ سے پوچھتے کہ آپ اتنی چھوٹی سورتیں کیوں پڑھتے ہیں، تو وہ تلوار نکال کر کہتے ہیں کہ میرا کام یہ ہے، مجھے اللہ نے اس مقصد کیلئے پیدا کیا ہے۔ یہ کام تم کر کے دکھاؤ! یہ اس مرد آزاد کی ذمہ داری تھی، کہ جو کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ جب حضرت عمرؓ نے حضرت خالد بن ولیدؓ کو عسکری ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا، تو اس کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد حضرت خالدؓ انتقال فرما گئے۔ وہ شہسوار میدان جنگ سے دور زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

.....

اقبالؒ کے نزدیک شرک صرف یہ نہیں ہے کہ انسان بتوں کی پوجا کرے۔ آج کے دور کا شرک یہ ہے کہ انسان اس کفر اور طاغوت کے نظام کو دیکھے بھی اور اس کے خلاف اعلان بغاوت نہ کرے۔ اقبالؒ کے نزدیک جو انسان ذلت و رسوائی قبول کر لیتا ہے، کفر کے نظام کے خلاف اعلان جنگ نہیں کرتا، زمانے سے سمجھوتا کر لیتا ہے، وہ بھی مشرک ہے۔ اقبالؒ نے اپنی کتاب ”ضربِ کلیم“ کے بارے میں یہ کہا تھا کہ یہ عہد حاضر کے خلاف اعلان جنگ ہے! آج کے دور میں یہ ممکن نہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ ہو اور وہ ایک پرسکون زندگی گزارے، اس کے وجود میں طوفان برپا نہ ہو اور وہ اس طاغوتی نظام سے جا کر نہ ٹکرائے۔

یہ بندگیِ خدائی، وہ بندگیِ گدائی

یا بندہٗ خدا بن یا بندہٗ زمانہ!

.....

غافل نہ ہو خودی سے، کر اپنی پاسبانی

شاید کسی حرم کا تو بھی ہے آستانہ

اقبالؒ کا پورا کلام اٹھا کر دیکھ لیجئے، آپ کو وقار، عزت نفس اور غیرت کا درس دیا جا رہا ہے۔ اپنی عزت نفس کی حفاظت کا حکم دیا جا رہا ہے۔ ہمارے پورے دین کی حکمت ہی یہ ہے کہ ایک انسان غیر تمند، خوددار، صادق اور باحیاء بنے۔ انسانیت کی قدر کرے، انسان کا ادب کرے۔ ہر مسلمان کا وجود بابرکت ہے، مقدس ہے۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ جس نے کسی ایک بے گناہ شخص کو قتل کیا، اس نے

پوری انسانیت کو قتل کیا۔ انسان کو عزت دی گئی ہے۔ ایک مسلمان کی صرف جان ہی حرام نہیں کی اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے، بلکہ اس کا مال اور عزت و آبرو کو بھی حرام قرار دیا ہے۔ آپ کسی دوسرے مسلمان کا مال نہیں لوٹ سکتے۔ اس کا مال بھی اتنا ہی مقدس ہے کہ جتنی اس کی جان۔ اسی طرح مسلمان کی عزت بھی مقدس ہے۔ مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس کو قتل کرنا کفر ہے۔ اس پر بہتان نہیں لگایا جاسکتا، اس کے ایمان پر حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایمان پر حملہ کرنا ایسا ہی ہے کہ جیسے اسے جیتے جی مار دیا جائے۔ یہ تینوں چیزیں مقدس ہیں۔ آج اس معاشرے کا فساد دیکھیں۔ نہ جان محفوظ ہے، نہ عزت اور نہ ہی مال۔

اے لا الہ کے وارث! باقی نہیں ہے تجھ میں

گفتارِ دلبرانہ، کردارِ قاہرانہ

ہر وہ شخص کہ جو اللہ کے دین کو نافذ کرنے کیلئے اٹھتا ہے، اذان دیتا ہے، اور کفر سے نکراتا ہے، اس کو اس بات کیلئے آمادہ رہنا چاہیے کہ اس کی جان، مال اور عزت پر شدید حملے کیے جائیں گے۔ اگر کوئی کفر کے نظام میں کلمہ حق بلند کرنے کا دعویٰ کرتا ہے، مگر اس پر مشکلات نہیں آتیں، تو سمجھ لیجئے کہ اس کا دعویٰ غلط ہے یا راستہ غلط ہے، حکمت عملی غلط ہے یا عقیدہ غلط ہے، اور کفر کا نظام اس سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ اللہ کے بندوں کو جب اذان دینے کی ڈیوٹی دی جاتی ہے، تو ساتھ ہی خبردار بھی کر دیا جاتا ہے کہ اب اپنی کھالیں اتروانے کیلئے بھی تیار رہو۔

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق

یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

یہ نکتہ توحید کی تفسیر ہے۔ توحید صرف فلسفہ علم الکلام نہیں ہے اور نہ ہی زبانی ”لا الہ“ کہہ دینے سے یہ فرض پورا ہو جاتا ہے۔ اس کا عملی اظہار چاہیے ہوتا ہے۔ اس کو کر کے دکھایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں بزرگوں کی مثالیں دی جاسکتی ہیں کہ جنہوں نے سرکٹوادیئے، مگر جھکا ئے نہیں۔ واقعہ کربلا میں نواسہ رسول ﷺ حضرت امام حسینؑ نے اپنے پورے خاندان اہل بیت کو شہید کروالیا مگر ظلم کے سامنے ڈٹے رہے۔

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم

نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسماعیلؑ



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
الحمد لله الذي هدانا لهذا  
الذي كنا لنهتدي لولا أن هدانا الله



وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ  
وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ  
وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ



امام احمد بن حنبلؒ کو بادشاہ کے دربار میں کوڑے پڑ رہے تھے۔ یہ کوئی چھوٹی بات ہے؟ ایک لمحے کیلئے سوچو تو سہی۔ اس وقت مسلمان امت کے تمام علماء مصلحت پسند ہو گئے تھے۔ سوچئے کیا حالت ہوگی اس وقت۔ بڑے بڑے علماء کو یا تو شہید کر دیا گیا یا انہوں نے سمجھوتہ کر لیا۔ ایک واحد امام احمد بن حنبلؒ ہی باقی تھے پوری امت میں کہ جو ڈٹے رہے، اور قیامت تک کیلئے امت کو سنبھال گئے۔ امام مالکؒ کے بازو نکال دیئے گئے تھے، مگر انہوں نے بادشاہ وقت کے ظلم کا ساتھ نہیں دیا۔

جن بزرگوں کے آپ نام سنتے ہیں، ذرا ان کے حالات زندگی بھی پڑھیں۔ کسی کی زندگی پھولوں کی سیج پر نہیں گزری۔ سب ہی اپنے اپنے ادوار میں وقت کے بڑے بڑے فرعونوں کے سامنے سیدہ تانے کھڑے رہے۔ کسی کا بھی نام لیں۔ احمد بن حنبلؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام شاملؒ، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، بابا بلھے شاہؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ! یہ لوگ اسی طرح اپنی جانوں پر کھیل جایا کرتے تھے اور اس جرأت اور شجاعت کا مظاہرہ کرتے کہ آج عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں۔ یہ امت رسول ﷺ کے عشاق تھے۔ حضور ﷺ سے پیار اور عشق کرنے والے تھے، کیونکہ ان کو یہ احساس ذمہ داری تھا کہ آنے والی صدیوں کا بوجھ ہمارے کندھوں پر ہے۔ وہ اس احساس ذمہ داری سے ہی کانپ جایا کرتے۔

ایک بزرگ سے جب کہا گیا کہ میرے بیٹے کو شکر کھانے سے منع کر دیں، تو انہوں نے کہا دو تین دن بعد آنا۔ دو تین دن بعد جب بچے کو لایا گیا، تو وہ بزرگ بچے کو بولے کہ بیٹا شکر نہ کھایا کرو۔ لوگوں نے کہا کہ یہ بات تو آپ دو تین دن پہلے بھی کہہ سکتے تھے۔ ان بزرگ نے جواب دیا کہ اس وقت میں خود شکر کھایا کرتا تھا، پہلے میں نے خود شکر کھانی چھوڑی، اور اب میں اس قابل ہوں کہ اس بچے کو نصیحت کر سکوں۔

یہ لطافت، نفاست اور کردار تاثیر لے کر آتا ہے۔ اگر انسان منافق ہو، وہ بات کہے کہ جس پر خود عمل نہیں کرتا، تو اس کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ الفاظ میں سے تاثیر نکل جاتی ہے۔ اقبالؒ نے بھی اسی بات کا رونا روایا تھا:

پیرِ حرم کو دیکھا ہے میں نے

کردار بے سوز، گفتار واہی

جب امت کا زوال ہوتا ہے، تو لقب بڑے ہو جاتے ہیں، اور کردار چھوٹے۔ علماء سو کی تعداد بڑھ جاتی ہے، اور علمائے حق ناپید۔ قوم کی تربیت اور معاشرے کی ہدایت میں ان علمائے سُو کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔ ان کی آنکھوں میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی بات کرتے ہوئے آنسو نہیں آتے۔ ان کے پاس بیٹھ کر آپ کے دل میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ کیلئے محبت نہیں بڑھتی۔ امت کو متحد کرنے کے بجائے، یہ فرقوں، گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایمان فروش، دین فروش، ملت فروش! ان کی گفتگو واہی تباہی اور خرافات ہوتی ہے۔ اقبالؒ نے انہی علمائے سو پر شدید حملے کیے ہیں۔

مرد مومن کا کردار قاہرانہ ہوتا ہے۔ عراق پر حملے کے دوران، حضرت خالد بن ولیدؓ کے پاس ایک کافر آتا ہے اور ان سے کہتا ہے کہ آپ ہم سے کس طرح جنگ کر سکتے ہیں جبکہ ہماری تلواروں پر ایسا زہر لگا ہوا ہے کہ اگر آپ کے جسم کو چھو بھی جائے، تب بھی آپ ہلاک ہو جائیں گے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اس سے وہ زہر کی بوتل لی اور اللہ کا نام لیکر اس کو پی گئے، اور وہ زہر آپ کا بال بھی بیکانہ کر سکا۔ وہ کافر آپ کے ایمان کا یہ مظاہرہ دیکھ کر کانپنے لگا۔ حضرت عمرؓ دریائے نیل کو خط لکھتے ہیں اور وہ انکے حکم پر دوبارہ چلنے لگتا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ بپھرے ہوئے دریا کو حکم دیتے ہیں کہ مسلمانوں کے لشکر کا کوئی نقصان نہ ہو، اور پھر پورا لشکر دریا میں اتر جاتا ہے اور ایک سپاہی کا بھی معمولی سا نقصان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کے بندوں کا جلال صرف انسانوں پر ہی نہیں بلکہ پوری کائنات پر تصرف رکھتا ہے۔

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے

کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

وہ کیا راز تھے کہ اللہ کے بندوں کی آنکھوں میں اتنا جلال تھا کہ بڑے بڑے بادشاہ کانپتے تھے۔ حضور ﷺ کی سنت مبارکہ اٹھا کر دیکھیں۔ پیار کرنے والے آپ ﷺ سے ایسے فیض پا گئے کہ کوئی سیدنا ابوبکر صدیقؓ بن گئے، کوئی سیدنا عمرؓ بن گئے، کوئی سیدنا عثمانؓ بن گئے، کوئی سیدنا علیؓ بن گئے، کوئی سیدنا بلالؓ بن گئے۔ وہاں کفار کا حال یہ تھا کہ دہشت، رعب، دبدبے اور جلال سے ان کی جانیں نکلتی تھیں۔ وہ واقعہ آپ کو یاد ہے کہ جب ایک کافر تلوار لے کر حضور ﷺ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا اور کہا کہ اب آپ کو کون بچائے گا۔ حضور ﷺ نے اسکی طرف دیکھ کر صرف یہ فرمایا: ”میرا اللہ“۔ وہ کافر یہ سن کر خوف سے تھر تھرا کر کانپنے لگا۔ وہ کونسا رعب تھا؟ حضور ﷺ نے اپنی حدیث شریف میں فرمایا ہے کہ اللہ نے رعب سے میری مدد کی!

رعب بھی بندہ مومن کی ایک صفت ہوتی ہے، اس کا ہتھیار ہوتا ہے۔ بندہ مومن کا وجود رعب دار ہوتا ہے۔ اس کا ایسا کردار ہوتا ہے کہ اسکے آگے، اسکی مرضی کے بغیر، کوئی مذاق بھی نہیں کر سکتا، اسکی اجازت کے بغیر بے تکلف نہیں ہو سکتا، اس کی بارگاہ میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے ظالم اور جابر حکمرانوں کو جب بندہ مومن فقیر کہ جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے زمین پر بیٹھا ہوتا، نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہے تو ان کی جانیں نکل جاتی ہیں۔ ایوب خان پاکستان کا طاقتور فوجی حکمران تھا، لیکن وہ بھی تربیلا میں ایک فقیر کی جھونپڑی میں جا کر حاضری دیتا، اپنے لیے دعا کرواتا اور جب مصیبت پڑتی تو اللہ کے حضور انہی سے سفارش کرواتا۔

رازِ حرم سے شاید اقبال با خبر ہے

ہیں اس کی گفتگو کے اندازِ محرمانہ

جیسا کہ ہم نے کہا کہ اقبالؒ جگہ جگہ، اشارے کنایے میں، اپنا تعارف خود کرواتے جاتے ہیں۔ اقبالؒ کو صرف شاعر سمجھنے والے

شدید مغالطے کا شکار ہیں۔ اقبالؒ نہ صرف ایک رازدار فقیر ہیں، بلکہ روحانی ڈیوٹی پر بھی مامور ہیں۔ ایک اور مقام پر اقبالؒ اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں محرم راز درون خانہ ہوں، یعنی میں اندر کی ساری باتیں جانتا ہوں۔

اس وجود کے یقین اور اعتماد کا اندازہ کریں کہ جس کو معلوم ہو کہ اسکی سرکار ﷺ سے یاری ہے۔ حضور ﷺ کے دربار میں اسکی سنی جاتی ہے۔ حضور ﷺ اسکا انتظار فرماتے ہیں، اسکا ذکر کرتے ہیں، اسکی درخواستیں اور سلام آپ ﷺ کو پیش کیے جاتے ہیں، وہ حضور ﷺ کے دربار میں نوٹ کیا جاتا ہے، مسجد نبویؐ میں اسکے لیے دعائیں کی جاتی ہیں، حضور ﷺ کے روضہ پاک پر اس کی حاضری قبول کی جاتی ہے! کائنات میں اس سے بڑی کوئی اور سعادت ہو سکتی ہے؟

ایسے ”صاحب لولاک“ آج بھی ہوتے ہیں۔ اقبالؒ یہ باتیں آپ لوگوں کیلئے اس لیے بتا رہے ہیں کہ آپ میں بھی اس مقام کو حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہو۔ یہ قوت اور طاقت آپکی دسترس میں ہے، آپکی زد میں ہے، آپکی رسائی میں ہے، اگر کمی ہے تو صرف یقین کی۔ اقبالؒ یہی یقین آپکو دینا چاہتے ہیں اور جب یہ یقین ایک بندہ مومن کو حاصل ہو جائے تو پھر، نظر آتی ہے اسکو اپنی منزل آسمانوں میں۔

لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ یہ مقامات ہم کیسے حاصل کریں؟ ایک بندہ اپنے آقا کا ہر از کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب بھی اقبالؒ دیتے ہیں:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی

کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

جب عشق آپ کو یہ سکھاتا ہے کہ اپنے آپ کو تلاش کیسے کیا جاتا ہے، جب انسان اپنے نفس کی معرفت حاصل کر لیتا ہے، قلب کی آنکھ سے دیکھنا شروع کرتا ہے، تب ایک بندہ غلام پر بھی کائنات کا شہنشاہ اپنے راز کھولنا شروع کر دیتا ہے۔ بڑے بزرگوں کا قول ہے کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا، اس نے اپنے رب کو پہچانا۔ اللہ کو پہچاننے کا دروازہ اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے۔ اقبالؒ جب اس راز کو پا گئے تو پھر سب کچھ اپنے قلب میں پایا۔

جنہیں میں ڈھونڈتا تھا آسمانوں میں زمینوں میں

وہ نکلے میرے ظلمت خانہ دل کے مبینوں میں

”قلب مومن عرش اللہ“۔ مومن کا قلب اللہ کا عرش ہوتا ہے۔ یہ ساری باتیں جو بزرگوں نے کی ہیں، ان کی حکمت قرآن اور احادیث مبارکہ سے لی گئی ہے۔ لیکن یہ آداب سیکھے جاتے ہیں۔ اسکے لیے عشق کی آخری حدیں چاہیے ہوتی ہیں۔ عشق کسے کہتے ہیں؟ عشق کی سب سے خوبصورت صفت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو فنا کرنے والا ہوتا ہے۔ نامور فارسی شاعر حافظ کا ایک جملہ ہے۔

مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے!

العشق نار فی القلوب احرقت ماسوی المحبوب

عشق دل میں بھڑکنے والی ایسی آگ ہے کہ جو محبوب کے سوا ہر چیز کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔

انسان خود کو اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر فدا کر دیتا ہے۔ عاشق اپنے محبوب کے سوا کچھ طلب نہیں کرتا، عاشق خواہش نہیں کرتا، محبوب کی مرضی پر ہوتا ہے۔ عاشق آتا ہی اس لیے ہے کہ بتائیں سر کب کٹوانا ہے۔ وہ آتا ہی اس لیے ہے کہ بتائیں، جان، مال، عزت و آبرو کب اور کہاں قربان کرنی ہے۔ وہ قربان کر کے آتا ہے، قربان ہونے آتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے الفاظ سوچئے کہ جو وہ حضور ﷺ سے ملتے وقت کہتے تھے۔

”فداک امی وابی یا رسول اللہ ﷺ“ (آپ ﷺ پہ میرے ماں باپ قربان)۔ یہ عاشق ہوتے ہیں۔

اس پر اقبالؒ نے یہ بات کی تھی۔

جس کا عمل ہے بے غرض، اسکی جزا کچھ اور ہے

حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

ایک عمل جنت کی لالچ میں ہوتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ جنت دے گا۔ اچھی نیت ہے، ٹھیک ہے۔ مگر وہ ایک عام سطح ہے۔ ایک عمل اس لیے ہوتا ہے کیونکہ انسان کو دوزخ کا خوف ہوتا ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ مگر وہ بھی عام سطح ہے۔ عاشق کی نیت یہ ہوتی ہے کہ مالک! میں قربان آپ پہ۔ میں اللہ کے رسول ﷺ پہ قربان۔ مجھے اسکی پرواہ نہیں ہے کہ آپ مجھے کیا اُجڑ دیتے ہیں، مجھے صرف اپنے آپ کو آپ پر فدا کرنا ہے۔

رابعہ بصریؒ کا وہ مشہور واقعہ یاد کریں کہ جب وہ ایک ہاتھ میں پانی اور دوسرے میں آگ لیے جا رہی تھیں۔ لوگوں نے پوچھا رابعہ! کدھر؟ بولیں کہ اس پانی سے میں اس آگ کو بجھاؤں گی، کہ جس کے خوف سے لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اس آگ سے اس جنت کو جلاؤں گی، کہ جس کے لالچ میں لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اللہ کے بندو! اللہ کی عبادت اس کے عشق اور پیار میں کرو۔

جنت کی نیت رکھنا حرام نہیں ہے۔ لیکن وہ ابتدائی سطح ہے۔ جب آپ وہ مقام چاہتے ہیں کہ جہاں غلاموں پر اسرار شہنشاہی کھلنے لگتے ہیں، جب آپ کی نگاہ سے دل سینوں میں کانپنے لگتے ہیں، تو پھر اسکے تقاضے اور ہوتے ہیں، اسکا نصاب اور ہے، اسکے لیے ادب اور عشق کی آخری حد تک جانا پڑتا ہے۔

بے خطر کوڈ پڑا آتش نمرود میں عشق

عقل ہے محو تماشا لبِ بامِ ابھی

وہی ابراہیمؑ کہ جن کو اللہ تعالیٰ نے اتنی مشکل سے بڑھاپے میں اولاد دی، ان کو حکم ہوا کہ اسکورگستان میں چھوڑ کر چلے جاؤ۔ یہ انسان کی عقل میں آنے والی بات نہیں۔ پھر جب وہ بیٹا جوان ہوتا ہے تو پھر حکم ہوتا ہے کہ اب اسکو ذبح کر دو۔ یعنی کوئی ایسی آزمائش نہیں تھی کہ جو اللہ نے ابراہیمؑ پر نہ ڈالی ہو۔ اس تیرہ چودہ سال کے بیٹے کی سعادت مندی دیکھئے، کہتے ہیں: ”ابی آپ کو جو حکم ہوا ہے، وہ کر ڈالیئے۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے۔“ بیٹے نے یہ نہیں کہا کہ آپ کو یہ کیا حکم دیا گیا ہے۔ لوگ حیران ہوتے ہیں۔ یہ سارا سلسلہ کیسے ہوا؟ کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزند سکھائے؟

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزند

اللہ تعالیٰ کو اپنے عاشقوں کی یہ ادائیں بہت پسند آئیں۔ آج آپ جو حج و عمرہ ادا کرتے ہیں، تو نوٹ کیجئے کہ یہ تمام حج و عمرہ اللہ کے ایک عاشق خاندان کی اداؤں کا نام ہے۔ وہی گھر، جس کی تعمیر اور طواف ابراہیمؑ نے کیا، آپ بھی اسی گھر کا طواف کرتے ہیں۔ بی بی حاجرہ اپنے بیٹے کی محبت میں صفا و مروہ کے درمیان دوڑیں۔ آج وہ دوڑ نا واجب ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ وہاں ایک عاشق دوڑی تھیں۔ عاشق کی ادائیں ضائع نہیں جاتیں۔ اگر آپ صفہ و مروہ کے درمیان دوڑیں گے نہیں، تو عمرہ نہیں ہوگا۔ آپکا حج نہیں ہوتا اگر آپ سیدنا اسماعیلؑ کی یاد میں قربانی نہ دیں۔ آج بھی منی میں جائیے۔ جہاں خیمے لگے ہیں، وہاں پہاڑ کے اوپر ایک چھوٹی سی نشانی رہ گئی ہے، وہ مقام کہ جہاں اسماعیلؑ کو لٹا کر ابراہیمؑ نے چھری پھیری تھی اور اللہ نے وہاں دنبہ بھیج دیا تھا۔ ہماری پوری شریعت، ہمارا دین، ہمارا حج و عمرہ، دین ابراہیمی کہلاتا ہے۔ یہ ایک خاندان کے افراد کی اداؤں کا نام ہے۔ جو مزمل آپ پیتے ہیں، وہ بھی اسماعیلؑ کی ایڑیوں کی برکت ہے۔ عشق کے معاملے ہی اور ہوتے ہیں، نصاب ہی مختلف ہوتا ہے۔

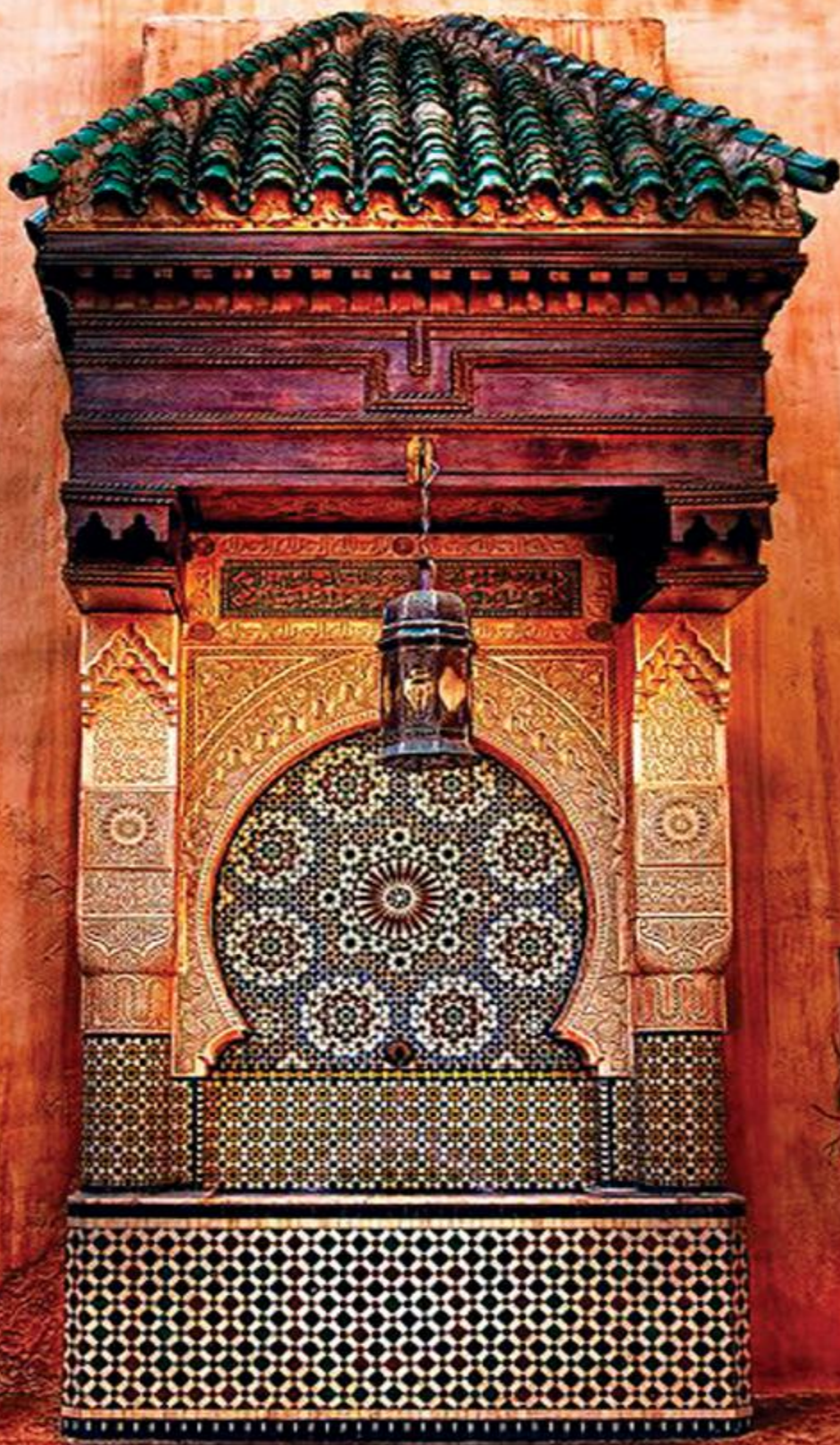
عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو

کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

عشق کے سفر کی خواہش آسان ہے، اس پر چلنا انتہائی کٹھن۔ فرید الدین عطارؒ ہوں، جلال الدین رومیؒ ہوں، رازیؒ ہوں یا غزالیؒ، یعنی چاہے روحانی جہت کے لوگ ہوں یا عقل کی جہت کے۔ چاہے فلسفی ہوں یا ڈاکٹر، چاہے عالم ہوں یا صوفی، کسی کے ہاتھ کچھ نہیں آتا، جب تک کہ وہ رات کے اندھیرے میں، تہجد کے وقت اپنے رب کے حضور خشیت اور عاجزی کے ساتھ حاضری نہ دیں۔

آپ کو نصاب دیا جا رہا ہے۔ یقین کریں اقبالؒ جو کچھ بھی لکھ رہے ہیں، اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے سے بھی لکھ رہے ہیں اور قرآن





کی آیتوں کی تشریح بھی کر رہے ہیں۔ ”یا ایہا المزمّل“۔ سورۃ مزمل میں ہے کہ رات کو اٹھو، قرآن پڑھو۔ قرآن میں تہجد کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ کے بندوں کی پانچ نمازیں نہیں ہوتیں۔ اللہ کے بندوں پر چھ نمازیں فرض ہوتی ہیں۔ تہجد بھی ان کے لیے لازم ہوتی ہے۔ اللہ نے تو صرف ہدایت کی ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ تہجد پڑھو، شاید اللہ تمہیں مقام محمود پر فائز کر دے۔ مقام محمود وہ روحانی مقام ہے کہ جس کے بعد اللہ کا بندہ، اللہ کا رازدار بن کر، اس کا دست قدرت بن کر، غالب و کار آفریں، کار کشا اور کار ساز بن جاتا ہے۔

یہ بندہ مومن کیلئے تحفے ہیں کہ جو حضور ﷺ کی برکت اور فیض کی وجہ سے آج تک جاری ہیں۔ اگر آپ بھی کوئی مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ رازی، رومی اور عطار جیسا کوئی مقام حاصل کریں، تو پھر رزق حرام نہ کھائیں، کسی سے بھیک نہ مانگیں، اپنی عزت نفس کو پامال نہ کریں، اپنے آپ کو بے عزت، بے توقیر نہ کریں، اپنے نفس کو سوانہ کریں۔ جو اپنے نفس کا احترام کرتا ہے، اپنی خودداری اور غیرت کا لحاظ کرتا ہے، پھر اللہ بھی اس کا لحاظ کرتا ہے کہ اللہ سخت غیرت والا ہے۔

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ

ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد الہی

بڑے بڑے بادشاہ مثلاً دارا، سکندر، ان سے وہ مرد فقیر بہتر ہے کہ جو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر جھونپڑی میں بیٹھتا ہے اور جس کی فقیری میں سے حضرت علیؑ کے فقر کی خوشبو آتی ہے۔ اس کا مقام زیادہ ہے، اس کا جلال و جمال زیادہ ہے، اس کا کمال زیادہ ہے۔ ان بزرگوں کے واقعات آپ کو معلوم ہیں۔ روزہ رکھا ہوا ہے، افطار کے وقت ایک روٹی پاس ہے۔ جیسے ہی اذان ہوتی ہے، کوئی سوال کرنے والا آ جاتا ہے۔ حضرت علیؑ اس کو اپنے حصے کی روٹی دے دیتے ہیں اور خود پانی یا نمک سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ اگلے دن پھر یہی واقعہ ہوتا ہے اور اس سے اگلے بھی۔ یہ انسان کی عقل میں آنے والی باتیں نہیں ہیں۔ یہ کس قسم کے درویش، فقیر تھے!

آئینِ جواں مرداں، حق گوئی و بیباکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اللہ جن فقیروں سے کام لیتا ہے، ان کا کردار اس بات پر گواہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے اس ڈیوٹی پر مامور کیے گئے ہیں۔ وہ صادق اور امین ہوتے ہیں، شیر اور دلیر ہوتے ہیں، خوددار اور غیر متند ہوتے ہیں، پاک دل اور پاکباز ہوتے ہیں اور راست گواہ اور

راست باز ہوتے ہیں۔

کسی ایک صفت کو پکڑ لیں کہ جو بندہ مومن کی ہو، اللہ آپ کے وجود میں دیگر خصوصیات بھی پیدا کرنا شروع کر دے گا۔ حضور ﷺ کے پاس ایک آدمی آیا کہ میرے بہت سے گناہ ہیں، میں کس کو چھوڑوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم یوں کرو کہ صرف جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔ اس کے بعد اسکی نمازیں بھی شروع ہو گئیں اور دیگر گناہ بھی ختم ہو گئے۔ کیونکہ ہر وقت یہی خیال رہتا تھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ جھوٹ نہیں بولنا۔ کوئی پوچھے گا اور میں کہوں گا کہ ہاں میں یہ گناہ کرتا ہوں، تو شرمندگی ہوگی۔ اسی شرمندگی کے خوف سے ایک ایک کر کے اس نے اپنے تمام گناہ ترک کر دیئے۔

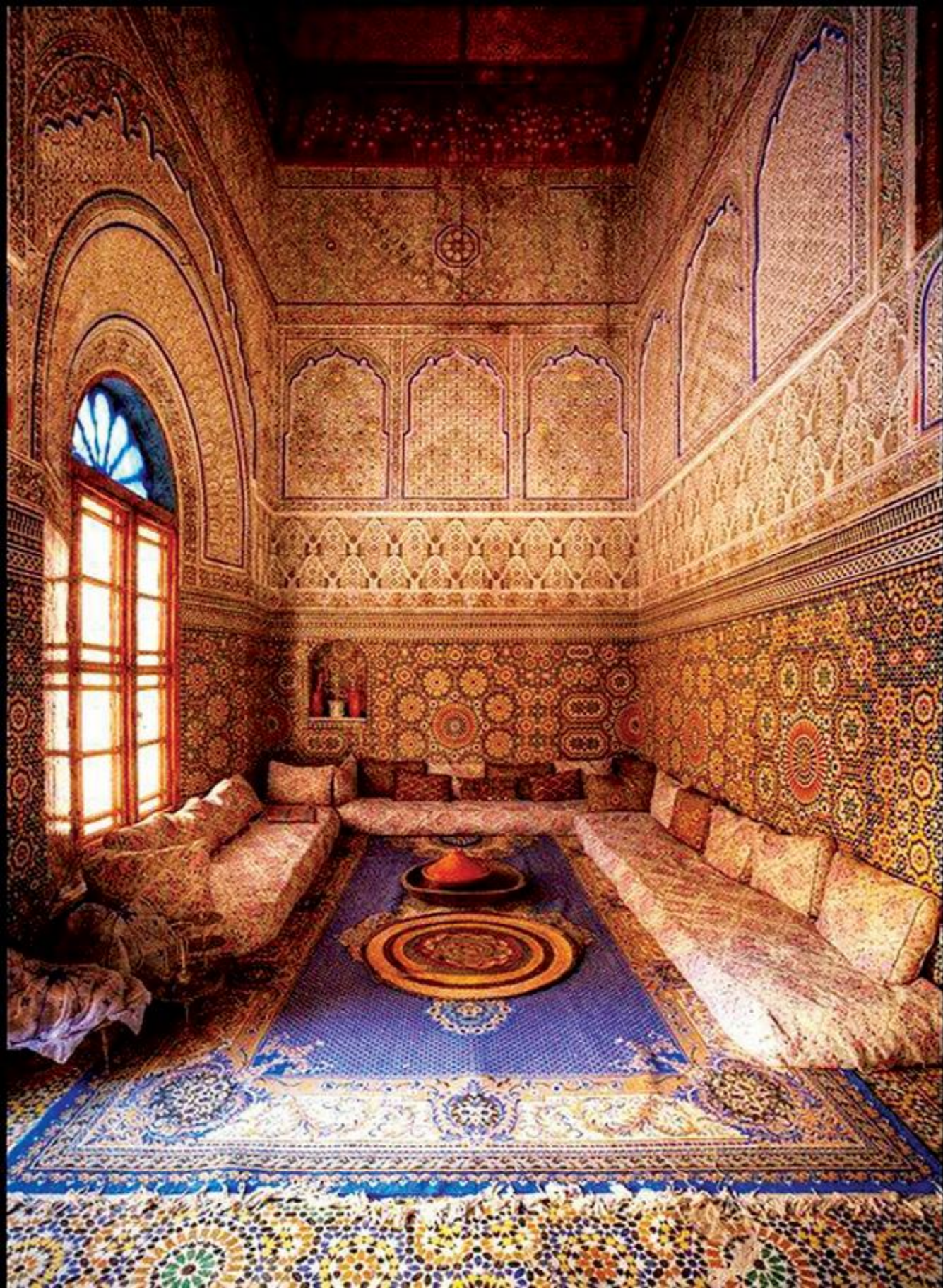
اسی طرح آپ بھی کسی ایک صفت کو اپنالیں۔ جرأت کو لے لیں، بے باکی کو لے لیں، غناء کو لے لیں، سخاوت کو لے لیں، سچائی کو لے لیں، رزق حلال کو لے لیں، اور پھر اس کا حق ادا کریں۔ آج کے دور میں اگر کسی ایک صفت پر بھی سچائی سے عمل کریں گے، تو ایسے ہی محسوس ہوگا کہ جیسے انگاروں کو ہاتھ میں پکڑا ہوا ہو۔

اللہ اور اسکے رسول ﷺ کردار کی بلندی اور اعلیٰ اخلاق کی انتہائی قدر کرتے ہیں، چاہے کافروں میں ہی کیوں نہ ہوں۔ حاتم طائی اپنی سخاوت کی وجہ سے مشہور تھے، مگر ایمان لانے سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔ انکی بیٹی حضور ﷺ کے پاس تشریف لائیں۔ حضور ﷺ نے ان کی بیٹی کو بہت عزت دی، اور حاتم طائی کی بہت تعریف فرمائی اور فرمایا کہ تمہارے باپ میں مومنوں کی صفات تھیں۔

اللہ تعالیٰ کو غیر تمند لوگ پسند ہیں۔ جرأت کردار پسند ہے۔ بے غیرتوں اور بے شرموں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ کوئی بھی ایک صفت اپنے اندر ایسی پیدا کر لیں کہ دنیا مثال دے کر کہے کہ اگر جرأت دلیری یا سچائی کی مثال دیکھنی ہے تو اس وجود کو دیکھ لو۔ یقیناً اللہ آپ کو اپنی ذمہ داری کیلئے چن لے گا۔ حضور ﷺ کو نبوت کی ذمہ داری بعد میں دی گئی ہے، آپ ﷺ صادق اور امین پہلے کہلاتے تھے۔ اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی، اگر آج آپ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ آپ کو اس دین کے عروج کا ذریعہ بنائے تو پہلے اپنے کردار کو عروج دیں، اللہ آپ کو چن لے گا!











## زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا

اللہ تعالیٰ اپنے کام کیلئے شیروں اور دلیروں کا انتخاب کرتا ہے۔ اقبالؒ بندہء مومن کی جو صفات بیان فرماتے ہیں، ہم انہی صفات کے حوالے سے اپنی بات کو جاری رکھیں گے۔ وہ پراسرار وجود کہ جنہیں اقبالؒ کبھی بندہء مومن، کبھی مرد قلندر، کبھی درویش، کبھی فقیر غیور، کبھی شاہین شہہ لولاک، فرماتے ہیں، ان کی صفات کیا ہیں؟ جب یہ نوجوان نسل اس نور، اس فیض کی وارث ہو جائیگی، تو یہ وہ وقت ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ اس سے کام لینے کا فیصلہ فرمائے گا۔

بندہء مومن کی پہلی پہچان ہی اس کے اچھے اخلاق ہوتے ہیں۔ دین آیا ہی مکارم اخلاق کی تکمیل کیلئے ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص بندہء مومن بھی ہو اور بد اخلاق بھی۔ آج کے دور کے علماء پر اقبالؒ طنز کرتے ہوئے یہ سوال کرتے ہیں کہ لوگ مسجدوں میں کیوں نہیں جا رہے؟ نوجوان نسل علماء سے کیوں دور ہو گئی، اور پھر خود ہی جواب بھی دیتے ہیں:

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانے میں

فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مردِ خلیق

صرف بات یہ ہے کہ جو شراب پلا رہا ہے، اس کے اخلاق بھی اچھے ہیں اور وہ عالی ظرف بھی ہے! کتنا بڑا طنز ہے! یہ امت کے زوال کی حد ہے۔ حضور ﷺ کی ایک حدیث مبارکہ ہے کہ جس کا مفہوم ہے کہ آخری دور میں فتنے علماء سے اٹھا کریں گے اور علماء میں ہی داخل



ہو جائیں گے اور آسمان کے نیچے بدترین مخلوق علماء ہونگے۔ آج کے علماء میں اکثریت علمائے سوکی ہے، خاص طور پر پاکستان میں سارا فتنہ پھیلانے والے یہی علمائے سو ہیں، چاہے سیاست میں ہوں یا دہشت گردوں کی صف میں۔ پاکستان کے خلاف خودکش حملوں کو جائز قرار دے رہے ہیں، خودکش حملہ آور تیار کیے جا رہے ہیں، فرقہ وارانہ کفر کے فتوے ہیں، تکفیر ہے۔ آج کے دور کے خارجی پوری امت مسلمہ کو کافر قرار دے کر مردوں، عورتوں اور بچوں کو ذبح کرنا جائز قرار دیتے ہیں، ظلم اور فساد مچاتے ہیں اور علمائے سو کا حال یہ ہے کہ اس فساد پر نہ صرف خاموش رہتے ہیں بلکہ اسکو پھیلانے میں بھی حسب استطاعت اپنا حصہ ڈالتے رہتے ہیں۔ بڑی بڑی مذہبی جماعتوں کے سربراہ علمائے سو ہیں کہ جو سیاست اور حکومت میں اتنے ہی حصہ دار ہیں جتنے کہ دوسرے سیاستدان، اور اتنے ہی خائن ہیں کہ جتنے دیگر قومی حکمران۔ دین اور شریعت کے نام پر دھبے، ان علمائے سو کی پہچان ہی خیانت اور بد اخلاقی ہے۔

ہمارے بہت سے دوست جو ظاہر اُشریعت کے مطابق زندگی گزارتے ہیں کہ جن کی داڑھیاں ہیں، خود ہم سے کہتے ہیں کہ اب تو اس داڑھی پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ اب علمائے سو اور دہشت گرد خارجیوں نے شریعت اور داڑھی کو اتنا بدنام کر دیا ہے کہ ہم جہاں بھی جاتے ہیں، لوگ ہمیں شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ کہیں یہ خودکش حملہ آور تو نہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ معاشرہ تباہ ہو جائے اور علمائے حق وہاں موجود ہوں؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ معاشرے تباہ ہوتے ہیں کہ جب علماء خائن ہو جاتے ہیں۔ مچھلی ہمیشہ سر کی طرف سے سڑتی ہے۔ علماء عوام کے پیچھے نہیں چلا کرتے، بلکہ عوام کو اپنے پیچھے چلاتے ہیں۔ اگر عوام آپے سے باہر ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علماء اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہے۔

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے

اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام!

.....

علاجِ ضعفِ یقین ان سے ہو نہیں سکتا

غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

رازی مسلم دنیا کے ایک بہت بڑے سائنسدان، فلسفی، ماہر فلکیات اور ریاضی دان تھے، لیکن رازی روحانی طبیب نہیں تھے۔ اقبالؒ کہتے ہیں کہ رازی گو کہ بہت مشکل اور دقیق مسائل بیان کرتے ہیں (آج کی جدید دنیا کی ترقی پر بھی ایک طنز ہے)، مگر یہ سب باتیں ایک عام مسلمان کے کمزور ایمان کا علاج نہیں کر سکتیں۔ جب تک کہ حکیم خود ایک روحانی وجود نہ ہو، وہ روحانی بیماریوں کا علاج نہیں کر سکتا۔ اقبالؒ آج کے دور کے علماء، کفر کے فتوے اور فرقہ واریت سے سخت مایوس تھے۔

مرے لیے تو ہے اقرار بالکسایں بھی بہت

ہزار شکر کہ ملا ہیں صاحب تصدیق

اقبالؒ فرماتے ہیں کہ میں تو سیدھا سادھا مسلمان ہوں۔ اگر کوئی میرے سامنے آ کر یہ کہے کہ میں مسلمان ہوں، تو میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ پھر اس بات پر طنز کرتے ہیں کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ جب تک ملا تصدیق نہ کرے، تمہارا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ امت میں زوال ہی اسی وجہ سے آیا ہے، کہ علماء کو اپنے ایمان کی خبر نہیں اور دوسرے مسلمانوں پر کفر و ایمان کے فتوے چسپاں کرتے رہتے ہیں۔ ہر فرقے کو یہ دعویٰ ہے کہ وہی ناجی اور باقی سب جہنمی، مگر حقیقت دیکھو تو ہر فرقے کے علماء میں بد اخلاق بھی ہیں اور بد کردار بھی، خائن بھی اور منافق بھی اور پھر بھی یہ زعم کہ ان کے علاوہ کوئی اور جنت میں نہ جائیگا۔

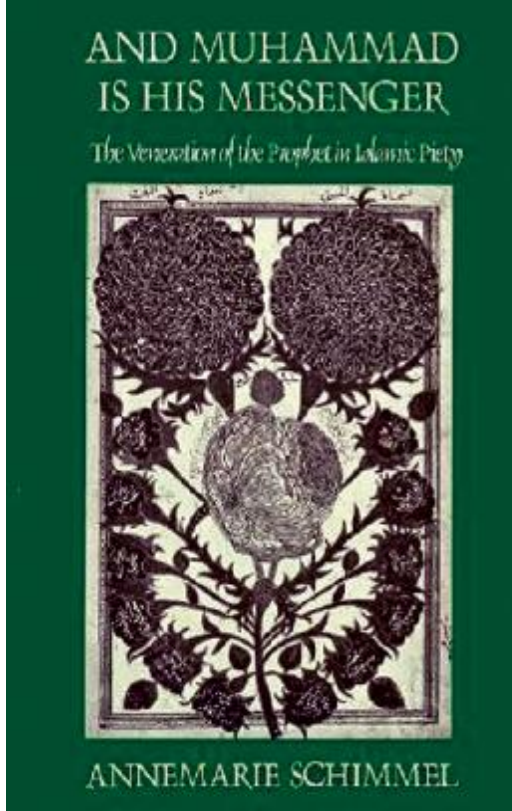
اقبالؒ کے نزدیک مسلمانی نام ہی عشق رسول ﷺ کا ہے، ادب رسول ﷺ کا ہے، اخلاق رسول ﷺ پر عمل کرنے کا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اقبالؒ کے نزدیک مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے والا بھی ”کافر و زندیق“ ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

نہ ہو تو مردِ مسلمان بھی کافر و زندیق

اس کی ایک بہت خوبصورت مثال آج کے دور میں دیکھ لیجئے۔ ایک خاتون کہ جن کو لوگ ظاہری طور پر ”کافر“ کہتے ہیں، مگر ہم کہتے ہیں کہ وہ اللہ کی ولی تھیں، ڈاکٹر این میری شمل۔ آپ میں سے کچھ لوگوں نے شاید ان کا نام بھی نہ سنا ہو۔ آج سے چند سال پہلے، تقریباً نوے سال کی عمر میں، جرمنی میں ان کا انتقال ہوا۔ علامہ اقبالؒ، مولانا جلال الدین رومیؒ، اسلامی روحانیت پر پوری دنیا میں مانی ہوئی سکالر تھیں۔ اسرار روحانی کی بہت بڑی رازدار اور بہت بڑی مستشرق۔ علامہ اقبالؒ کی عاشق، مولانا رومیؒ کی عاشق اور حضور ﷺ کی عاشق۔ وہ بظاہر عیسائی تھیں، مگر ایسی عیسائی کہ جو عشق رسول ﷺ میں رویا کرتی تھیں۔ کیا آپ ان کو کافر کہیں گے؟ این میری شمل ہماری ذاتی دوست بھی تھیں۔ جب پاکستان آیا کرتیں تو ہماری ان کے ساتھ بڑی محفلیں ہوتی تھیں۔ ہم بیٹھتے اور حضور ﷺ کے عشق، اقبالؒ اور پاکستان پر ان سے اتنی خوبصورت باتیں ہوتیں کہ ہمیں کوئی شبہ نہیں ہے، کہ ظاہری طور پر چاہے انہوں نے دنیا کے سامنے اعلان نہ کیا ہو، لیکن ان کے قلب و نگاہ اور وجود نہ صرف مسلمان تھے بلکہ وہ اللہ کی ایک ولی بھی تھیں۔

ان کا ایک واقعہ ہمیں ایک عینی شاہد نے سنایا۔ کسی نے ایک مرتبہ انہیں کوئی تحفہ پیش کیا۔ ایک فریم تھا کہ جس میں حضور ﷺ کی شان میں عربی کی مشہور نعت لکھی ہوئی تھی۔ ”بلغ العلیٰ بکمالہ .....“۔ این میری شمل نے کئی لوگوں کی موجودگی میں اس تحفے کو قبول کیا اور اسے اپنے ماتھے سے لگا کر خاموش کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے وہ فریم اپنی آنکھوں پر بہت دیر تک لگائے رکھا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر



این میری شمل اور ان کی تصنیف

کھڑی رہیں۔ اور جب انہوں نے وہ فریم اپنے چہرے سے ہٹایا تو دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ وہ فریم آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ اس زار و قطار عشق رسول ﷺ میں روئیں۔

جن لوگوں نے این میری شمل کے خطبات سنے ہیں (آپ یوٹیوب youtube پر تلاش کریں شاید آپ کو کچھ لیکچرز مل جائیں)، وہ یہ جانتے ہیں کہ شمل جب اسلام پر قرآن پر اور عشق رسول ﷺ پر بات کرتی تھیں تو آنکھ بند کر کے کھڑی ہو جاتیں اور کسی اور ہی دنیا میں چلی جاتی تھیں۔ وہ خاتون آنکھ کھول کے لیکچر نہیں دیتی تھیں۔ ایک علم کا دریا تھا کہ جوان کے وجود سے بہتا تھا۔ انسان کی عقل وہاں حیران رہ جاتی ہے۔ درجنوں کتابیں لکھیں انہوں نے اسلامی تصوف پر۔ این میری شمل کی ایک بہت خوبصورت تصنیف ہے: "And Muhammad is His Messenger" کہ جس میں انہوں نے چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں حضور ﷺ کی شان میں، جہاں جہاں بھی مسلمانوں نے کوئی کام کیا ہے، اس کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ لاہور میں ایک سڑک بھی ہے این میری شمل کے نام سے، لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ وہ جو ہر سال پاکستان آیا کرتی تھیں اور مغربی دنیا میں جنہوں نے سب سے زیادہ محبت، عزت اور پیار سے مسلمانوں کو، اسلام کو اور حضور ﷺ کو پیش کیا، آج پاکستانی نوجوان نسل، ہماری قوم، این میری شمل کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ شمل کو جب بھی ہم دیکھتے تھے، تو اقبال کا یہ شعر سمجھ میں آتا تھا۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

اور ہم نے یہاں ایسے ایسے مسلمان بھی دیکھے ہیں، استغفر اللہ العظیم، کہ ان سے بڑا گستاخ رسول ﷺ شاید کوئی کافر بھی نہ ہو۔ یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور حضور ﷺ کی شان میں اتنے سخت کلمات کہتے ہیں، گستاخی اور بے ادبی کرتے ہیں کہ وہ ہر آنہ تو دور کی بات، وہ کلمات سن کر ہی انسان کی روح کانپ اٹھتی ہے۔ حضور ﷺ کے معاملے میں قرآن میں یہ آیت ہے کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اگر حضور ﷺ کے سامنے آواز بھی اونچی کی تو۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک وعید اس آیت کے اگلے حصے میں ہے کہ جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور انہیں اس کی خبر ہی نہیں ہوگی! یعنی لوگوں کو اندازہ ہی نہیں ہوگا کہ کس گستاخی کی بنیاد پر وہ دنیا اور آخرت میں ہلاک ہو چکے ہیں، ان کے اعمال ضائع ہو چکے ہیں، اور وہ پھر بھی اس تکبر میں ہی مبتلا رہیں گے کہ ان کے علاوہ کوئی اور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

یاد رکھیے گا کہ یہ آمیتیں مسلمانوں کیلئے آئی ہیں، کافروں کیلئے نہیں! بہت مسلمان ہونگے کہ جن کے اعمال اسی وجہ سے ضائع ہو جائیں گے کہ وہ حضور ﷺ کے معاملے میں بے ادب، غیر محتاط اور گستاخ تھے۔ خاموش ہو جانا بہتر ہے، مگر حضور ﷺ کے معاملے میں کوئی کمزور بات نہیں کہنی چاہیے۔



## سوالات و جوابات

سوال: آج جو کچھ اولیاء اللہ کہتے ہیں، کیا ہم اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام سمجھ سکتے ہیں؟

جواب: حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ اور سنت مبارکہ میں جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ اللہ کا پیغام ہی ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ اور قرآن کی آیتوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ سیدہ عائشہ طاہرہؓ سے ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ حضور ﷺ کے اخلاق کیسے ہیں، آپؐ نے فرمایا کہ کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا! ظاہری طور پر جتنا قرآن پر عمل ہو سکتا ہے، وہ حضور ﷺ نے کر کے دکھا دیا۔ اسی طرح اللہ کے بھیجے ہوئے فقراء اور اولیاء، کہ جو وقت کے درویش، ابدال اور قلندر ہوتے ہیں، جو صاحب راز ہوتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کوئی ذمہ داری دیتا ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ شیطان سے محفوظ کرتا ہے، جب وہ کوئی خوشخبری دیتے ہیں، کوئی نصیحت کرتے ہیں، کوئی تنبیہ کرتے ہیں، کوئی عمل کرتے ہیں، تو وہ بات لازماً قرآن و سنت کی حدود کے اندر ہی ہوتی ہے اور اللہ کی طرف سے اشارہ ہوتی ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اولیا اللہ کی کوئی بات قرآن و سنت اور شریعت کی حدود سے باہر ہو، مگر یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ سننے والے کی عقل اس کی حکمت اور گہرائی کا احاطہ نہ کر سکے۔ قرآن پاک میں حضرت خضرؑ اور موسیٰؑ کا واقعہ اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ حضرت خضرؑ کا کوئی عمل اللہ









کے حکم سے باہر نہیں تھا، مگر اس کی حکمت موسیٰ کو اس وقت تک سمجھ نہیں آئی کہ جب تک خود حضورؐ نے اس کو واضح نہ کیا۔

اللہ کے نبیوں نے جو باتیں کہی ہیں، وہ اللہ ہی کی طرف سے کہی گئی ہیں۔ جو تنبیہ اور خوشخبریاں دی ہیں، وہ اللہ ہی کی طرف سے دی ہیں۔ اللہ کے ولیوں کی بھی یہی شان ہے کہ وہ اللہ کے راز دار ہوتے ہیں۔ اللہ کے ولیوں کی بے ادبی اور گستاخی سے احتراز کرنا چاہیے۔ وہ ”رجل الصالحین“، (اللہ کے صالح بندے) ہوتے ہیں۔ ان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اللہ کے جن تمام نیک بندوں، علماء اور اولیاء کا فیض دنیا میں جاری ہے، وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس خدمت کو قبول کر لیا ہے۔ جس خدمت کو اللہ قبول کر لے، تو پھر اس کا فیض امت میں پھیلا دیا جاتا ہے، اس سے خیر نکلتی رہتی ہے، امت ہدایت پاتی رہتی ہے اور یہ اس فقیر کیلئے صدقہ جاریہ بن جاتا ہے۔ یہ سب قبولیت کی نشانیاں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعایا د کریں ”رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا.....“۔ ابراہیمؑ بھی اللہ تعالیٰ سے درخواست کر رہے ہیں کہ ان کو، انکی محنت کو، انکی اولاد کو، اللہ کے حضور قبول کر لیا جائے۔ اللہ نے اس دعا کو قبول کرتے ہوئے قیامت تک کیلئے جس دین کو جاری کر دیا اس کو دین ابراہیمی کہتے ہیں۔ یہ ہوتی ہے قبولیت!

جو خوشخبریاں اور ہدایت آپؐ تک اقبالؒ کی شاعری کے ذریعے پہنچ رہی ہیں، وہ بھی اللہ کی طرف سے پیغامات ہیں اور اللہ تعالیٰ کے حضور اقبالؒ کی قبولیت کی دلیل!

نکلی تو لب اقبال سے ہے، کیا جانے کس کی ہے یہ صدا  
پیغام سکوں پہنچا بھی گئی، دل محفل کا تڑپا بھی گئی

سوال: یقین کیا ہے؟

جواب: جس طرح قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے قلب کے مختلف درجات بتائے ہیں، قلب منیب، قلب سلیم، قلب شہید۔ اسی طرح نفس کے بھی مختلف درجات ہیں۔ نفس امارہ، نفس لوامہ، نفس مطمئنہ۔ اسی طرح یقین کے بھی تین درجات ہیں۔ یہ تینوں بھی قرآن میں استعمال ہوئے ہیں۔ ایک طرف علم الغیب ہے، ایمان بالغیب ہے۔ قرآن شروع ہوتا ہے ”یومنون بالغیب“ سے، کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ یہ شروع کا درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے بعد تین درجات قرآن میں بیان فرماتا ہے۔ پہلا ہے ”علم الیقین“۔ اسکی مثال یہ ہے کہ اگر آپؐ ہم پر اعتبار کرتے ہیں، اور ہم آپؐ سے یہ کہیں کہ باہر ایک گاڑی کھڑی ہوئی ہے، تو آپؐ ہماری بات پر یقین کر لیں گے۔ آپؐ کو اس بات پر شک نہیں ہوگا۔ یہ علم الیقین کا درجہ ہے۔ یقین کا ایک مقام کہ جس میں آپؐ کو یقین ہے کہ اس بات کا بتانے والا سچا ہے، صادق اور امین ہے۔ حضور ﷺ نے جو بات فرمائی ہے وہ اتنی سچی ہے کہ کسی کو نظر آئے یا نہ آئے، سمجھ آئے

یٰٰنہ آئے، مگر چونکہ آپ ﷺ نے فرمائی ہے، لہذا سچ ہے۔ یہ یقین کا پہلا درجہ ہے۔

دوسری کیفیت یہ ہے کہ آپ خود باہر نکل کر گاڑی دیکھیں۔ پہلے جس بات کا آپ کو علم کی حد تک یقین تھا، اب اسے آپ نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ اسے ”عین الیقین“ کہتے ہیں۔ قرآن میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ تم جہنم کو ”عین الیقین“ سے دیکھو گے، یعنی اپنی آنکھ سے دیکھو گے۔

تیسرا درجہ اسکا یہ ہے کہ آپ گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے اور گاڑی چلا کر دیکھ لی۔ اب آپ کو آخری درجے میں یقین حاصل ہو گیا کہ وہ گاڑی دھوکہ نہیں ہے، صرف التباس نہیں ہے، ایک وسوسہ نہیں ہے، آنکھ کا فریب نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا میں عملی تجربہ کر چکا ہوں۔ یہ ”حق الیقین“ ہے۔

جیسے جیسے انسان کا اللہ کے رسول ﷺ سے تعلق بڑھتا جاتا ہے، جوں جوں اس پر راز کھلتے جاتے ہیں، انسان کے یقین کا درجہ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ پہلے وہ ”یومنون بالغیب“ کے درجے پر ہوتا ہے۔ بس ایمان لے آتا ہے۔ لیکن جب اللہ راز کھولنے لگتا ہے تو پھر اسے ”علم الیقین“ ہوتا ہے۔ پھر آنکھ سے دیکھتا ہے اور ”عین الیقین“ پر فائز ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ اسے ان کیفیات سے گزارتا ہے کہ جہاں سے ”حق الیقین“ کا مقام شروع ہو جاتا ہے۔

جب اللہ کا مومن بندہ حق الیقین پر کھڑا ہو، تو چاہے پوری کائنات بھی اس کی مخالف ہو جائے، اس پر دباؤ ڈالے، اس پر ظلم کرے، اذیتیں دے، وہ اپنے مشن سے دستبردار نہیں ہوتا۔ حضور ﷺ نے کفار سے فرمایا کہ تم اگر میرے ایک ہاتھ پر سورج رکھ دو اور دوسرے ہاتھ پر چاند، تب بھی میں اسلام پھیلانے کے مشن سے رکنے والا نہیں۔

بندہ مومن کا یہی یقین کائنات کی تسخیر کرتا ہے، تقدیر بدلتا ہے، تاریخ لکھتا ہے اور دریاؤں کے رخ موڑ دیتا ہے۔ اسی بندہ آزاد کی خواہش تقدیر الہی بن جاتی ہے۔ اسی لیے اقبالؒ ایسے بندہ مومن کی اطاعت کرنے کا حکم دیتے ہیں کہ وہ وقت کا فرقان ہوتا ہے:

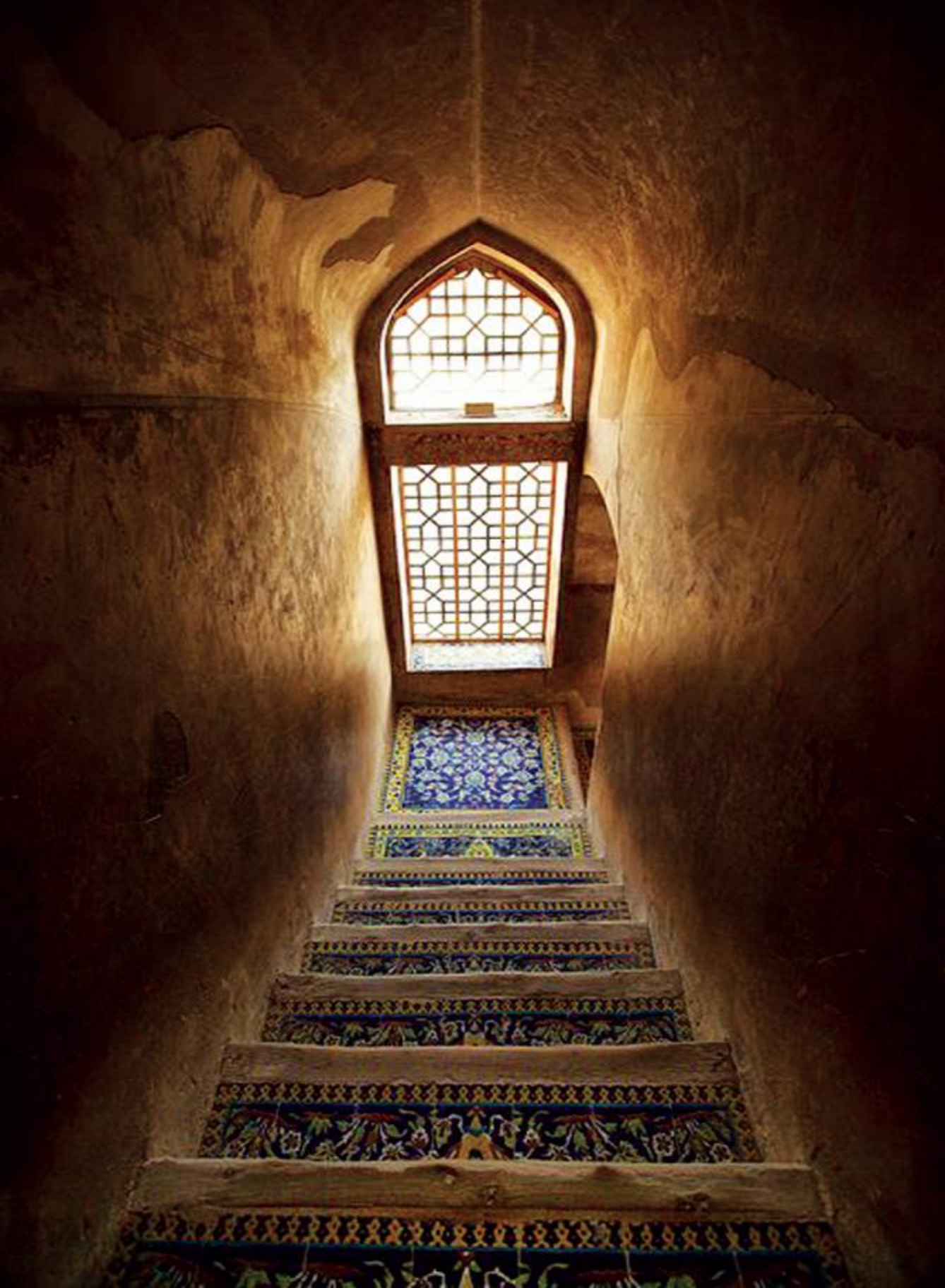
جاتا ہے جدھر بندہ حق، تو بھی ادھر جا!

ایسے بندہ مومن کی نشانی ہی اقبالؒ یہ بتاتے ہیں کہ جب موت کا وقت آتا ہے، تو اسکے چہرے پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔

چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

یقین اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا تحفہ ہے۔ اللہ سے یقین طلب کریں۔ جس پر اللہ کرم کرتا ہے اس کو یقین عطا کرتا ہے۔ جس پر اللہ کا عذاب آتا ہے، وہ شک، وسوسے اور بے یقینی میں ڈولتا رہتا ہے۔ مسلمانوں کو شک اور وسوسے سے پناہ مانگنے کا حکم ہے۔ قرآن پاک میں ایسے لوگوں کے بارے میں سخت وعید ہے کہ جو شک اور وسوسے کا شکار رہتے ہیں، نہ ادھر کے نہ ادھر کے، بلکہ بیچ میں ہی اپنی بے یقینی میں ڈولتے رہتے ہیں!





بندۂ مومن کی یہ خاص صفت ہے کہ جب وہ ایک دفعہ عزم کر لیتا ہے، تو پھر اس پر قائم ہو جاتا ہے۔ پہاڑ اپنی جگہ چھوڑ سکتے ہیں، مگر ایک بندۂ مومن اپنے ارادے تبدیل نہیں کر سکتا۔ بندۂ مومن اگر غلطی بھی کرتا ہے، تو پورے اعتماد سے کرتا ہے۔ اسی لیے بندۂ مومن کی اجتہادی غلطی اللہ کے ہاں معاف ہے۔

عشق ہوتا ہے تو یقین آتا ہے۔ جو انسان شک میں مبتلا ہو، منحصرے میں ہو کہ جس کے نہ تصورات واضح ہوں نہ اللہ پر ایمان ہو، نہ مشاہدہ کیا ہو، نہ علم الیقین ہو، نہ عین الیقین ہو، ایسے شکست خوردہ، ناکام اور مذہب انسان سے اللہ تعالیٰ کوئی کام نہیں لیتا۔ بندۂ مومن کی بنیاد ہی اس کا اعتماد ہوتا ہے۔ اس کا یقین اس کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔ یہ یقین کہ اللہ ہمیں کبھی رسوا نہیں کرے گا۔

حضور ﷺ پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہؓ کے پاس تشریف لاتے ہیں اور حضرت خدیجہؓ سے فرماتے ہیں: ”زملونی زملونی“، مجھے چادر اوڑھا دو، مجھے چادر اوڑھا دو۔ حضور ﷺ پہلی وحی کے بعد بہت زیادہ دباؤ محسوس کر رہے تھے، آپ ﷺ کے وجود مبارک کو ٹھنڈ لگ رہی تھی، اور آپ ﷺ پر خوف کا عالم طاری تھا۔ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ محسوس ہوتا ہے۔ اس وقت حضرت خدیجہؓ کتنے اعتماد سے جواب دیتی ہیں کہ اللہ آپ ﷺ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا، کبھی رسوا نہیں کرے گا، کیونکہ آپ ﷺ یقینوں، بیواؤں، مسکینوں کی مدد کرتے ہیں۔ بی بی خدیجہؓ کا یقین اور تسلی دلانے کے بعد حضور ﷺ کو سکون آ گیا۔

یہی یقین اللہ تعالیٰ کے ہتھیاروں میں ایک ہتھیار ہے۔ مرد مومن کا یقین اللہ کا تقدیر ساز ہوتا ہے۔ انسان اگر اللہ پہ شک کرتا رہے کہ پیہ نہیں اللہ ہے بھی یا نہیں، مدد کرے گا بھی یا نہیں، میری دعائیں سنے گا بھی یا نہیں، تو پھر اللہ بھی اس کو نظر انداز کرتا ہے۔ اللہ کیوں ہماری نہیں سنے گا؟ وہ تعلق تو بناؤ اس کے اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ۔ اللہ پر اتنا یقین تو ہو کہ وہ ہمیں کبھی رسوا نہیں کرے گا، ہماری لاج رکھے گا۔ یاد رکھیں کہ اللہ بندے سے اس کے گمان کے مطابق سلوک کرتا ہے۔ جس کو اللہ پر یہ مان ہو کہ اللہ کبھی اسے رسوا نہیں کرے گا، تو اللہ کی غیرت یہ گوارہ نہیں کرتی کہ اس بندے کو کبھی دنیا کے سامنے رسوا کرے۔

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم

جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

سوال: روضہ پاک پر حاضری کے آداب تو آپ بیان کر چکے ہیں، اس میں مزید کوئی اور نصیحت ہو تو فرمائیں۔

جواب: پوری دنیا سے مسلمان آتے ہیں اور روضہ پاک پر حضور ﷺ کو اسی طرح سلام کرتے ہیں، اسی طرح کے آداب اپناتے ہیں، اسی طرح حاضری دیتے ہیں، آواز دھیمی رکھتے ہیں کہ جس طرح صحابہؓ حضور ﷺ کے سامنے کیا کرتے تھے۔ آج



بھی وہ احکامات پوری طرح لاگو ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے اگر آواز بلند کرو گے تو تمہارے اعمال ضائع کر دیئے جائیں گے۔

ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ کے حوالے سے ہم آپ کو امام نوویؒ کا حوالہ دینا چاہیں گے۔ بہت بڑے امام کہ جن کی مشہور کتاب ”ریاض الصالحین“ پوری دنیا میں پڑھائی جاتی ہے، خصوصاً عرب دنیا میں۔ کہا جاتا ہے کہ اگر حدیث کی کوئی کتاب سب سے زیادہ پڑھائی جاتی ہے، تو وہ ریاض الصالحین ہی ہے۔ آپ دمشق کے رہنے والے تھے۔ آپ کی ایک کتاب ”کتاب الاذکار“ بھی ہے۔ یہ کتاب بھی انتہائی مستند ہے۔ تمام مسالک کے مسلمان امام نوویؒ کا احترام کرتے ہیں۔ ہمارے پاس اس کتاب کی ایک جلد ہے کہ جو مدینہ شریف کی چھپی ہوئی ہے۔ اس ”کتاب الاذکار“ میں امام نوویؒ نے وہ اذکار لکھے ہیں کہ مسلمانوں کو مختلف مواقعوں پر کرنے چاہئیں۔ حج اور مسجد نبویؐ کی زیارت کے حوالے سے امام نوویؒ نے ایک مستقل باب مخصوص کیا ہے کہ حضور ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری کیلئے جانے کے آداب کیا ہیں، اس کے اذکار کیا ہیں، اسکے لوازمات کیا ہیں۔ یہ کتاب عربی میں ہے۔ امام نوویؒ اس میں لکھتے ہیں کہ زیارت قبر رسول اللہ ﷺ، درحقیقت زیارت رسول اللہ ﷺ ہے۔ امامؒ نے قبر کا لفظ بھی نکال دیا۔ وہ اسے زیارت رسول اللہ ﷺ لکھتے ہیں۔ پھر لکھتے ہیں کہ یہ سب سے اعلیٰ عبادت ہے۔

کتاب الاذکار میں امام نوویؒ نے ایک واقعہ لکھا ہے۔ یہ واقعہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک بدو حضور ﷺ کے روضہ مبارک پر آتا ہے اور روضہ مبارک پر آکر وہ آیتیں پڑھتا ہے اور حضور ﷺ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں نے قرآن میں پڑھا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جان پر ظلم کر بیٹھے، تو وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے۔ رسول اللہ ﷺ جب اس کے لیے استغفار کریں گے، دعا کریں گے، تو پھر اللہ تعالیٰ اسکی مغفرت فرما دے گا۔ اس لیے میں آپ ﷺ کے پاس آیا ہوں۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ مجھے مغفرت دلوا دیجئے۔ اسکے بعد امام نوویؒ یہ لکھتے ہیں کہ وہاں ایک بزرگ کو خواب میں حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوتی ہے اور حضور ﷺ ان بزرگ کو کہتے ہیں کہ جا کر اس بدو سے کہو کہ اللہ نے اس کی حاضری قبول کی اور اسکی مغفرت فرمادی!

اس بدو کو کوئی شک نہیں تھا کہ میں حضور ﷺ کو درخواست دے سکتا ہوں یا نہیں۔ وہ بزرگ جن کو خواب میں حضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، ان کو بھی کوئی شک نہیں تھا۔ امام نوویؒ کہ جنہوں نے یہ واقعہ رقم کیا ہے، ان کو بھی اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حضور ﷺ کے پردہ فرمانے کے بعد بھی، براہ راست اس طرح فیض لیا جاسکتا ہے کہ جس طرح صحابہ کرامؓ لیا کرتے تھے۔ صدیوں سے یہ کتاب امت میں موجود ہے اور کسی مسلمان کو آج تک اس کتاب پر یا اس واقعے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ اس بدو کے کہے ہوئے اشعار آج بھی روضہ مبارک کے ستونوں پر لکھے ہوئے ہیں۔

یہ وہ راز ہیں کہ جن پر امت کو منحصر میں ڈال دیا گیا ہے، کہ جس نے امت کے جسم سے روح محمد ﷺ نکال دی ہے اور جس کی وجہ امت سے کا حضور ﷺ سے تعلق ٹوٹ گیا ہے۔ جس کسی کو اس بات پر اعتراض ہے، وہ امام نوویؒ پر اعتراض کرے۔ جس کسی کو اس پر اعتراض

ہو، وہ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ میں گزرنے والے ان تمام علماء پر اعتراض کرے کہ جنہوں نے حضور ﷺ سے روحانی تعلق اور فیض لینے کے طریقے بتائے ہیں۔ یہ بہت بڑا راز ہے۔ اسکو اب کھولنے کا وقت آ گیا ہے۔ علامہ اقبال حقیقت شناس تھے، انہوں نے کھل کر اس راز کو آشکار کیا ہے کہ اب عشق حقیقی، عشق رسول ﷺ، معرفت الہی اور حقیقت انسانیت کے رازوں کو عام کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ وہ روحانی علوم کہ جو صدیوں سے سر بستہ راز تھے، سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے تھے، اب انہیں کھولنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا  
سکوت تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہوگا  
گزر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے  
بنے گا سارا جہاں میخانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباس مجاز میں  
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

یہ وقت جس میں ہم امت کے عروج کی بات کرتے ہیں، یہ وقت عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ کا وقت ہے۔ اب اس راز کے حوالے سے ہمارا رویہ معذرت خواہانہ نہیں ہوگا۔ امت کا نصیب، اسکی تقدیر یہی ہے۔ اسی عشق رسول ﷺ اور ادب رسول ﷺ سے اسکو عروج ملے گا۔ گستاخ اور بے ادب کے نصیب میں کچھ نہیں آتا۔ ہم نے دین میں پھیلی خرافات خود پر بہت زیادہ طاری کر لی ہیں۔ شرک اور بدعت کے نام پر دین کی اس روح کو ترک کر دیا ہے کہ جس سے امت کو زندگی ملتی تھی۔ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں ہزاروں واقعات ایسے ملتے ہیں کہ جب حضور ﷺ خود مسلمانوں کے خواب میں تشریف لائے، خوشخبریاں اور بشارتیں دیں۔ زیارت النبی ﷺ تو فیض کی بات ہے۔ لوگ مبارکباد دیتے ہیں۔ صدقے دیتے ہیں۔ لوگ ساری عمر اپنی خوش نصیبی پر ناز کرتے ہیں اگر ان کو زیارت النبی ﷺ نصیب ہو جائے۔ اس فیض سے کوئی کیسے انکار کر سکتا ہے؟

ماشاء اللہ حضور ﷺ کے روضہ مبارک پر حاضری، آپ ﷺ پر درود و سلام، اس بدو کو بھی یہ بات معلوم تھی اور امام نوویؒ اپنی کتاب میں اس کا حوالہ دے رہے ہیں۔ بدو یہ کہتا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ میں نے تو قرآن میں پڑھا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھو، تو رسول اللہ ﷺ کے پاس آؤ، وہ تمہیں مغفرت و دلوادیں گے، تمہاری شفاعت کروادیں گے! یہ کہاں سے کفر ہے؟ کہاں سے شرک ہے؟ کہاں سے بدعت ہوگئی، نعوذ باللہ!





## زمانہ باتو نسازد، تو بازمانہ ستیز

علامہ اقبالؒ کے متعلق ان کے ایک انگریز استاد پروفیسر آرنلڈ نے یہ کہا تھا: ”یہ اپنے دور کا آدمی ہے۔ یہ اپنے دور سے آگے کا آدمی ہے اور یہ وہ آدمی ہے کہ جو اپنے دور سے حالت جنگ میں ہے۔“ اقبالؒ نے اپنی کتاب ”ضرب کلیم“ کا یہ نام بھی اس لیے رکھا کیونکہ ان کے بقول یہ عصر حاضر کے خلاف جنگ ہے۔ اس باب میں ”ضرب کلیم“ میں شامل کلام پر ہی بات کی جائے گی۔

عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اور آخرت پر ایمان لاتا ہے، تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔ یہ تصور بھی صحیح ہے۔ مگر قوموں کے عروج کیلئے جن افراد کا انتخاب کیا جاتا ہے، ان کا ایمان صرف زبانی نہیں ہوتا۔ اقبالؒ کے مطابق وہ ایسے مرد آزاد ہوتے ہیں کہ جن کی ہاں اور ناں میں اللہ تعالیٰ کائنات کے فیصلے کرتا ہے۔ جب تک انسان ایسا مقام نہ حاصل کر لے، وہ نہ بندہ مومن کہلاتا ہے نہ ہی مرد آزاد۔ جسم کے ساتھ ساتھ فکر، روح، قلب و نظر کا بھی آزاد ہونا ضروری ہے۔

### نہیں مقام کی خوگر طبیعتِ آزاد

یعنی مرد آزاد کی طبیعت کسی ایک مقام پر نہیں ٹھہرتی۔ حضرت علیؓ کا قول ہے کہ اگر تمہارا آج کا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر نہیں، تو تم ہلاک ہوئے۔ روحانی طور پر مومن کا ہر دن اسکے گزشتہ دن سے بہتر ہوتا ہے۔ مومن کی قلبی کیفیت دن میں چالیس مرتبہ بدلتی ہے۔ منافق کی کیفیت ساہا سال ایک جیسی رہتی ہے۔ بندہ مومن خود کو بہتر سے بہترین بنانے کی جستجو میں لگا رہتا ہے۔ اس سے غلطیاں اور

کو تھیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس پر بعض اوقات شیطان کا غلبہ بھی ہو جایا کرتا ہے، مگر وہ ان غلطیوں پر قائم نہیں رہتا۔ بلکہ اپنے آپ کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ بلندی پر پہنچتا ہے اور مزید بلندی پر جانے کی دھن اس پر سوار رہتی ہے۔

پاکستان ۱۱۴ اگست کو یوں تو آزاد ہو گیا تھا، مگر ہم معاشی اور سیاسی طور پر اب بھی آزاد نہیں ہیں۔ انگریزوں کا نظام اور قانون ابھی تک رائج ہے۔ اس کے علاوہ ہم فکری اور ذہنی طور پر بھی، ابھی تک غلام ہیں۔ ہمارے حکمران اور عوام، یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ پاکستان میں خلافت راشدہ کا نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ کیا ہم سود اور ربا کا نظام ختم کر کے اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کا نظام پاکستان میں قائم کر سکتے ہیں؟ کیا ہم مسلمانوں کو متحد کر کے اسلامی ریاست بنائے متحدہ بنا سکتے ہیں؟ کیا ہم ہندوستان کو دوبارہ دائرہ اسلام کے اندر لا سکتے ہیں؟ غلام اذہان تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ ان پر تو اس تصور سے ہی خوف طاری ہو جاتا ہے کہ امریکہ سے ہم کیسے لڑیں گے۔

خطبہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا: ”اے اللہ! گواہ رہنا۔ میں نے دین لوگوں تک پہنچا دیا ہے۔“ یعنی دین مکمل ہے۔ مگر پھر ہم غلام کیوں ہیں؟ اعلیٰ ترین علماء بھی سود اور ربا کا نظام استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔ ہم اس لیے مجبور اور غلام نہیں ہیں کہ ہمارے پاس قرآن اور حدیث نہیں ہے، بلکہ ہم اس لیے غلام ہیں کیونکہ مرد آزاد ختم ہو گئے ہیں، کفر کے نظام میں آرام و سکون سے بیٹھنے والے لوگ مرد آزاد نہیں ہوتے۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا، نہ وہ دنیا

یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

یعنی مرد آزاد کی طبیعت اس قدر آزاد ہوتی ہے کہ وہ یہ بھی برداشت نہیں کرتا کہ اگلے جہاں میں جا کر بس جینا ہی پڑے گا۔ اسے یہ پابندی بھی بری لگتی ہے۔ وہ وہاں بھی اپنی مرضی سے جینا چاہتا ہے۔ مگر آزادی اور آوارگی میں بہت فرق ہے۔ مرد مومن آزاد اس لیے ہے کیونکہ اس کے گلے میں رسول اللہ ﷺ کی غلامی کا طوق ہے۔ جس انسان کے گلے سے یہ طوق نکال دیا جائے، وہ آزاد نہیں ہوتا بلکہ آوارہ ہو جاتا ہے۔ اس کی فکر، سوچ اور ذہن سب کچھ بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہو فکر اگر خام تو آزادی افکار

انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ!



یہ بندگیِ خدائی، وہ بندگیِ گدائی

یا بندہء خدا بن یا بندہء زمانہ!

ہمیں خدا کی بندگی کرنی ہے یا زمانے کی؟ یہ فیصلہ ہمارا ہے، مگر کسی ایک کو اپنا ضروری ہے۔ حرم شریف میں جائیں تو وہاں لاکھوں کا مجمع ہوتا ہے مگر ان لاکھوں لوگوں کی دعائیں قبول نہیں ہو رہی ہوتیں۔ فلسطین اور کشمیر کا مسئلہ جوں کا توں ہے۔ امت پر عذاب پر عذاب آرہے ہیں۔ مفتیان دین اور شیوخ حرم اس بات کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ امت کے زوال کو کس طرح روکا جائے۔ جتنا فکری انتشار امت کے علماء اور حکمرانوں میں ہے اس کی مثال تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ آج پوری مسلم امت میں نہ کوئی صلاح الدین ایوبیؒ نظر آتا ہے اور نہ ہی کوئی امام ابوحنیفہؒ۔ ایسا قحط الرجال کا عالم ہے!

اگر ہمیں دوبارہ عروج کی طرف جانا ہے تو پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ ایسی نسل پیدا کرنی ہوگی کہ جو ذہنی، روحانی اور جسمانی طور پر آزاد ہو۔ تاریخ میں اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی آزاد بندے گزرے ہیں، ان کی زندگیوں کا طویل عرصہ جیلوں میں گزرتا ہے، کفر کے نظام سے تصادم میں گزرتا ہے، گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر گزرتا ہے، بظاہر وہ لوگ سکون میں نہیں ہوتے، کبھی وہ صلاح الدین ایوبیؒ کے روپ میں ہوتے ہیں، کبھی ٹیپو سلطانؒ، کبھی امام احمد بن حنبلؒ، اور امام مالکؒ کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ کبھی مجدد الف ثانیؒ کے روپ میں نظر آتے ہیں تو کبھی علامہ اقبالؒ اور کبھی قائد اعظمؒ کی شکل میں۔ قائد اعظمؒ کو لوگ انگریز کہتے ہیں، مگر انہوں نے جس کردار کا مظاہرہ کیا، وہ خلفائے راشدین کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ یہ مرد آزاد کی خصوصیت ہوتی ہے کہ جس بات کو سچ اور حق سمجھتا ہے، اسے کہنے میں قطعاً ہچکچاتا نہیں ہے۔

مسلمان امت میں سرحدوں کی پابندی عائد ہونے کے بعد چار سے پانچ نسلیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ۱۹۲۱ء سے پہلے پوری مسلمان دنیا میں ویزے، پاسپورٹ والا نظام نہیں ہوتا تھا۔ ان پابندیوں کے بغیر ہی مسلمان ملکوں کے افراد دوسرے مسلم ممالک کا سفر کر لیتے تھے۔ آج کے دور میں یہ بات عجیب لگتی ہے۔

زوال کے اس دور سے پہلے، کہ جب مسلمان دنیا پر حکمران تھے، تو فطرتاً اور طبعاً آزاد تھے۔ ان کے جسم کے ساتھ ساتھ روح اور ذہن بھی آزاد تھے، لہذا انہوں نے سیاسی، معاشی اور فکری ٹیکنالوجی کے حوالے سے وہ بنیاد قائم کی کہ جس پر بعد میں مغرب نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑے۔ کئی سو سالوں تک مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتب ہی مختلف تعلیمی درسگاہوں میں نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہیں۔ ان علوم کو سیکھنے کے لیے لوگ عربی زبان سیکھتے تھے۔ آج کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آج کی جدید سائنس کے مطابق اللہ تعالیٰ موجود نہیں ہے۔ مگر یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس جدید سائنس کو پروان مسلمانوں نے ہی چڑھایا، اور اپنے علوم کی بنیادیں قرآن و سنت پر ہی رکھیں۔



إِنَّمَا هِيَ رِجْوَى السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ كَانَتْ رِجْوَى السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ





حضرت ابراہیمؑ کی دعایا دیکھیں۔ ”یا اللہ! قبول فرما.....“۔ اگر اللہ تعالیٰ قبول نہ کرے تو انسان کے حج، نمازوں اور روزوں کا کیا فائدہ؟ اگر انسان یہ سب ریاکاری کے تحت کرے، دنیا کو دکھانے کے لیے کرے، تو کیا فائدہ؟ احادیث کی پہلی منظم کتاب موطا امام مالک تھی، کہ جس کے مصنف امام مالکؒ ہیں۔ مدینہ کے امام تھے۔ ادب رسول ﷺ اور عشق رسول ﷺ اس قدر کہ حج کے سوا مدینہ سے باہر کبھی نہیں گئے۔ لوگ ان سے پوچھتے کہ مسلمانوں کے دیگر بڑے بڑے مراکز میں کیوں نہیں جاتے تو وہ حضور ﷺ کی حدیث میں جواب دیتے ”مدینہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو تو“۔ امام مالکؒ مدینہ میں کبھی جوتے بہن کر نہیں چلے تھے، نہ ہی گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ کسی نے امامؒ پر بہتان لگا دیا کہ آپ نے ”موطا امام مالک“ اپنی شہرت کیلئے لکھی ہے تاکہ آپ کو بادشاہ انعام دے۔ امام مالکؒ جلال میں آگئے اور فرمایا کہ ابھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ میں نے یہ کتاب اللہ تعالیٰ اور دین کیلئے لکھی ہے یا دنیاوی مفادات کیلئے۔ پھر آپ نے پانی کا ایک گھڑا منگوایا اور سب لوگوں کے سامنے، اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا موطا امام مالک کا واحد نسخہ اس گھڑے میں ڈال دیا۔ اس زمانے میں کاغذ بھی اتنی اعلیٰ کوالٹی کا نہیں ہوتا تھا۔ سیاہی تو ویسے ہی پتھر کو کوٹ کر بنائی جاتی تھی۔ ایسے میں کوئی بھی کتاب پانی میں ڈالی جائے تو الفاظ کے ساتھ ساتھ کاغذ بھی ضائع ہو جاتا تھا۔ امام مالکؒ کی کتاب بہت دیر تک پانی میں پڑی رہی اور جب اسے نکالا گیا تو اس کا ایک ایک لفظ سلامت تھا۔ یہ کرامت اور معجزہ دیکھ کر لوگ حیران رہ گئے۔ پوری دنیا میں یہ بات پھیل گئی کہ اللہ تعالیٰ نے واقعتاً اس کتاب کو قبول کر لیا ہے۔

### ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے

بندہء مومن جہاں قدم رکھتا ہے، وہاں سے خیر کے چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ اس کی ایک مثال حضرت اسماعیلؑ کا واقعہ ہے کہ جب وہ بچے تھے اور پیاس کی شدت سے روتے ہوئے انہوں نے زمین پر ایڑیاں رگڑیں تو وہاں سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ اسی طرح بندہء مومن کوئی بھی کام کرے، اس کے وجود سے خیر ہی نکلتی ہے۔ کسی سے ہاتھ ملائے تو اسے دعا دے جاتا ہے۔ کسی کے پاس بیٹھے تو اسے خیر دے جاتا ہے۔ جس محفل میں بیٹھتا ہے، اس میں خیر و برکت آ جاتی ہے۔ وہ اللہ سے پیار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے پیار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی غلطیاں کوتاہیاں معاف کرتا ہے۔ جن سے وہ پیار کرتا ہے، ان کی غلطیاں کوتاہیاں بھی معاف کر دی جاتی ہیں۔ بندہء مومن کا وجود ہوتا ہی باعث خیر و برکت ہے۔ وہ رحمتیں تقسیم کرنے والا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ رحمت العالمین ہیں۔ آپ ﷺ پوری کائنات میں رحمتیں تقسیم فرما رہے ہیں۔ آپ ﷺ کے صدقے، آپ ﷺ کے فقراء بھی اللہ کی مخلوق کیلئے رحمت کا باعث ہوتے ہیں۔

مدینہ کی جانب ہجرت کے دوران ایک جگہ آپ ﷺ ایک جھونپڑی میں جاتے ہیں، وہاں ایک بڑھیا بیٹھی ہوتی ہے۔ حضور ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس بڑھیا سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس دودھ یا کوئی کھانے پینے کی چیز ہے؟ اس بڑھیا نے جواب دیا کہ میرے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ میرے شوہر بکریوں کا ریوڑ لے کر باہر گئے ہوئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہاں ایک بکری کھڑی

ہے، اگر اجازت ہو تو میں اسکا دودھ نکال لوں؟ ان خاتون نے جواب دیا کہ اس بکری میں دودھ نہیں ہے، یہ بیمار بکری ہے، اس لیے ریوڑ کے ساتھ نہیں گئی۔ لیکن اگر آپ کوشش کر کے دیکھنا چاہتے ہیں تو دیکھ لیجئے۔ حضور ﷺ نے اس بکری کا دودھ دوہنا شروع کیا تو گھر کے سارے برتن بھر گئے، مگر دودھ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ سب نے سیر ہو کر دودھ پیا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ جب اس بڑھیا کا شوہر واپس آیا تو گھر میں اتنا دودھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بیوی سے دریافت کیا تو انہوں نے حضور ﷺ کے متعلق بتایا اور ان کا حلیہ بھی بیان کیا۔ ان خاتون کا بیان کیا ہوا حلیہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور آج بھی مستند ترین گواہی کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ شوہر نے کہا یہ وہی شخص معلوم ہوتے ہیں کہ جن کے متعلق قریش کہتے ہیں کہ وہ نیا دین لے کر آئے ہیں۔

حضور ﷺ کی حیات مبارکہ کرامات اور معجزات سے بھری پڑی ہے۔ یہ وہ خیر ہے کہ جو اللہ کے محبوب بندوں کے وجود سے بے اختیار صادر ہوتی رہتی ہے۔ انکا وجود ہی اتنا بابرکت ہوتا ہے، کہ وہ چاہیں یا نا چاہیں، کائنات میں نور پھیل جاتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے فرمائش کی کہ آج آپ ﷺ میرے ساتھ روٹیاں پکوائیں۔ حضور ﷺ نے بھی ایک روٹی بنا کر تنور میں لگا دی۔ ساری روٹیاں پک گئیں مگر حضور ﷺ کی لگائی گئی روٹی پکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ حضرت عائشہؓ نے وجہ دریافت کی تو حضور ﷺ مسکرائے اور فرمایا کہ اب اس روٹی کو میرا تھلگ چکا ہے، لہذا اس پر آگ حرام ہو گئی ہے۔ اللہ اکبر! سوچئے جن صحابہ کرامؓ کو حضور ﷺ نے ہاتھ لگایا ہو، ان پر جہنم کی آگ کیونکر اثر کر سکتی ہے؟

ایک مرتبہ ایک صحابیؓ حضور ﷺ کا وہ خون پی گئے جو حضور ﷺ نے انہیں پھینک کر آنے کو کہا تھا۔ جب واپس گئے تو حضور ﷺ نے پوچھا کہ کیا کیا اس خون کا؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھے جھینکتے ہوئے شرم آئی، لہذا میں وہ پی گیا۔ اس پر حضور ﷺ نے انہیں جنت کی بشارت دے دی کہ جس وجود میں حضور ﷺ کا خون داخل ہو جائے، اس پر جہنم کی آگ حرام ہے۔

قدرت اللہ شہاب کی کتاب ”شہاب نامہ“ میں ایک واقعہ درج ہے۔ ایک مرتبہ انہیں نوکری میں بہت مشکلات کا سامنا ہوا اور انہیں تبدیل کر کے ہالینڈ بھیجا جانے لگا۔ تب ایک فقیران کے پاس آئے اور کہا کہ پاکستان سے باہر مت جاؤ۔ شہاب صاحب نے پوچھا کہ کیوں؟ مجھے تو وہاں پاکستان کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے، وہاں جا کر بھی پاکستان کی خدمت ہی کرونگا۔ فقیر نے جواب دیا کہ ٹھیک ہے وہاں بھی آپ پاکستان کیلئے ذمہ داریاں ادا کرنے جائیں گے، مگر فی الحال آپ کا پاکستان کے اندر رہنا بہت ضروری ہے۔ آپ کی پاکستان میں موجودگی کی برکت سے پاکستان کو بہت خیر و برکت نصیب ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندہ ءمومن کا کسی جگہ پر موجود ہونا ہی بہت ہوتا ہے، یوں اس جگہ یا تو عذاب آتا نہیں یا پھر کم کر دیا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں حضور ﷺ کی نسبت سے اللہ تعالیٰ واضح فرماتا ہے کہ اللہ کسی قوم کو عذاب نہیں دے گا کہ جس میں اللہ کے رسول ﷺ موجود ہوں۔ تمام انبیاء کے واقعات اس بات پر گواہی دیتے ہیں کہ اللہ نے ان کی قوموں پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کیے، کہ جب تک وہ انبیاء ان کے درمیان موجود رہے۔ جب اللہ





نے ان کی قوموں کو تباہ کرنے کا فیصلہ کیا، تو پہلے اپنے محبوب بندوں کو وہاں سے نکلنے کا حکم دیا۔ یہی قانون آج بھی اللہ کے ولیوں، ابدالوں اور فقراء کے حوالے سے ہے۔ جب تک ان کا وجود اللہ کے حکم سے ڈیوٹی پر موجود رہتا ہے، ان کی برکت سے اللہ اپنے بندوں کو رزق دیتا ہے، بارش برساتا ہے اور دشمنوں پر فتح یاب کرتا ہے۔ حدیث مبارکہ میں، شام کے حوالے سے تو واضح دلیل ملتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ سیدی رسول اللہ ﷺ کا یہ فیض پوری امت کے ہر خطے میں جاری ہے۔

بانو قدسیہ کی کتاب ”مردا بریشم“ ضرور پڑھیے گا۔ بانو قدسیہ ان پانچ درویشوں کی رازدار ہیں۔ قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، واصف علی واصف، اور ابن انشاء۔ یہ پانچ درویشوں کا حلقہ تھا۔ یہ تمام اپنی ذمہ داریاں ادا کر کے واپس جا چکے ہیں، البتہ بانو قدسیہ ابھی حیات ہیں۔ بانو قدسیہ نے قدرت اللہ شہاب کے انتقال کے بعد یہ کتاب ”مردا بریشم“ لکھی۔ اس کتاب میں انہوں نے قدرت اللہ شہاب کے متعلق وہ پراسرار واقعات لکھے ہیں کہ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہاب صاحب حقیقت میں کیا تھے۔ دنیاوی طور پر شہاب صاحب سی ایس پی آفیسر تھے اور صدر پاکستان کے پرنسپل سیکرٹری بھی۔ اشفاق احمد ان کے متعلق لکھتے ہیں کہ قدرت اللہ شہاب اس عہدے پر فائز تھے کہ ان کے آگے صدر پاکستان تھے اور پھر مملکت کی حدود ختم ہو جاتی تھیں۔ اللہ اپنے ولیوں اور فقیروں کو ان عہدوں پر بھی فائز کر سکتا ہے۔ اللہ کے ولی اور درویش صرف خانقاہوں اور جنگلوں میں ہی نہیں ہوتے۔ اللہ کے دین کو نافذ کرنے کیلئے اگر عسکری اور سیاسی قوت درکار ہوتی ہے، تو پھر اللہ کے فقراء اس قوت کو بھی بھرپور طور پر استعمال کرتے ہیں۔ دین اسلام جلال، حکمرانی، شان و شوکت اور جہاد کا دین ہے۔ رہبانیت، عیسائیت کا مذہب ہے۔

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ

مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے وجود سے خیر کے چشمے نکلیں، تو پہلے اپنی خودی کو پہچانو۔ ضرب کلیم سے مراد موسیٰ کی ضرب ہے۔ موسیٰ کا عصا سارے کام کرتا تھا۔ جب موسیٰ نے اپنا عصا سمندر پر مارا تو وہ دو حصوں میں تقسیم ہو گیا اور بیچ میں سے راستہ بن گیا۔ اقبالؒ نے یہاں اسی چھڑی سے پڑنے والی ضرب کا حوالہ دیا ہے کہ اس کی ضرب سے بارہ قبیلوں کیلئے بارہ چشمے پھوٹ پڑے تھے۔ یہی صفت بندہء مومن کے وجود میں بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ بندہء مومن یہ صفت اپنے اندر پیدا کر لے تو اس کے وجود سے خیر کے چشمے پھوٹیں گے۔ کبھی علم کے، کبھی نور کے، کبھی پیار و محبت کے۔

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے

خودی میں ذوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

بندہ ءمومن ایک پراسرار وجود ہوتا ہے۔ آج ہمارے بچے اسی لیے بے یقینی کا شکار ہیں کہ ان کو اپنے ارد گرد کوئی مثالی نمونہ نہیں نظر آتا کہ جس کے نقش قدم پر چل کر وہ بندہ ءمومن بن سکیں۔ ہم نے ایسے لوگوں کے حوالے سے کتابوں میں تو پڑھا ہے، مگر حقیقت میں ہمیں ایسے وجود نظر نہیں آتے۔ اگر نظر آ بھی جائیں تو اکثر اتنے جدید ہوتے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے۔ کسی کا نام قدرت اللہ شہاب ہوتا ہے، کوئی ممتاز مفتی ہوتے ہیں کہ جو اپنے آپ کو اتنا گناہ گار دکھاتے ہیں کہ گویا ان پر تو کرم ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ سب پردے ہیں کہ جن میں یہ فقیر خود کو چھپاتے ہیں۔ اشفاق احمد بھی دنیا کی نظر میں ڈرامہ نگار تھے، مگر درحقیقت ڈیوٹی پر مامور ایک درویش۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کو پردوں میں چھپا کر رکھتا ہے۔ فقراء میں ایک مقولہ مشہور ہے کہ اللہ اپنے فقیروں کو اپنی چادر میں چھپا کر رکھتا ہے۔ مگر یہ لوگ آس پاس ہی ہیں۔ انہیں تلاش کریں۔ ان سے فیض لیں۔ فیض لینے کا مطلب یہ نہیں کہ ان سے امتحانوں میں پاس ہونے کیلئے دعائیں کرائی جائیں یا جلد شادی کے لیے۔ اللہ تعالیٰ کو سستا نہ بیچیں، اور نہ ہی اللہ کے فقراء کو۔ اللہ کی آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت نہ لیں۔ وہ اللہ جو اپنے آپ کو دینے پر تیار ہو اور جو کہے کہ میں دونوں جہانوں میں حضور ﷺ کی غلامی میں دے دوں گا اور تمہیں پوری کائنات کی ظاہری و باطنی حکمرانی عطا کروں گا، تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپا کریں گے، میں وسعت افلاک میں تجھ سے تکبیر مسلسل دہلاؤں گا، اس اللہ تعالیٰ کے سامنے آپ جا کر کہیں کہ امتحانوں میں مجھے اچھے نمبر دلادے، میری بیماری دور کر دے، مجھے نئی گاڑی اور گھر عطا کر دے۔ اپنی دعائیں اس طرح ضائع نہ کریں۔

پہلے اپنا مقصد حیات حاصل کر لیں اور مقصد حیات حضور ﷺ کے قدیم شریفین میں پہنچنا ہے۔ اگر وہاں تک نہیں پہنچے تو جو مرضی کر لیں، اقبالؒ کے بقول وہ ”بولہسی“ ہے۔ ہوس نے چھپ چھپ کر سینوں میں خدا بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی اسلام نافذ کرنا چاہتا ہے۔ کوئی ملک کا معاشی نظام ٹھیک کرنے کی کوششیں کر رہا ہے، کوئی انقلاب لا رہا ہے، کوئی سونامی برپا کرنا چاہ رہا ہے، کوئی دھرنے دے رہا ہے، کوئی عدالتی نظام کی دستگی چاہ رہا ہے، کوئی فلاحی کام کر رہا ہے۔ مگر بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا ان تمام ذمہ دار یوں کو لینے سے پہلے سیدی رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کی ہے؟ مقصد حیات پورا کیا؟ کیا رسول اللہ ﷺ کے قدیم شریفین تک پہنچے؟ کیا حضور ﷺ سے براہ راست فیض ملنا شروع ہوا؟ کیا اس مقام تک پہنچے کہ خدا بندے سے خود پوچھے کہ بتا تیری رضا کیا ہے؟ کیا خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کی؟ کیا بندہ خدا بنے.....؟

اب آپ کو دنیا کے الیہ کا جواب مل گیا ہوگا۔ بہت سے لوگ بہت اچھے اچھے کام کر رہے ہیں، مگر ابھی تک اپنے مقصد حیات سے ہی واقف نہیں۔ یعنی کلمہ پڑھ کر تو لیا مگر توحید نہیں جانتے۔ صرف کلمہ پڑھ لینا ہی توحید نہیں ہے۔ توحید تو زندگی گزارنے کی ایک ادا کا نام ہے کہ جس میں قدم قدم پر سرکٹوانا پڑتا ہے۔ اگر قدم قدم پر کفر کے معاشرے سے تصادم نہیں ہو رہا، بدروجنیں نہیں ہو رہے، اگر چربی سے کوئلے نہیں بچھ رہے، تو پھر یقیناً ہمارے لا الہ الا اللہ کہنے میں کوئی کمی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی بندہ ءمومن لا الہ الا اللہ کا نعرہ بلند کرے اور کفر کا نظام اسے ذبح نہ کر دے۔ حضور ﷺ کا ہاتھ تھامے بغیر، بندہ ءمومن اس تصادم سے بغیر و عافیت گزر نہیں سکتا کہ جو لا الہ

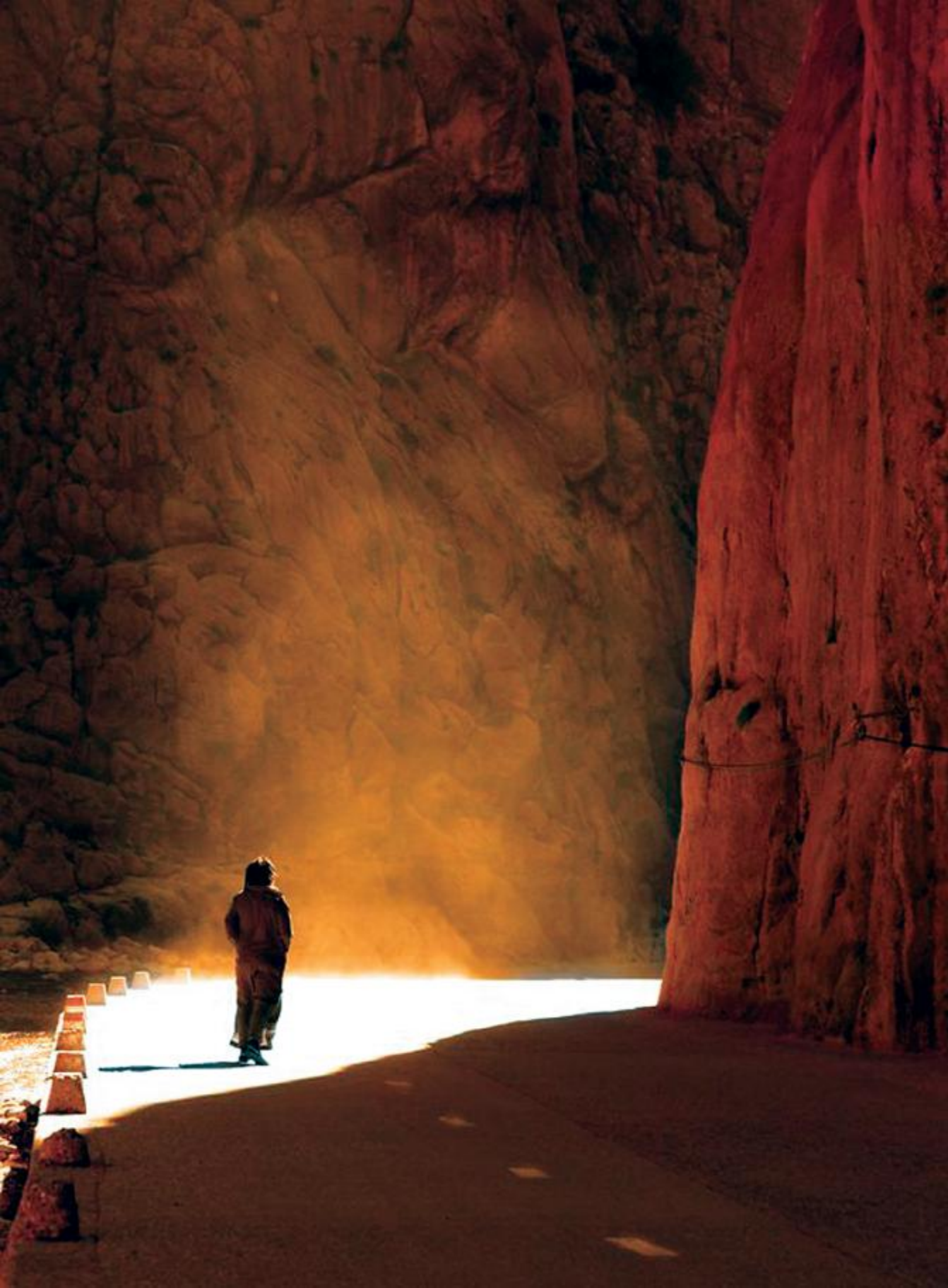
الا اللہ کہنے کے نتیجے میں برپا ہوتا ہے۔ حضور ﷺ بس ایک جملہ کہتے تھے کہ کہو اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تم فلاح پا جاؤ گے! مگر مشرکین مکہ اور انکا پورا طاعوتی نظام اس ایک جملے پر ہی بھڑک اٹھتا تھا۔ ہم روزانہ لا الہ الا اللہ کہتے ہیں، مگر کفر کا نظام کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ صرف رسم اذان ہے روح بلائی نہیں ہے۔ جس بندہ مومن کی اذان میں روح بلائی نہ ہو اس کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے اس کو اس ڈیوٹی پر متعین نہیں کیا۔ جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کسی کو کوئی ڈیوٹی دیتے ہیں، تو تاثیر ساتھ دیتے ہیں۔ جس کو تاثیر نہ ملی، اسکو اجازت بھی نہ ملی۔

ناگاہ فضا بانگِ اذان سے ہوئی لب ریز

وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دل کہسار!











## خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا مقام!

علامہ اقبالؒ نے ”ضرب کلیم“ کے ذریعے عہد حاضر کے خلاف جو اعلان جنگ کیا، ہم بھی اسی جنگ کا علم اٹھائے ہوئے ہیں۔ علامہؒ نے جدید دور میں پائے جانے والے تمام بتوں کو اسی ضرب کلیم سے پاش پاش کیا۔ لیکن یہ بات اقبالؒ اپنے کلام میں واضح کرتے ہیں کہ ان کا یہ پیغام صرف ”مرد آزاد“ کے لیے ہے، ایک ایسی قوم کے لیے کہ جس کی فکر، روح و جسم آزاد ہو۔ اقبالؒ غلاموں سے مخاطب ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ غلاموں کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر ان میں نظر، فکر، سمجھ، نور نہ ہو، تو پھر انکے کلام کو ہاتھ بھی نہ لگائیں، کیونکہ یہ ان کو تلواری کی طرح کاٹ کر رکھ دے گا۔

قرآن پاک کا بھی یہی اعجاز ہے۔ بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے، بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ لیکن گمراہ یہ صرف فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔ اقبالؒ کے کلام سے فیض لینے کیلئے بھی انسان کا کم از کم مرد آزاد ہونا ضروری ہے کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر اپنی جان، مال، عزت و آبرو قربان کرنے پر ہمہ وقت آمادہ ہو۔

آج ہم پاکستان کے حالات سے خوش نہیں ہیں۔ امت مسلمہ کی تکالیف کو ختم کرنے کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں ہے۔ ہر انسان جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے پیار کرتا ہے، وہ یہ چاہتا ہے کہ اس ظلم کے نظام کا خاتمہ ہو۔ لیکن اس سے پہلے کہ انسان اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے سامنے، امت کی خدمت کے لیے، اپنے آپ کو پیش کرے، کچھ بنیادی تربیت کے مراحل ہیں کہ جن سے اس

کا گزرنالازم ہے۔ ایک غیر تربیت یافتہ فوج کو میدان جنگ میں لے کر اتنا حکمت نہیں، خودکشی ہے۔  
اسی لیے اکبر اعلیٰ آبادی نے کہا تھا:

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے، تب کام چلے  
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ، تعمیر نہ کر

اور اقبالؔ نے بھی اسی بات کو کچھ یوں کہا:

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر  
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

یعنی جب تک تم زندگی کی حقیقتوں پر نظر نہ رکھو گے، جب تک تمہارے اندر وہ فکر، وہ سوچ، وہ تزکیہ، وہ افکار، وہ بینائی کہ جس میں گہرائی اور پاکیزگی موجود نہ ہو، تم اس ذمہ داری کو اٹھانے کے اہل نہیں ہو۔ ہم مسلمانوں کا عالم جو اس وقت ہے، بالکل ایسے ہی ہے کہ جیسے شیشے کے گھروں میں رہنے والوں کا ہوتا ہے۔ ہماری معیشت مغرب کے ہاتھوں میں ہے، ہمارا دفاع ان کے بنائے ہوئے ہتھیاروں پر منحصر۔ امت مسلمہ، قومیت، لسانیت، فرقہ واریت، مختلف گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم ہے۔ یہ قوم اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس وقت کے کفر کے نظام کا مقابلہ کر سکے۔ دنیا کے اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ جو قومیں دنیا کی تیاری زیادہ کرتی ہیں، وہ زیادہ منظم ہوتی ہیں، وہی عروج حاصل کرتی ہیں۔ مسلمان جب فطرت کے تقاضوں کو چھوڑ دیں گے، تو ظاہر ہے کہ ان پر دوسری اقوام غالب آجائیں گی۔ انگریزوں نے جب محنت کی تو اتنی بڑی سلطنت بنائی کہ اس پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اللہ کے کچھ اصول ہیں۔ وہ کفار کو بھی عروج دیتا ہے اور مسلمانوں کو بھی، مگر اس کیلئے فطرت کے قوانین یکساں ہیں۔ اسی لیے اقبالؔ فرماتے ہیں کہ اگر تم عروج حاصل کرنا چاہتے ہو تو پہلے زندگی کے حقائق پر نظر ڈالو۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب جانو۔ جوش اور غصہ میں آ کر اعلان جنگ نہ کر بیٹھنا۔ پہلے اپنے آپ کو تیار کرو، بغیر تربیت کے کوئی تعمیری تحریک ممکن نہیں ہے۔

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام

میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے جنگ

یعنی تم جس نظام کو قائم کرنے کی بات کر رہے ہو، اس کے لیے کفر سے تصادم ناگزیر ہے، لہذا تمہیں زبردست طاقت چاہیے۔ اگر آپ

خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا مقام!

پاکستان میں خلافت کے نظام کی بات کرتے ہیں تو یہ کوئی آسان منزل نہیں۔ کفر کا سارا نظام ہم پر ٹوٹ پڑے گا۔ ہم بات کر رہے ہیں پاکستان میں شریعت کے نظام کی، سود اور رباء کے نظام کے خاتمے کی، بیت المال اور نظام زکوٰۃ کی، مگر یہ نہیں ہو سکے گا، کیونکہ یہ مقام شدید زور دست یعنی قوت بازو کا متقاضی ہے۔ یہ کام آپ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روحانی والہامی طاقتوں کے بغیر، اللہ کی طرف سے دی گئی فکر و سوچ، نظر و بصیرت کے بغیر نہیں کر سکیں گے۔ میدان جنگ میں جانے کے تقاضے اور ہیں۔ میدان جنگ میں گولیوں، دھماکوں اور توپوں کی گرج سنائی دیتی ہے۔ کوئی شخص اگر یہ سمجھے کہ میدان جنگ میں اس کو موسیقی سننے کو ملے گی، تو یہ سخت نادانی ہے۔

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایہٴ حیات

فطرت ”لہو ترنگ“ ہے غافل! نہ ”جل ترنگ“

زندہ تو میں اپنی تقدیر خونِ دل و جگر سے لکھتی ہیں، فطرت تو مومن کا لہو مانگتی ہے، موسیقی کے سُر نہیں!

آج کل آپ ”امن کی آشا“ کا بہت غوغا سنتے ہیں۔ یہ پیغامات دیئے جا رہے ہیں کہ ہمیں اپنے بدترین مشرک دشمن کے ساتھ محبت اور پیار سے رہنا چاہیے، امن کی آشا رکھنی چاہیے۔ تو پھر یہ توقع نہ رکھیں کہ اللہ آپ کو دنیا اور آخرت میں عزت بھی دے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ خون طلب کرتا ہے۔ خاص طور پر اس وقت کہ جب دنیا میں کفر کا نظام رائج ہو، مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو، امت مسلمہ کفار کے زور و غمے میں ہو، تو اس دور میں خون سے کفارہ دینا پڑتا ہے، راتوں کو جاگ کر اسکے حضور رونا پڑتا ہے اور دن میں گھوٹے کی پشت پر بیٹھ کر خود کو قربان کرنا پڑتا ہے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیر امم کیا ہے

شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

آؤ تمہیں بتائیں کہ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ جیسے ہم نے شروع میں بات کی کہ جب تک زندگی کی حقیقتوں پر نظر نہیں ہو، اس میدان جنگ میں داخل ہونا موت ہے۔ یہاں جان و مال، عزت و آبرو حتیٰ کہ ایمان پر بھی حملہ ہوگا۔ بڑی بڑی جنگجو اقوام تلواروں اور تیروں سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں، لیکن اس لیے تباہ ہو جاتی ہیں کیونکہ آخر میں وہ راگ رنگ اور عیش و نشاط میں پڑ جاتی ہیں۔ جب کسی قوم کی نبض دیکھنی ہو کہ آیا یہ اسکے عروج کا وقت ہے یا تباہی کا، تو یہ دیکھیں کہ اس معاشرے میں شمشیر و سناں کا رواج ہے یا طاؤس و رباب ترقی پا رہے ہیں۔ مجاہدین نکل رہے ہیں یا میوزیکل بیڈز۔ میوزیکل بیڈز اگر کسی ایسی قوم میں رواج



پارہے ہوں کہ جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب کچھ دے دیا ہو، جیسے امریکہ اور دیگر یورپی اقوام، تو پھر انکے پاس اس کا کوئی جواز بھی ہے۔ لیکن وہ قوم کہ جو غلام بنائی جا چکی ہو، کہ جس کے ہاتھ سے دین و آبرو، ملک اور آزادی سب نکل چکے ہوں، جب وہ ان خرافات میں خود کو مبتلا کرتی ہے، تو یہ اللہ کا عذاب ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنے عروج کی منزل کو مزید دور دھکیل دیا ہے۔

جب مہاجرین ہجرت کر کے مدینہ پہنچتے ہیں تو حضور ﷺ ”مواخات“، یعنی بھائی چارہ قائم کرتے ہیں۔ ایک مہاجر آتا ہے، ایک انصار کو اسکے ساتھ کر دیتے ہیں کہ یہ تمہارا بھائی ہے۔ اسی طرح ہر مہاجر کے ساتھ ایک انصاری کو بھائی بنا دیتے ہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، ایک صحابی حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ کو لے کر اپنے گھر چلے جاتے ہیں اور گھر کا سارا سامان و حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ آپؓ کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں بیویوں کو کھڑا کر دیتے ہیں اور عبدالرحمان بن عوفؓ سے کہتے ہیں کہ جس بیوی کو پسند کرو گے، میں اسے طلاق دے دوں گا، تم اس سے نکاح کر لینا۔ تمہارا گھر میں ادھر ہی آباد کر دیتا ہوں!

انسانی تاریخ میں ایسے واقعات تصور سے بھی باہر ہیں۔ جن کو زندگی بھر نہیں ملے، جانتے نہیں، صرف حضور ﷺ کے یہ کہنے پر کہ یہ تمہارا بھائی ہے، اسے حقیقی بھائی مان لیا گیا۔ کوئی تصور بھی کر سکتا ہے اس ادب کا!

عبدالرحمان بن عوفؓ کہتے ہیں: ”میں میرے بھائی، تمہارا مال، تمہاری بیویاں اور بچے تمہیں مبارک ہوں۔ تم بس مجھے ایک دینار دے دو۔“ ان سے ایک دینار لیتے ہیں اور بازار جا کر کاغذ کا کام شروع کرتے ہیں۔ دینے والے کتنے بڑے دل کے ہیں اور جن کو دیا جا رہا ہے، وہ کتنے عالی ظرف! آج یہ خواب و خیال کی باتیں لگتی ہیں۔ یہ کردار تھا ہمارے بڑوں کا۔ جب تک یہ جرأت کر دار نہ ہو، یہ غیرت نہ ہو، یہ خود داری نہ ہو، اللہ کو بھی آپ پر پیار نہیں آتا۔ اللہ کو بھی ایسی جماعت سے ہی پیار ہوتا ہے اور پھر وہ ان کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔

یاد رکھیے گا کہ جس مشن پہ ہم نکلے ہیں، اس میں سخت آزمائشیں ہیں۔ روحانی طور پر اس میں دل کا سکون ہے، اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی قربت ہے، دو جہانوں کی سرداری، قلندری اور بادشاہت ہے، لیکن اگر ظاہری آنکھ سے دیکھو گے، تو یہ قیامت کا سفر ہے۔ کیا صحابہ کرامؓ عافیت کی زندگی گزارتے تھے؟ کیا حضور ﷺ کے صحابہ کو روپے پیسے کی تکلیف نہیں ہوئی؟ کیا ان کی صحت، تندرستی، زندگی، سلامتی قائم تھی؟ ان کو کوئی مشکل اور پریشانی نہ تھی؟ کیا ہمارے بڑوں کی زندگی عیش و آرام میں گزری؟ حقیقت یہ ہے کہ ان کی ساری زندگی طوفانوں میں گزری۔ ایک تصادم ختم نہیں ہوتا، کہ دوسرا شروع ہو جاتا۔ ایک قیامت ختم نہیں ہوتی تھی کہ دوسری آجاتی۔ سکون کہاں تھا انکی زندگی میں!

آج لوگ بزرگوں کے پاس جاتے ہیں۔ ہم بھی اللہ کے ایک ولی اور درویش کے پاس جایا کرتے تھے۔ انہوں نے ماشاء اللہ سو سال کی عمر میں انتقال کیا۔ لیکن اپنا کوئی خلیفہ نہیں چھوڑا، اپنی جگہ کسی اور کو بٹھا کر نہیں گئے۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ آپ اپنی جگہ کسی کو خلیفہ کیوں نہیں بنا جاتے، تو بڑے اداس ہو کر فرماتے ہیں کہ کوئی رب کا طالب ہی نہیں آیا، سب دنیا کے طالب آتے تھے! ان کے پاس جو



بھی حاضری دیتا، اس کا کام ہو جاتا، کوئی بیماری ٹھیک کر داتا تھا، کوئی مقدسے جتو داتا تھا، کوئی شادیاں کرو داتا تھا، کسی کو روپے پیسے کی تکلیف ہوتی تھی۔ رب کس نے مانگا؟ اہل مدینہ کو تو اللہ تعالیٰ نگاہ عطا کر چکا تھا۔ زندگی کے حقائق پہ ان کی نظر تھی، لہذا وہ بیعت عقبہ کے موقع پر جنت پر بھی راضی نہ ہوئے، اور حضور ﷺ کو طلب کر لیا۔ یہ ہوتا ہے فرق ایک زاہد میں اور ایک عاشق میں! اللہ کو اپنا دین نافذ کرنے کیلئے زاہدوں کی نہیں، ان عاشقوں کی ضرورت ہے کہ جو جرات رندانہ رکھتے ہوں۔

## سوالات و جوابات

سوال: اقبالؒ اجتہاد پر زور دیتے ہیں لیکن جب قوم فرقوں میں بٹ چکی ہو تو پھر اجتہاد کون کرے گا؟

جواب: اقبالؒ کی ساری فکر اور سوچ بندہ آزاد کیلئے ہے۔ جس کا ذہن غلام ہو، جس کی سوچ غلام ہو، اقبالؒ ایسے بے غیرتوں سے بات ہی نہیں کرتے۔ یہ امت کی بد نصیبی ہے کہ دین ہونے کے باوجود آج مسلمان پوری دنیا میں غلام ہیں۔ سعودی عرب کا حال دیکھیں، مشرق وسطیٰ اور خلیج کی مسلمان ریاستوں کی حالت پر نظر ڈالیں، دنیا کے امیر ترین ممالک ہیں، مگر کیا وہ آزاد ہیں؟ کفر کا پورا نظام مسلمانوں کے پیسے سے چل رہا ہے۔ پاکستان میں تو ہم پورا زور لگا کر تقریباً ۳۰ ارب ڈالر کی ایکسپورٹ کرتے ہیں۔ سعودی عرب کی صرف تیل کی ایکسپورٹ ۶۰۰ سے ۷۰۰ ارب ڈالر سالانہ ہے۔ پاکستان کا قرضہ ستر ارب ڈالر سے زیادہ کا نہیں ہے۔ سعودی عرب چاہے تو پاکستان کا قرضہ ایک شہزادے کے جیب خرچ سے ہی ادا کر سکتا ہے۔ پوری مسلمان دنیا میں تعلیمی نظام، پانی کا نظام، سرکاری سب کچھ تعمیر کیا جاسکتا ہے، سعودی عرب کے صرف ایک سال کے بجٹ سے۔ لیکن وہ سارا پیسہ جاتا ہے عیسائی اور یہودی بینکوں کو۔ اگر آج کفر کا نظام دنیا میں مسلمان کو تباہ و برباد کر رہا ہے، قوت اور طاقت سے مستحکم کھڑا ہے، تو بد نصیبی یہ ہے کہ اسکی پشت پر مسلمانوں ہی کا پیسہ ہے، کہ جو تقریباً نوے سال سے کفر کے نظام کو استحکام دے رہا ہے۔ اسکے بعد یہ حکمران کیا مسلمانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کر سکتے ہیں؟ پوری مسلم دنیا میں ایسے ہی حکمران ہیں، ہمارے اپنے حکمرانوں کا حال دیکھ لیجئے۔ کہنے کو تو ”جمہوری“ حکمران ہیں، ملک آزاد ہے، اپنا جھنڈا، اپنی کرنسی اور اپنا پاسپورٹ ہے، مگر درحقیقت غلام در غلام ہیں۔ چاہے وہ سیاسی حکمران ہوں یا علمائے سو۔ مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں کہ ہزار قابل افراد کے مرجانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا کہ جتنا ایک احمق شخص کے حکمران بن جانے سے۔ ایسے حکمرانوں اور علماء کا اجتہاد قوموں کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔ اسی لیے اقبالؒ کہتے ہیں کہ ”مرد غلام“ کیلئے اجتہاد حرام ہے۔ اقبالؒ اس بات پر بہت زور دیتے ہیں کہ غلام کے اجتہاد سے بہتر ہے کہ ماضی کے آزاد بندوں کی تقلید کر لی

جائے۔ اجتہاد کرنے کی شرط ہی مرد آزاد ہونا ہے، کہ جو کفر کے نظام سے ٹکرانے کی جرأت رکھتا ہو۔ اجتہاد کے حوالے سے اقبالؒ کا ایک بہت خوبصورت شعر ہے۔

ہند میں حکمت دیں کوئی کہاں سے سیکھے

نہ کہیں لذتِ کردار، نہ افکارِ عمیق

ہندوستان میں ہمیں دین کی حکمت نہیں ملتی۔ کیوں؟ نہ ہمیں کہیں کردار نظر آتا ہے، نہ جرأت۔ نہ ہی کوئی ایسا عالم نظر آتا ہے کہ جو کفر کے آگے کھڑے ہو کر اذان دے سکے۔ جو لوگ قائد اعظمؒ سے یہ گھٹیا بات کہیں کہ ہم آپ کو اس لیے ووٹ نہیں دیں گے کہ آپ شیعہ ہیں، تو ایسے لوگوں کو یہی جواب دیا جاسکتا ہے کہ پھر تم جا کر گاندھی کو ووٹ دو، وہ سنی ہوگا۔ اتنے گھٹیا ذہن کے لوگوں سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ اجتہاد کریں گے۔

حلقہء شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں

آہ محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق!

ان لوگوں میں وہ کردار کہاں ہے کہ جرأتِ مندانہ فیصلے کر سکیں۔ اقبالؒ نے جب ۱۹۳۰ء میں یہ کہا کہ میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے مغربی حصوں میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم کی جا رہی ہے، تو لوگوں کی ٹانگیں کانپ گئیں کہ آپ کیا بات کرتے ہیں! انگریزوں سے کون لڑ سکتا ہے! ۱۹۳۰ء میں وہ بابا ہمیں اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ ہندوستان توڑ کر مسلمان ریاست بنائی جائے گی۔ ۱۹۳۱ء میں تو قائد اعظمؒ ملک ہی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ علماء کی بات تو رہنے دیجئے، بڑے بڑے مسلمان سیاستدانوں اور دانشوروں کا حال یہ تھا کہ انگریزوں کی غلامی پر راضی ہو چکے تھے اور پھر انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوؤں کی غلامی پر بھی۔

اقبالؒ وضاحت کرتے ہیں کہ امت کیوں رسوا ہوئی؟ اس لیے کہ ہم نے اندھی تقلید شروع کر دی۔ حضور ﷺ نے جب دین اسلام کی دعوت دینا شروع کی تو کفار اور مشرکین کہتے تھے کہ آپ ایک نئی بات لے کر آئے ہیں۔ ہم تو اپنے بڑوں کے دین کو نہیں چھوڑ سکتے۔ مسلمانوں کے کسی فقہ میں یہ نہیں لکھا کہ خلافت ختم ہو جائے تو کیا کریں؟ مسلمانوں کے بڑے بڑے ملک اگر غلام ہو جائیں تو کیا کریں؟ آپ کو فقہ میں یہ سب کچھ نہیں ملے گا۔ مسلمانوں کو جدید فکر پیدا کرنی ہوگی تاکہ وہ غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔

جب ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو مسلمان کو یہ مسئلہ درپیش آیا کہ آیا اب یہاں جمعہ پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اب ہندوستان دارالاسلام ہے یا دارالحرب؟ دارالحرب اس ملک کو کہتے ہیں کہ جہاں کفار کی حکومت ہو۔ دارالاسلام، دارالحرب میں تبدیل ہو جائے تو کیا کیا جائے؟ اس مسئلے کا حل آپ روایتی فقہ میں تلاش نہیں کر سکتے۔ آپ کو ایک نئی سوچ، نئی فکر پیدا کرنا پڑے گی۔ ہمارے

بزرگوں نے ان سوالوں کے جواب ہی نہیں دیئے، اس لیے کہ یہ مسئلے پہلے سامنے آئے ہی نہ تھے۔ یہ جدید دور کے مسائل ہیں۔ پوری مسلمان دنیا کے بڑے بڑے علماء سمیت، سب مسلمان سود اور ربا کے نظام میں شامل ہو جائیں، تب ہم کیا کریں؟ یہ مسئلہ ہمارے بزرگوں نے کبھی اٹھائے ہی نہیں تھے، اس لیے کہ کبھی ایسا ہوا ہی نہیں تھا۔ کبھی کاغذی کرنسی اور بینکاری نظام اس طرح کا نہیں تھا۔ چنانچہ آپکو تقلید میں اسکا جواب نہیں ملے گا۔ اقبالؒ کے خطبات "Reconstruction of Religious Thought in Islam" ان مسائل پر روشنی ڈالنے اور ان کے حل کی طرف رہنمائی کیلئے ہی لکھے گئے ہیں۔

اسکے بعد اقبالؒ ایک اور کتاب لکھنا چاہتے تھے: "Reconstruction of Legal Thought in Islam"۔ یعنی اسلام میں ایک نئے فقہ کی بنیاد۔ اقبالؒ کی بڑی خواہش تھی کہ نئے دور کیلئے ایک جدید فقہ لکھیں۔ ایک ایسا فقہ کہ جو مسلمانوں کے روایتی فقہ اور قرآن و سنت سے فیض لیتے ہوئے، جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ جس میں یہ فیصلہ کیا جائے کہ جدید دور کے تقاضوں میں کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ آجکل بڑے بڑے علماء نے کاغذ کے نوٹ کو حلال قرار دے دیا ہے۔ کاغذی کرنسی، جس کی پشت پر سونانہ ہو، جعلی رسید ہوتی ہے۔ آجکل کے دور کی کاغذی کرنسی شرعی طور پر مکمل حرام ہے۔ مگر علماء نے اسکی بنیاد پر اسلامی بینکاری کو بھی حلال قرار دے دیا ہے، کیونکہ کوئی متبادل نہیں تھا۔ یہ لوگ کوئی نیا متبادل بنا ہی نہیں سکے۔ چونکہ یہ کوئی دوسرا حل نہیں دے سکے، لہذا حرام کو حلال قرار دے دیا گیا۔ اسی پہ اقبالؒ روتے تھے کہ ہندوستان میں کوئی حکمت دین کیسے سیکھے۔

### آہ محکومی و تقلید و زوال تحقیق!

علم و تحقیق ہے ہی نہیں۔ یعنی علماء "فریکشنل ریزرو بینکاری" کو جانتے ہی نہیں ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ سودی بینکاری کا یہ نظام کام کس طرح سے کرتا ہے۔ اسکے اندر کی میکینیت کیا ہے۔ نتیجتاً اسی حرام نظام پہ بنے ہوئے بینکاری نظام کو، صرف نام بدل کر "اسلامی بینکاری" کہہ دیا گیا ہے اور مشارکہ، مضاربہ کے نام پر اسی حرام نظام کو "حلال" قرار دے دیا گیا ہے۔ تحقیق ہی نہیں کی کہ سونے اور چاندی کی بنیاد پر آج کے دور میں حقیقی دولت پر مبنی معاشی نظام کیسے بن سکتا ہے۔ چنانچہ یہی جواب ہوتا تھا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ تو جو ہزاروں سال سے ہوتا آیا تھا، وہ کیسے ہو رہا تھا؟ یہ زوال تحقیق ہے! خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں! یہی اس امت کے علماء کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ ظاہر ہے سود اور ربا کو حلال قرار دینے کے فتوے بھی تو قرآن ہی سے لائے گئے ہیں۔ اللہ نے سود کو حرام اور تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ کاغذی کرنسی، بینکاری نظام اور فریکشنل ریزرو بینکاری کو حلال نہیں کیا۔ اس کی بنیاد پر جو بھی نظام بنے گا، وہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں

ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!

ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب

کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق!

وہ علماء، جو حرم کے فقیہ ہیں، اتنے بے توفیق اور بدنصیب ہو گئے کہ خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں۔ یہ طنز بڑا شدید ہے۔ ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ قرآن ناقص کتاب ہے (نعوذ باللہ)، یہ قرآن مکمل کتاب نہیں ہے، کیونکہ مومن کو یہ نہیں بتاتی کہ غلامی کس طرح کرنی ہے، طاغوت کے نظام سے سمجھوتہ کیسے کرنا ہے، سود اور رباء کے نظام میں سود کھا کر کیسے گزارہ کرنا ہے۔ ان کے نزدیک آج کے دور میں قرآن نہیں چل سکتا۔ ایسے علماء اور دانشوروں کے نزدیک آج کے دور میں تو ہم صرف غلام بن کے ہی رہ سکتے ہیں اور چونکہ قرآن میں ایسی کوئی بات لکھی نہیں ہے، لہذا قرآن، نعوذ باللہ، آج کے دور کے لیے قابل عمل نہیں ہے۔ لہذا دیکھیں کہ بڑے بڑے علماء کس طرح جمہوریت کیلئے مرے جا رہے ہیں، دانشوروں اور سیاستدانوں کو بھی دیکھیے تو لگتا ہے، گویا جمہوریت ان کا خدا ہے۔ آج کے دور کے جو بڑے بڑے بت ہیں، ان میں سے ایک جمہوریت بھی ہے۔ سود اور رباء کے خلاف کیس پاکستان کی سپریم کورٹ اور فیڈرل شریعت کورٹ کے درمیان تقریباً پچیس سال سے معلق ہے۔ فائل ادھر سے ادھر ہو رہی ہے، مگر اس پر بات نہیں کی جاتی، فیصلہ سنایا جا چکا ہے کہ سود اور رباء کا نظام پاکستان میں حرام ہے، مگر حکومت نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں دوبارہ اپیل کر رکھی ہے (استغفر اللہ)۔ میڈیا دیکھ لیجئے، پورے ملک میں پچھلے دس سالوں میں ہر مسئلے پر بحث کی گئی، سوائے اس کے کہ سود اور رباء کا نظام کیسے تبدیل کیا جائے۔ کیوں؟ کیونکہ، نعوذ باللہ، قرآن ناقص کتاب ہے۔ یہ مسلمانوں کو غلامی کے طریق نہیں سکھاتی۔

جب علماء کا یہ حال ہو تو عوام سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ اجتہاد تو علماء کو کرنا ہوتا ہے۔ علماء سے مراد صرف مدرسے کے علماء ہی نہیں ہیں بلکہ ہر مضمون کا عالم ہے۔ معیشت کا اپنا عالم ہوتا ہے، طب کا اپنا عالم، سیاست کا بھی اپنا عالم ہوتا ہے۔ اگر آج یہ فیصلہ کرنا ہے کہ چاند ستاروں پر جا کر نمازیں کس طرح پڑھی جائیں گی، تو اسکے لیے صرف فقہ کا عالم کافی نہیں ہے، آپکو جدید سائنس، فلکیات اور خلائی امور کو جاننے والا ماہر شخص بھی چاہیے۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ چاند دیکھنے کا مسئلہ بھی یہ لوگ طے نہیں کر پارہے۔ جب اکیسویں صدی میں پہنچ کر اس بات پر جھگڑا ہو رہا ہے کہ چاند نظر آیا کہ نہیں، تو ان سے یہ توقع رکھنا کہ یہ اجتہاد کر کے طاغوت کے نظام کے مقابلے میں خلافت راشدہ کا نظام پیش کر سکیں گے، عبث ہے۔ اسی قسم کے علمائے سو سے متعلق کسی نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ ایسے مولوی کے پیچھے میں نماز تو پڑھ لوں گا مگر سڑک پار نہیں کروں گا کیونکہ یہ مجھے مرادے گا۔

ہم یہ طنز علماء حق پہ نہیں کرتے، خدا خواستہ۔ وہ تو، ماشاء اللہ، دین کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ ہم ان علمائے سو کی بات کرتے ہیں کہ جنہوں نے ملک و قوم، ملت، مذہب اور دین کو فراق میں بانٹ دیا اور قتل و غارت، فتویٰ دہی، تکفیر اور جہالت کی بنیاد پر امت کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ آج اگر ہم غلام بنے بیٹھے ہیں، دین میں فتنہ و فساد ہے، تو یہ علمائے سو ہی کی وجہ سے ہے۔ دین اگر بچا ہوا ہے، تو علماء حق









اور اولیاء ہی کی برکت ہے۔

اجتہاد کرنے کیلئے سب سے پہلے فقیر، مرد درویش، قلندر اور وہ عالم چاہیے کہ جو بادشاہ وقت کے سامنے کھڑا ہو سکے، کوڑے کھالے، گردن کٹوالے، مگر سر نہ جھکائے۔ اجتہاد کرنے کی پہلی شرط ہی غیرت و جرأت ہے، اس کے بعد علم کی باری آتی ہے۔ جس شخص کی یہ سطح ہوگی، اسکا اجتہاد ٹھیک ہوگا۔ غلام یا بے غیرت شخص جب بھی اجتہاد کرے گا، امت کا بیڑہ غرق کرے گا، چاہے اس کے پاس علم کی ہزار ڈگریاں کیوں نہ ہوں۔

ہمیں ایک ایسی نسل پیدا کرنی ہے کہ جو غیرت مند بھی ہو اور آزاد بھی۔ اس کیلئے دین، شریعت اور طریقت بھی سیکھیں اور جدید دنیا کے علوم بھی، اور پھر بیٹھ کر فیصلے کریں کہ ہم کو آج کے دور میں اللہ کے دین کو نافذ، غالب اور قائم کیسے کرنا ہے۔ جتنے بتوں کو توڑنا ہے ہم، ان شاء اللہ توڑیں گے۔ جب تک ان بتوں کو ضربِ کلیم سے نہ توڑا جائے، اجتہاد کی بات بیکار ہے۔ غلام اور محکوم کا اجتہاد آنے والی صدیوں تک نسلوں کو غلام بنا کر تباہ و برباد کر ڈالتا ہے۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے

غارت گر اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

.....

سوال: توحید کی حقیقت کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا ہی توحید ہے؟

جواب: آجکل اس پہ بہت بحث ہو رہی ہے کہ کون مشرک ہے اور کون توحید پرست۔ امت میں بڑے بڑے فرقے بن گئے ہیں کہ جو ایک دوسرے پر کفر کے فتوے داغ رہے ہیں۔ توحید یعنی ”لا الہ الا اللہ“، کہ جو ہمارے کلمے کا پہلا حصہ ہے، مکمل نہیں ہوتی کہ جب تک کہ کلمے کے دوسرے حصے یعنی محمد الرسول اللہ ﷺ پہ عمل نہ ہو۔ توحید پر عمل کس طرح کرنا ہے؟ توحید کی زندہ حقیقت کیا ہے؟ کیا توحید صرف ایک لفظ یا عقیدہ ہی ہے؟ کیا توحید پر عمل صرف کلمہ پڑھنے سے ہی ہو جاتا ہے یا یہ زندگی گزارنے کے انداز کا نام ہے؟ جب تک ان سوالات کو سامنے نہیں رکھیں گے، توحید سمجھ میں نہیں آئے گی۔ توحید سمجھنے کیلئے محمد الرسول اللہ ﷺ کی حیات مبارکہ کو دیکھنا لازم ہے۔ حضور ﷺ کی احادیث مبارکہ دیکھئے۔ صحیح بخاری میں کتنی احادیث ہیں، زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے سب سے زیادہ وقت حضور ﷺ کے ساتھ گزارا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے انتہائی کم احادیث مروی ہیں، تقریباً پندرہ یا بیس احادیث۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے کوئی تفسیر بھی نہیں لکھی، کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ حالانکہ ساری زندگی حضور ﷺ کے ساتھ ہی گزاری۔ سب سے پہلے ایمان لانے والے مردوں میں سے ہیں، خلیفہء اول ہیں، تو پھر کیا سیدنا ابوبکر صدیقؓ

خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا مقام!

نے، نعوذ باللہ، دین چھپایا؟ نہیں! آپؐ نے توحید اور رسالت پر زندگی گزار کر دکھائی، اپنے عمل سے ثابت کیا، تربیت کی، مثال قائم کی، کہ مرد مومن جب توحید پر زندگی گزارتا ہے تو کس شان سے گزارتا ہے۔ توحید ایک انداز زندگی ہے، بحث کا موضوع نہیں۔

فیصل آباد کے صوفی برکت علیؒ، ماشاء اللہ، اللہ کے ولی، درویش، فقیر وقت تھے۔ انکا کمال ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں اتنی بڑی بڑی باتیں کر جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ”نہ لکھ، نہ کہہ، کر کے دکھا!“ کتنا بڑا چیلنج دیا ہے انہوں نے اپنے وقت کے علماء کو، سیاستدانوں کو، دانشوروں کو، نوجوانوں کو۔ اللہ کے بندے کر کے دکھاتے ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے کر کے دکھایا۔ ان کی پوری زندگی جس جرأت، دلیری، شجاعت، قربانی، حمیت، عشق اور ادب کے ساتھ انہوں نے حضور ﷺ کے ساتھ گزاری، اسکو توحید کہتے ہیں۔

خرد نے کہہ بھی دیا 'لا الہ' تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

شرعاً تو اس پر کافر ہونے کا فتویٰ نہیں لگے گا۔ کلمہ پڑھ لینا مسلمان ہونے کیلئے کافی ہے۔ لیکن زندگی کیسے گزاری جا رہی ہے؟ اقبالؒ اس پر بڑا طنز کرتے ہیں:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی

آج کیا ہے، فقط اک مسئلہ علم کلام

یہی توحید ایک زمانے میں زندہ قوت ہوا کرتی تھی، کہ جس کی بنیاد پر صرف پچاس برس کے عرصے میں، مسلمان سلطنت چین سے لیکر یورپ تک پھیل گئی۔ آج اسی توحید کو ماننے والے دنیا میں ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔

سیدنا عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر اللہ کی غلامی میں لانے کیلئے آئے ہیں! سیدنا خالد بن ولیدؓ نے انتہائی قلیل وسائل کے ساتھ رومی اور ایرانی سلطنتوں کے پرچے اڑا دیئے۔ ساٹھ آدمیوں کے ساتھ، آپؐ ساٹھ ہزار کے لشکر سے ٹکراتے تھے، اس یقین اور ایمان کے ساتھ کہ اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا، کہ حضور ﷺ نے مجھے ”سیف اللہ“ کہہ دیا ہے۔ توحید کی قوت اس طرح اپنا اظہار کرتی ہے۔ یہ توحید کی قوت ہی کی بدولت ہوتا ہے کہ انسان دریا کے کنارے پہنچے، دریا میں طوفان اور سیلاب برپا ہوا ہو اور وہ دریا کو حکم دے کہ خبردار! اللہ کے رسول ﷺ کی فوج آرہی ہے، اسے نقصان نہ پہنچانا! یہ توحید ہوتی ہے کہ جب عیسائی حضرت عمرؓ سے کہتے ہیں کہ دریائے نیل میں پانی نہیں ہے، وہاں ایک بچی کی قربانی دینا ہوگی، تو حضرت عمرؓ دریائے نیل میں خط ڈالتے ہیں اور اسے جلال سے کہتے ہیں کہ اگر تو اللہ کے حکم سے چلتا ہے تو چل پڑ! کسی صحابیؓ نے یہ نہیں کہا کہ سیدنا عمرؓ دریا میں یہ خط کیوں ڈال رہے ہیں اور دریا یہ خط کیسے پڑھے گا۔ کسی نے سیدنا عمرؓ پر اعتراض نہیں کیا، سب کو اتنا یقین اور ایمان تھا آپؐ پر کہ رسول اللہ ﷺ کے





خلیفہ ایسا فرما رہے ہیں، تو یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ وہ خط دریا میں ڈالا جاتا ہے اور دریا دوبارہ رواں ہو جاتا ہے۔ یہ ہے توحید کی قوت!

آج اسکی کیا حیثیت ہے؟ صرف گفتگو، بحث مباحثہ، کفر کے فتوے۔ تم کافر ہو، یہ مشرک ہے۔ میرا عقیدہ ٹھیک ہے، تمہارا عقیدہ فاسد ہے۔ میں ناجی ہوں، تم جہنمی ہو۔ ایک دفعہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے عمرہ پر جانے کا موقع دیا۔ مسجد نبوی میں کچھ سرکاری ملا بیٹھے ہوئے مسلمانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے، کہ تم مشرک ہو، تمہارا عقیدہ ٹھیک نہیں ہے، ہمارا عقیدہ ٹھیک ہے۔ ان سے ہم نے یہی سوال کیا کہ اگر تمہارا عقیدہ اتنا ہی ٹھیک ہے، تو آج سعودی عرب میں امریکی فوجی اڈے کیوں ہیں؟ آج سعودی عرب امریکہ کا غلام کیوں ہے؟ آج اسکے سارے پیسے یہودی بینکوں میں کیوں رکھے ہوئے ہیں؟ تمہارے اخلاق اتنے خراب کیوں ہیں؟ تمہارے مذہب میں اتنی شدت کیوں ہے؟ ان کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔

توحید کا مطلب کیا صرف علمی طور پر عقیدہ ٹھیک ہونا ہی ہے؟ یہ کہہ دینا کافی ہے کہ میرا عقیدہ ٹھیک ہے اور تم مشرک ہو؟ حضور ﷺ نے تو حکم دیا تھا کہ اس جزیرہ نما حجاز سے کافروں اور مشرکوں کو نکال باہر کرو۔ آج اس پورے حجاز میں امریکہ، یہودیوں اور نیٹو کے اڈے بنے ہیں۔ یہ کنوسی توحید ہے کہ وہاں سودا اور ربا کے نظام کو قائم کر کے وہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے خلاف حالت جنگ میں تو ہیں، مگر پھر بھی یہ تکبر کہ ہمارا عقیدہ ٹھیک ہے۔

توحید ایک زندہ حقیقت کا نام ہے۔ لا الہ الا اللہ کی تعریف قرآن یہ کرتا ہے: ”تو پھر جس نے طاعوت کا کفر کیا اور اللہ پر ایمان لایا، تو یقیناً اس نے وہ مضبوط ترین سہارا (عروۃ الوثقی) تھام لیا، کہ جو ہرگز ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔“

اقبال فرماتے ہیں:

روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو

خود مسلمان سے ہے پوشیدہ مسلمان کا مقام

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میرے اندر توحید کی شمع روشن ہے، اس کا عقیدہ ٹھیک ہے، وہ توحید پر چلنے والا ہے اور پھر اس توحید کی روشنی اس کے وجود میں چمک نہ پیدا کر رہی ہو، تو پھر وہ مسلمان اپنے مقام سے آگاہ ہی نہیں ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ بندہ مومن توحید پر یقین بھی رکھتا ہو اور طاعوت اور کفر کی غلامی بھی قبول کر لے۔ اگر غلام بنا دیا گیا ہے، یا کفر کی حکمرانی پر راضی ہے، تو اس کو توحید کا ہیضہ تو ہو سکتا ہے، مگر وہ توحید سے واقف نہیں ہے۔

”وہ نبوت ہے مسلمان کیلئے برگِ حشیش

جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام“







## ”قل هو اللہ“ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

پچھلے باب میں ہم نے توحید پر بات کی تھی اور اب اسی سلسلے کو آگے بڑھائیں گے۔ علامہ اقبالؒ نے فلسفہ توحید کی نہایت ہی حیرت انگیز جہتیں بیان کی ہیں۔ توحید ایک زندہ و جاوید حقیقت ہے۔ جب بندہ مومن اپنی زبان سے لا الہ الا اللہ ادا کرتا ہے تو وہ فقط الفاظ ہی نہیں ہوتے۔ یہ کلمہ اس کے وجود میں ان روحانی طاقتوں کو بھی جنم دیتا ہے کہ جس کے بعد:

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا

سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

حضور ﷺ نے ایک بار فرمایا تھا کہ ایک دور آئے گا کہ جب دنیا کی قومیں تم پر اس طرح جھپٹیں گی کہ جیسے دسترخوان پر بھوکے کھانے پر ٹوٹے ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے بہت حیران ہو کر پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا اس وقت ہم تعداد میں بہت کم ہونگے؟ حضور ﷺ نے جواباً فرمایا کہ نہیں! تم لوگ تعداد میں اتنے زیادہ ہو گے کہ جیسے سمندر پر جھاگ ہوتی ہے۔ صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! پھر ہمارا یہ حشر کیوں ہوگا؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو وہن کی بیماری لگ جائے گی، یعنی تم دنیا کی محبت میں اور موت کے خوف میں مبتلا ہو جاؤ گے!

حضور ﷺ نے جس بیماری کی طرف اشارہ کیا ہے، یعنی وہن، وہ انسان کو تنہی لاحق ہوتی ہے کہ جب اس کا اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر ایمان اور فلسفہ توحید پر یقین کمزور پڑ جاتا ہے۔ جب وہ توحید کو صرف علم الکلام کی بحث تک محدود کر دیتا ہے، تو توحید کی روشنی اس کے کردار کو منور نہیں کرتی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بھی کلمہ طیبہ کا ذکر مختلف حوالوں سے کیا ہے۔ ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”کیا تم نے اس شخص کو دیکھا کہ جس نے اپنی خواہشات نفس کو اپنا الہ بنا رکھا ہے۔“ اگرچہ جب مسلمان کلمہ طیبہ پڑھ لیتا ہے، تو وہ مشرک تو نہیں رہتا، لیکن اکثر اوقات اس کے دل میں ہوس اور لالچ برقرار رہتی ہے۔ حضور ﷺ نے اپنی حدیث مبارکہ میں بھی یہ نہیں فرمایا کہ وہ لوگ مشرک ہو جائیں گے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ان کو وہن کی بیماری لگ جائے گی۔

جو انسان خواہشات نفس کا غلام بن جاتا ہے، فقہ کی رو سے تو وہ کافر و مشرک نہیں ہوتا، کیونکہ وہ کلمہ گو ہوتا ہے، لیکن عشق اور عقیدت کی زبان میں وہ پھر بندہ مومن کے اس مقام پر بھی فائز نہیں رہتا کہ جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔

مسلمان جب کلمہ پڑھتا ہے تو وہ ہر اس طاغوت کا انکار کرتا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے مقابلے پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس سے مراد صرف لکڑی اور پتھر کے بت نہیں ہوتے، بلکہ قومیت پرستی، اشتراکیت، آمریت، جمہوریت یا کوئی بھی نظریہ یا فلسفہ بھی اس میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے طاغوت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ طاغوت ایک فرد کا نام نہیں ہے، یہ ایک پورا نظام ہے۔ توحید کے حقیقی معنی جاننا چاہتے ہیں، تو کلمہ طیبہ کا صرف زبان سے ورد نہ کریں۔ ہمارے ہاں کلمہ طیبہ کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے، حالانکہ کلمے میں اللہ کے ایک ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ، کوئی الہ نہیں سوائے اللہ کے! یعنی نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے۔ الہ کا ترجمہ ایک لفظ میں کیا ہی نہیں جاسکتا۔ کہیں انسان اپنی خواہشات نفس کو الہ بناتا ہے، تو کہیں کفر کا نظام خود الہ بن بیٹھتا ہے۔ مومن ان سب خداؤں کا انکار کرتا ہے۔ اس لحاظ سے دنیا میں سب سے بڑا ”کافر“ بندہ مومن ہوتا ہے، لیکن بندہ مومن کفر اور طاغوت کا کافر ہوتا ہے، نعوذ باللہ، وہ اللہ کا کافر نہیں ہوتا۔

اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے کیلئے اپنی ذات کا انکار بھی ضروری ہے۔ ابلیس اسی لیے تباہ ہوا کیونکہ اس نے اپنی ذات کا انکار نہیں کیا تھا۔ پہلے وہ انتہائی مقرب جن تھا، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تخلیق کیا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کرو، تو سب فرشتوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔ ابلیس نے انکار کر دیا اور تکبر میں کہا کہ میں آگ کا بنا ہوا ہوں، جبکہ آدمؑ مٹی سے بنے ہیں۔ اس وقت ابلیس کا الہ کیا تھا؟ اس کا الہ اس کی خواہشات نفس تھیں۔ اس کو اسے تکبر نے مروادیا۔ اسکو برباد کرنے والی شے اسکی اناتھی۔ آج بھی انسانوں کو سب سے زیادہ تباہ و برباد کرنے والی چیز انکی جھوٹی انا اور غرور ہے۔

ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ میں سکون چاہتا ہوں۔ بزرگ نے جواب دیا کہ بہت آسان طریقہ ہے۔ اپنے جملے میں سے ”میں“ نکال دو اور ”چاہتا ہوں“، یعنی ”want“ کا لفظ بھی نکال دو۔ ان دو الفاظ یعنی انا اور خواہشات نفس کو نکالنے کے بعد صرف ”سکون“ ہی

باقی رہ جائے گا۔ انسان کا المیہ ہی یہ ہے کہ اپنی انا کو سینے سے لگائے رکھتا ہے اور سکون بھی چاہتا ہے۔ طاعوت سے مراد انسان کی اپنی ذات سے لے کر زمانے کا ہر کفر ہے۔ بندہ مومن کی صفات میں یہ صفت بھی شامل ہے کہ جب وہ کلمہ پڑھتا ہے تو اپنی ذات سے لے کر کفر کے تمام نظاموں کا انکار کرتا ہے۔ وہ دین اور دنیا کو الگ نہیں رکھتا، بلکہ دنیا گزارنے کو دین جانتا ہے۔ اسکا اٹھنا، بیٹھنا، چلنا، پھرنا، پہننا، اوڑھنا، بیوی بچوں سے تعلقات، حکمرانی، سیاست، جنگ، سب دین کا حصہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے ایسا تعلق رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی زبان بن جاتا ہے کہ جس سے وہ بولتا ہے، اسکا ہاتھ بن جاتا ہے کہ جس سے وہ کام کرتا ہے۔ یہ مقام مومن کو تب عطا ہوتا ہے کہ جب وہ ”الا اللہ“ پر پہنچتا ہے۔ وہ اللہ سے راضی ہوتا ہے اور اللہ اس سے۔ اس بندہ مومن اور آج کے مسلمان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے، حالانکہ کلمہ تو دونوں ہی پڑھتے ہیں، لیکن اگر صرف زبانی کلمہ پڑھیں گے تو زبانی ہی حضور ﷺ تک پہنچیں گے، لیکن اگر اس طرح کلمہ پڑھیں گے کہ جیسے بندہ مومن پڑھتا ہے، تو وہ کلمہ آپ کو براہ راست اللہ اور اسکے رسول ﷺ تک پہنچا دے گا، کہ پھر یہ رشتہ کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ جس کا زبانی ایمان مکمل ہوا وہ حضور ﷺ تک زبانی پہنچے گا اور جس کا روحانی ایمان مکمل ہوا، وہ حضور ﷺ تک روحانی طور پر پہنچے گا۔ اب آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ ہمارے کلمہ پڑھنے اور بزرگوں کے کلمہ پڑھنے میں کیا فرق ہے۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود

ہوتی ہے بندہ مومن کی اذال سے پیدا

ہمارے دین، ہمارے کردار اور ایمان کی بنیاد توحید پر ہے۔ توحید مکمل ہوتی ہے، تو رسالت سے رشتہ جڑتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص مشرک ہو اور رسول اللہ ﷺ سے رشتہ جوڑ لے۔ اسی طرح یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی شخص بے ادب اور گستاخ رسول ﷺ ہو اور پھر اسکی توحید بھی مکمل ہو۔ آپ کو اپنی توحید کو درست کرنا ہے۔ اپنی جان و مال، عزت و آبرو سب کچھ اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر قربان کرنا ہے۔ طاعوت کا کفر کرنا ہے۔ اسکے بعد ہی حضور ﷺ سے آپ کا تعلق اور روحانی نسبت قائم ہوگی۔

شرک کی بہت سی تعریفیں احادیث شریف میں بیان کی گئی ہیں۔ ایک حدیث میں تو یہ بھی ہے کہ جس کسی نے دکھاوے کیلئے نماز پڑھی، تو اس نے بھی شرک کیا۔ ریاکاری کو بھی شرک میں شمار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ خالص چیز کو پسند کرتا ہے۔ اگر ایک شخص بہت سے بہترین کام کرتا ہے، نماز پڑھتا ہے، روزے رکھتا ہے، اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے، مسجدیں بنواتا ہے، لیکن اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ دنیا والے یہ کہیں کہ کتنا نیک انسان ہے، تو ایسے شخص کے اعمال اللہ کے ہاں قبول نہیں کیے جاتے۔ مگر فقہ کی رو سے آپ ایسے شخص کو کافر یا مشرک نہیں کہہ سکتے۔ اگر اسکے دل میں دکھاوے کی نیت تھی، تو وہ اللہ تعالیٰ کو تو دھوکہ نہیں دے سکتا۔ لہذا وہ اللہ کے نزدیک منافق اور ریاکار ہی رہے گا۔ قیامت کے دن اسکی کوئی نیکی اسکے کام نہیں آئے گی۔

جب انسان کی نیت خراب ہوتی ہے، تو اس کے کام میں سے برکت نکال لی جاتی ہے۔ اگر انسان کے کام میں برکت نہ رہے، وہ دنیا



میں ذلیل و رسوا ہو رہا ہو، اللہ تعالیٰ کے ہاں اسکے اعمال قبول نہ ہو رہے ہوں، محنت کا پھل وصول نہ ہو رہا ہو، تو انسان کو توبہ و استغفار اور اللہ سے رجوع کرنا چاہیے اور ایک لمحے کیلئے سوچنا چاہیے کہ وہ کہاں غلطی کر رہا ہے۔ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقہ تھا۔ اگر ان سے کوئی کام نہ ہو رہا ہو، تو وہ استغفار شروع کر دیتے۔ وہ سوچتے کہ اللہ ان سے ناراض ہے یا پھر انہیں آزمائش میں ڈال رہا ہے۔ مسئلہ تو ایک ہی طرح کا ہے، لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ اللہ ناراض ہے یا آزمائش میں ڈال رہا ہے؟ یہ بات اس کیفیت سے پتہ چلتی ہے کہ جو بندہ مومن کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اگر اللہ سے شکوہ و شکایت پیدا ہو رہی ہے، غصہ آ رہا ہے، تو یہ اللہ کی طرف سے سزا ہے۔ اگر دل مطمئن ہے، انسان اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے، اور صبر سے اس مشکل کو سہہ رہا ہے تو یہ اللہ کی طرف آزمائش ہے۔

ایک مرتبہ حضرت حظلہؓ مدینہ کی گلیوں میں نعرے لگاتے پھر رہے تھے کہ حظلہؓ منافق ہو گیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے وجہ دریافت کی، تو انہوں نے فرمایا کہ میں حضور ﷺ کی محفل میں ہوتا ہوں، تو میری کیفیت کچھ اور ہوتی ہے، بعد میں مجھے وسوسے آنے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے اللہ اور اس کے رسول ﷺ حتیٰ کہ خود پر بھی شک ہونے لگتا ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا کہ ایسی کیفیت تو میری بھی ہوتی ہے، چلو رسول اللہ ﷺ سے پوچھتے ہیں۔ حضور ﷺ کے پاس گئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ایمان کی نشانیوں میں سے ہے، فکر کی کوئی بات نہیں، یہ کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں، یہ ہر مومن کے ساتھ ہوتا ہے! مگر آپ نے یہ کبھی نہیں سنا ہوگا کہ عبد اللہ بن ابی منافق کی کیفیت تبدیل ہوئی ہو۔ وہ شروع سے آخر تک منافق ہی رہا۔ اسے کبھی شک ہی نہیں ہوا کہ وہ غلطی پر ہے۔ جبکہ اہل ایمان حضور ﷺ سے بار بار تصدیق کرواتے تھے کہ ہم صحیح راستے پر ہیں یا نہیں!

بندہ مومن کو بہت محتاط ہونا چاہیے۔ انسان کو جو چیز تباہ و برباد کرتی ہے، وہ تکبر ہے۔

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو

کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

یعنی عبادات اور نیکیوں کی زیادتی نے واعظ کو اتنا متکبر بنا دیا ہے کہ اس نے اللہ کے بندوں پر کفر کے فتوے لگانا شروع کر دیئے ہیں۔ انسان کو نیکیوں کا تکبر زیادہ ہلاک کرتا ہے بہ نسبت گناہوں کے۔ تکبر کا فتنہ ابلیس انسانوں میں پیدا کرتا ہے۔ تکبر آتے ہی توحید چلی جاتی ہے۔ ابلیس نے کتنی عبادات کیں، مگر جب تکبر کیا، تو عزازیل سے ابلیس بن گیا۔ ہمیں بتا دیا گیا ہے کہ جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا، وہ جنت میں نہیں جائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ مومنین اس معاملے میں بہت محتاط ہوتے ہیں۔ تکبر اس بات کی نشانی ہے کہ انسان کی توحید مضبوط نہیں ہے۔ اگر کوئی عالم یہ کہے کہ اسکی توحید مضبوط ہے، مگر وہ یہودیوں اور غیر مسلموں سے ڈرتا بھی ہو، اسلام کے خلاف فتوے بھی دیتا ہو، تو اسکا مطلب ہے کہ وہ توحید پرست نہیں، فتنہ گر ہے۔ مومن تو امام احمد بن حنبلؒ جیسا ہوتا ہے کہ جو کوڑے تو کھائے، مگر حکمرانِ وقت کے حق میں فتویٰ دینے سے انکار کر دے۔ ایسی ہستیاں صدیاں گزرنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں اور ان کے نام

عزت و احترام سے لیے جاتے ہیں۔

بادشاہ اکبر کے سامنے مجدد الف ثانی ڈٹ گئے تھے۔ اس وقت درجنوں علماء تھے کہ جنہوں نے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ اکبر نے دین الہی ایجاد کیا کہ جس کے تحت یہ طے پایا تھا کہ سلام کے بجائے آداب کہا جائیگا۔ نماز، زکوٰۃ اور حجاب وغیرہ پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ اُس وقت جنہوں نے اس بدعت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اسکا انکار کیا، طاغوت سے کفر کیا، انہی کی توحید ٹھیک تھی۔ آج بھی اگر آپ نے کسی کی توحید کی سچائی کا اندازہ لگانا ہے، تو یہ بات دیکھیں کہ وہ کفر کے خلاف کس حد تک ڈٹا ہوا ہے اور اسکا کردار کیا ہے؟ اگر وہ کفر سے سمجھوتہ کیے بیٹھا ہو، خوفزدہ ہو، غلامی پر راضی ہو، تو اس کا دعویٰ توحید سوائے خرافات کے کچھ بھی نہیں۔

ایک وقت تھا کہ جب توحید زندہ قوت تھی۔ اسکے اثرات لوگوں کی زندگیوں پر نظر آتے تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ دعا پڑھ کر زہر تک پی لیتے تھے اور ان کو کچھ نہیں ہوتا تھا۔ آپؐ کی فتوحات کے زمانے میں مسلمانوں نے ایک علاقے میں دو جمعے کبھی نہیں پڑھے۔ ہر ہفتے ایک نیا شہر فتح کرتے۔ وہاں نماز جمعہ ادا کرتے اور پھر اگلا شہر فتح کر کے دوسرا جمعہ دوسرے شہر میں پڑھا جاتا، تیسرا جمعہ تیسرے شہر میں ہوتا۔

ایک مرتبہ مسلمانوں نے شام فتح کر لیا، تورومی مصر کے راستے دولاکھ کی فوج لے کر مقابلہ کرنے آ گئے۔ مسلمانوں کے پاس ان کے مقابلے میں بہت کم فوج تھی۔ صحابہؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ کو مشورہ دیا کہ دمشق کے قلعے کے اندر بند ہو کر جنگ کرتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت خالد بن ولیدؓ جلال میں آ گئے کہ ہم نے آج تک قلعہ بند ہو کر جنگ نہیں کی۔ اب بھی باہر نکل کر ہی جنگ کریں گے۔ مسلمانوں کی تعداد صرف بیس پچیس ہزار کے لگ بھگ تھی، جبکہ دشمن کی فوج دولاکھ تھی۔ جب حضرت ابوعبیدہؓ مسلمانوں کی صفوں کو ترتیب دے رہے تھے، تو حضرت خالد بن ولیدؓ تقریباً دو ہزار سپاہیوں کو لے کر دشمن کی نقل و حرکت دیکھنے نکل گئے۔ وہ صرف جاسوسی کی غرض سے گئے تھے۔ مگر وہاں جا کر انہوں نے اپنے دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ ہی رومی لشکر پر چڑھائی کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دولاکھ کی فوج کا صفایا کر دیا۔ واپس آ کر حضرت ابوعبیدہؓ کو اطلاع دی کہ دشمن کی فوج کا صفایا کر دیا گیا ہے، لہذا اب واپس قلعے میں تشریف لے چلیے۔ یہ تھی توحید کی قوت!

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میری توحید بہت مضبوط ہے، مگر اسکا دل پتھر کا ہو، تو یہ ناممکن ہے۔ حضور ﷺ کی ایک حدیث شریف میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص نرمی سے محروم کیا گیا، وہ ہر خیر سے محروم کیا گیا! مضبوط توحید کا حامل شخص بخیل بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ مال و دولت خرچ کرنے سے نہیں گھبراتا اور صدقہ و خیرات کرتا رہتا ہے۔ مضبوط توحید کا حامل شخص دوسرے مسلمان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے، اسکی غیبت نہیں کرتا۔ اگر کوئی شخص ان خصوصیات کا حامل نہ ہو اور پھر بھی وہ یہ دعویٰ کرے کہ اسکی توحید مضبوط ہے، تو وہ جھوٹ بولتا ہے! ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم سود اور شراب کو تو حرام سمجھتے ہیں، مگر غیبت کو حرام نہیں سمجھتے اور بہت ذوق و شوق سے اپنے مسلمان بھائیوں کی غیبت کرتے ہیں۔ کسی بھی محفل میں جائیں ہمیشہ غیر موجود لوگوں کی برائی ہو رہی ہوتی ہے۔ حالانکہ غیبت کو دین







میں اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ کوئی شخص یہ کہے کہ میرا عقیدہ درست ہے، مگر وہ غیبت بھی کرتا ہو، مردہ بھائی کا گوشت کھاتا ہو، پتھر دل ہو، بخیل ہو، بزدل ہو، بے غیرت ہو یا ناپاک اور غلیظ رہتا ہو، تو ایسا قطعاً ممکن نہیں!

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے  
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے  
جہاں میں بندہ حر کے مشاہدات ہیں کیا  
تیری نگاہ غلامانہ ہو تو کیا کہیے

میں نے اے میر سپہ! تیری سپہ دیکھی ہے  
”قل هو اللہ“ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام

سورۃ اخلاص نکتہ توحید کی تفسیر ہے۔ اقبال کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں آیات قرآنی اور حکمت رحمانی کو اس طرح پروتے ہوئے چلے جاتے ہیں کہ پورے دین کی حکمت چند اشعار میں ہی سما جاتی ہے۔ امت مسلمہ اور اس کے قائدین کے بارے میں اقبال بڑے دکھ سے فرماتے ہیں کہ اب امت کے پاس ”قل هو اللہ احد“ یعنی توحید کی تلوار باقی نہیں رہی۔ اللہ لا شریک ہے، بے نیاز ہے۔ اسی طرح اس کے بندے بھی بے نیاز ہوتے ہیں، طاعوت کی شرکت قبول نہیں کرتے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اللہ کا بندہ بھی ہو اور بے نیاز نہ ہو۔

جو لوگ اللہ کو ”الصد“ نہیں سمجھتے، وہ اپنی ساری نسبتیں، ذات برادری، قومیت اور تعصب جاہلیہ پر رکھتے ہیں۔ اگر اللہ ہر طرح کے رشتوں سے بے نیاز ہے، تو اسکے بندے کو بھی ظاہری رشتوں سے بے نیاز ہو کر صرف اپنے رب سے نسبت جوڑنی چاہیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ جنگ بدر کے موقع پر حضور ﷺ کے ساتھ کھڑے تھے، جبکہ مد مقابل لشکر میں ان کا بیٹا بھی شامل تھا۔ اس جنگ میں کئی خاندان دونوں لشکروں میں تقسیم تھے۔ بعد میں جب حضرت ابوبکر صدیقؓ کا بیٹا ایمان لے آیا، تو آپؐ سے فرمایا کہ ابا جان! جنگ کے دوران آپؐ ایک بار میری تلوار کی زد میں آئے تھے، مگر میں نے آپؐ پر وار نہ کیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم! اگر تم میری تلوار کی زد میں آتے تو میں تمہیں نہ چھوڑتا۔ کیونکہ تم اس وقت اللہ کے رسول ﷺ کے دشمن تھے! یہ ہے عملی توحید!

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا، نہ فقیہ

وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

مسلمان امت کو آپ تب تک اکٹھا نہیں کر سکتے کہ جب تک کہ آپکا کردار اعلیٰ نہ ہو۔ اس بات کو چھوڑ دیجیئے کہ کس کا مسلک ٹھیک ہے۔ اس بات پر تو تمام مسلک کا اتفاق ہے کہ جرأت کردار ہونی چاہیے، سچ بولنا چاہیے، جھوٹ سے پرہیز کرنا چاہیے، کفر اور طاغوت کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ جب مسلمان خود کو با کردار انسان بنالیں گے، تب یہ مسلکوں اور فرقوں کے اختلافات بھی ختم ہو جائیں گے۔

ہم سے سوال کیا جاتا ہے کہ آپ پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی بات کرتے ہیں، تو ایسی صورت میں آپ کونسا مسلک نافذ کریں گے؟ یہ سوال غلاموں کے ہیں۔ مرد آزادی چلی پرواز نہیں کرتے۔ کونسا مسلک یہ چاہتا ہے کہ اس ملک میں سود اور رباء کا نظام چلتا رہے؟ کونسا مسلک ایسا نہیں چاہتا کہ لوگ زکوٰۃ لے کر پھریں اور کوئی لینے والا نہ ملے؟ کونسا مسلک ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ تمام مسلمانوں کو متحد کر کے ”ریاست ہائے متحدہ اسلامیہ“ نہ بنائیں؟ کونسا مسلک ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ غزوہء ہند نہیں ہونا چاہیے؟ کونسا مسلک کشمیر، فلسطین اور مقبوضہ مسلمان علاقوں کی آزادی کے حق میں نہیں ہے؟

ہم جن مسائل کی بات کر رہے ہیں، وہ مسلکی سطح سے بالاتر ہیں۔ تمام مسلک اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمانوں کو عزت و آبرو ملنی چاہیے۔ جو اس فرض کے انجام دہی کیلئے کھڑا ہوگا، وہی امام برحق ہوگا، کہ جو پوری امت کو متحد کریگا۔ جو اس ڈیوٹی کو ادا کریگا، اسی کی توحید اور اسی کا عقیدہ درست ہوگا!







## زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی

ہم توحید پر اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہیں۔

بندهء مومن کا زیور اسکی توحید ہے، اللہ تعالیٰ پر اسکا اعتماد اور یقین ہے۔ اسکا یہ یقین محکم اسے اپنی جان، عزت و آبرو، اپنا ایمان اور اپنا سب کچھ اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر قربان کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بہت خوبصورتی سے توحید کو بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کے کلام ”ضرب کلیم“ سے کچھ اشعار آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ وہ رزق جو اللہ تعالیٰ نے آنے والی نوجوان نسل کیلئے رکھا ہوا ہے، وہ رزق، ان شاء اللہ، کلام اقبالؒ کے فیض اور برکت سے تقسیم ہوگا۔

کفار کی طرف سے مسلمانوں کو یہ کہا جاتا ہے کہ اگر تم نے اسلام پر عمل کرنا ہے تو اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی کوئے میں بیٹھ کر چلے کشتی کرو، کہیں جا کر چند دن اعتکاف کر لو، اپنا ذکر، تسبیح، مناجات جتنا چاہو کرو، روزے رکھو، نمازیں پڑھو، تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ مگر کبھی یہ بات نہ کرنا کہ خلافت کو دوبارہ قائم کرنا ہے، سودا اور رباء کا نظام ختم کرنا ہے، شریعت نافذ کرنی ہے، یا مقبوضہ اسلامی علاقوں کو جہاد کے ذریعے آزاد کرانا ہے۔ پہلا والا اسلام تو کفر کو قبول ہے، مگر یہ دوسرا اسلام ناقابل ہضم۔ کفار اور منافقین کے نزدیک، دین صرف ایک ذاتی معاملہ ہے اور مسلمانوں کی سیاست اور ریاست سے اس کو جدا ہی رکھنا چاہیے۔ اس کام کیلئے زر خرید ملا، ضمیر فروش مفتی اور ”دورِ کعت کے امام“ قرآن ہی سے دلیلیں لاتے ہیں اور نقطہء توحید کی عجیب و غریب تفسیریں کرتے ہیں۔



اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم

جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

یہ وہ قرآن ہے کہ جس نے مسلمانوں کو وہ طاقت دی کہ ہم ستاروں پر کمندیں ڈالا کرتے تھے۔ پوری دنیا پر حکمرانی کیا کرتے تھے۔ اب اسی مسلمان کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ دنیا کو ترک کر کے کونے میں بیٹھ کر تسبیح و مناجات کرو، تمہاری ذاتی زندگی اور ہے اور سیاسی زندگی اور۔

’تن بہ تقدیر‘ ہے آج ان کے عمل کا انداز

تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر

آج مسلمان کا حال یہ ہے کہ وہ تن بہ تقدیر، ہاتھ پہ ہاتھ دھرے کسی معجزے کے انتظار میں بیٹھا ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب وہ ارادہ کرتا، تو اللہ اس کے ارادے کو ہی اسکی تقدیر بنادیا کرتا تھا۔ آج مسلمانوں کی بے سروسامانی، ذلت و رسوائی اور بے حسی کا یہ عالم ہے کہ سب کچھ تباہ و برباد کروانے کے بعد بھی یہ کہتے ہیں کہ ہماری تقدیر میں یہی لکھا تھا۔ ارے نادانو! تمہاری تقدیر میں یہ نہیں لکھا تھا! تمہاری تقدیر میں تو یہ لکھا تھا کہ تم خدا کے راز دار ہو، تمہاری ہاں اور ناں میں دنیا کے فیصلے ہونگے۔ تم نے یہ تقدیر کیوں نہ نافذ کی؟ تم نے وہ تقدیر کیوں قبول کر لی کہ جو کفار نے تمہارے لیے لکھی؟

اس کی وجہ اقبالؒ یہ بتاتے ہیں:

تھا جو ’ناخوب‘ بتدرج وہی ’خوب‘ ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

امت کے زوال، اسکی رسوائی اور غلامی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہوتا ہے کہ قوموں کے ضمیر بدل جاتے ہیں۔ جو پہلے ناقابل تصور ہوتا ہے، غلامی کے دور میں معاشرے کا رواج بن جاتا ہے۔ جس ذلت و رسوائی کے تصور سے ہی ہمارے بڑوں کی روح کانپ اٹھتی تھی، اب ہماری نسلیں اس میں اپنی عزت تصور کرتی ہیں۔ جب مسلمان آزاد تھے تو اس وقت یہ تصور بھی ناممکن تھا کہ مسلمان دارالاسلام چھوڑ کر یورپ کے دارالکفر میں آباد ہونگے۔ تیرہ سو سال کی اسلامی تاریخ میں، کوئی ایک بھی مسلمان حکمران، عالم، دانشور، تاجر حتیٰ کہ کسان یا گڈ ریا بھی خلافت عباسیہ، عثمانیہ یا اندلسیہ کو چھوڑ کر کافر یورپ میں آباد نہیں ہوا، کہ جہاں کفار کے درمیان زندگی گزارنی پڑے۔ آج غلامی کے دور میں لاکھوں مسلمان اسلامی ممالک کو چھوڑ کر بہت شوق سے دارالکفر میں آباد ہوتے ہیں، اپنی اولادوں کو بڑا کرتے ہیں اور دین اور ایمان کو خطرے میں ڈالتے ہیں۔

جب قوم غلام ہوتی ہے تو انکا ضمیر بدل جاتا ہے۔ ہم جب چھوٹے تھے تو ہمارے ٹیلی ویژن پر صرف پی ٹی وی چلا کرتا تھا۔ اس وقت پی

ٹی وی میں ایسے ڈرامے چلتے تھے کہ جنہیں فیملی ڈرامہ کہا جاتا تھا۔ پورا کنبہ ساتھ بیٹھ کر دیکھتا۔ تب ٹیلی ویژن بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہوئے شرم نہیں آتی تھی۔ اشفاق احمد صاحب ڈرامے لکھا کرتے تھے۔ ایسے ڈرامے کہ جن کو دیکھنے کے بعد عشق رسول ﷺ، ادب رسول ﷺ، پاکستان کی محبت ہمارے وجود میں پیدا ہوتی تھی۔ ہم انسانیت سیکھا کرتے تھے۔ آج حالت یہ ہے کہ ڈرامے تو دور کی بات، ٹی وی پہ اشتہار دیکھ کر انسان کو شرم آ جاتی ہے۔ کبھی جو نا خوب تھا، وہی بتدریج خوب ہوا!

جو چیز کل حرام تھی، وہ آج بھی حرام ہے۔ زمانہ گزرنے سے حرام، حلال نہیں ہو جاتا۔ فرق یہ ہے کہ ایک مرد غلام اس حرام کو قبول کر لیتا ہے جبکہ ایک مرد آزاد اس کے مقابلے پر صف آراء ہو جاتا ہے۔ کفر کو قبول کرنا اس بات کی نشانی نہیں ہے کہ ہم روشن خیال ہو گئے ہیں، ہم نے ترقی کر لی ہے، بلکہ اس لیے ہے کہ آج ہمارا ضمیر پہلے کے مقابلے میں زیادہ مردہ ہو چکا ہے۔ جسمانی طور پر تو ہم آزاد ہیں، پاکستان کا اپنا جھنڈا بھی ہے، ہمارا اپنا آئین بھی ہے۔ مگر ہر قسم کی خرافات، ہر قسم کا کفر، خواہ وہ جمہوریت کی شکل میں ہو، چاہے فاشی و بدکاری ہو، چاہے سود اور ربا ہو، اسکو جواز فراہم کیا جاتا ہے، اس بنیاد پر کہ یہ پاکستان کے آئین میں لکھا ہے۔ آئین کی پیشانی پر تو قرار دمقاصد بھی لکھی ہے کہ جس کے مطابق پاکستان میں کوئی قانون اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات کے خلاف نہیں بنے گا۔ آئین میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ کوئی شخص الیکشن نہیں لڑ سکتا، کہ جب تک وہ پاکستان کے نظریات پر یقین نہ رکھتا ہو، جب تک پاکیزہ مسلمان نہ ہو، جب تک حرام و حلال کی تمیز کرنے والا نہ ہو، جب تک اسکا کردار اللہ کے ولی جیسا نہ ہو۔ مگر آئین ان شقوں پر کوئی عمل نہیں کرتا۔ صرف اس حصے کو قبول کیا جاتا ہے کہ جو کفر کے نظام کو جواز بخشتا ہے۔ جو سلوک آج پوری مسلمان امت قرآن کے ساتھ کرتی ہے، وہی سلوک ہم پاکستانی اپنے آئین کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔ جو مفاد کو زد نہ پہنچائے وہ قبول کر لو، ورنہ رد کر دو۔

اگر آئین پر عمل کرنا ہے تو پھر اس کا اطلاق اس طریقے سے کریں کہ حکم صرف اللہ کا چلے، کہ جہاں نظام سود اور ربا کے بجائے، اللہ تعالیٰ کا ہو، بیت المال کی بنیاد پر اصلی حقیقی دولت پر مبنی معاشی و سیاسی نظام ہو کہ جو خلافت راشدہ کا تھا۔ ورنہ یہ آئین خدا کا بنایا ہوا نہیں ہے، وکیلوں کا بنایا ہوا ہے۔ ہم اس آئین پر یقین رکھتے ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دیا اور جس کے نفاذ کی درخشاں مثال خلافت راشدہ کا دور ہے۔

آج تک، معمولی سے معمولی مکان کے کرائے کا مقدمہ بھی آپ نے نمٹانا ہو، تو قانون انگریز ہی کا چلتا ہے۔ عدالتوں میں چلے جائیے، وہی وکیل، وہی نائب قاصد، وہی سارا سلسلہ، وہی زبان، وہی گفتگو، کتابیں بھی وہی انگریز کی، قوانین بھی انگریز کے۔ آزاد کب ہوئے آپ؟ بد قسمتی سے یہی ہمارا المیہ ہے۔ پھر اسکے بعد کوئی شخص کہے کہ میری توحید بہت درست ہے، نعوذ باللہ، تو وہ اللہ کے ساتھ مذاق کر رہا ہے۔ اگر ہم توحید کی بات کرتے ہیں، اگر بندہ مومن کی بات کرتے ہیں، تو پھر ہمیں سب سے پہلے طاغوت کا کفر کرنا ہے۔ ”فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ“ (البقرہ، آیت ۲۵۶) طاغوت سے کفر کیے بغیر، اس بات کا ادراک کیے بغیر کہ ہم کفر کے نظام میں رہ رہے ہیں، ہم اس سے نہیں نکل سکتے۔



ہم کفر کے نظام پر صرف ”اسلامی“ کی مہر لگا کر اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اب اس ناپاک اور پلید نظام کو تبدیل ہی کرنا ہوگا۔ وہ نظام لانا ہوگا کہ جس کی بنیاد حلال پر ہو۔ وہ مسجد کہ جس کی بنیاد فتنے اور فساد پر ہو، اس مسجد کو بھی گرا دینے کا حکم ہے۔ یہ تو پھر کفر کا پلید اور ناپاک نظام ہے۔

## سوالات و جوابات

سوال: اقبالؒ اور اسلام کے حوالے سے ہمارے لیے کوئی کتابیں تجویز کریں۔

جواب: بچے ہم سے اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم کونسی کتابیں پڑھیں۔ یہ بہت اہم نوعیت کا سوال ہے۔ آجکل ذرائع ابلاغ کا دور ہے۔ ہمارے بچے پڑھتے نہیں، دیکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اذہان پر قبضہ کرنا آسان ہو گیا ہے۔ ٹیلی ویژن پروگراموں کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں اپنی مرضی کی چیزیں ڈالی جا رہی ہیں۔

دوسرا بڑا المیہ یہ ہے کہ آجکل ہمارے بچوں کی اردو بہت کمزور ہو گئی ہے۔ چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ آپ کو تین زبانوں میں ملے گی۔ عربی، فارسی اور اردو میں۔ عربی اور فارسی تو ہمارے بچے ویسے ہی نہیں جانتے۔ اب اردو بھی رخصت ہو رہی ہے اور اس کو سرکاری طور پر تباہ کیا جا رہا ہے۔ پاکستانی میڈیا اور تشہیری اداروں کا ایک شاخسانہ رومن اردو کا لکھا جانا ہے، جیسا کہ ترک زبان کے ساتھ کیا گیا تھا۔ ہمارے بچے اردو میں اردو لکھنے کے بجائے، انگریزی میں اردو لکھتے ہیں اور اسی کو اردو سمجھتے ہیں۔

مدینہ منورہ کے مختلف کتب خانوں میں اور خاص طور پر مسجد نبوی کے اپنے کتب خانے میں، آج بھی آپ کو ہاتھ سے لکھے گئے مخطوطات ملیں گے کہ جو ہمارے بزرگوں نے صدیوں پہلے لکھے تھے۔ چند برس پہلے، الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے توفیق اور سعادت دی مسجد نبوی کے کتب خانوں میں جانے کی، تو وہاں ہم کو دین اسلام کی اتنی شاندار کتابیں ملیں، تاریخ اسلام کی حیرت انگیز کتابیں کہ جو ہمارے بزرگوں نے اصل ترکی زبان میں لکھی تھیں۔ رسم الخط عربی تھا۔ ہم اسکو پڑھ سکتے تھے، مگر سمجھ نہ پاتے جس طرح آج ہم عربی میں قرآن پاک پڑھتے ہیں، مگر سمجھتے نہیں۔ مگر المیہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۴ء میں جب مصطفیٰ کمال نے خلافت کا خاتمہ کیا تو اسکے بعد اس نے ترکی زبان کا رسم الخط بھی لاطینی کر دیا۔ لاطینی زبان یعنی انگریزی کے حروف استعمال کیے گئے، لہذا ترک بچے جو ۱۹۳۰ء، ۱۹۴۰ء کے بعد پیدا ہوئے ہیں، وہ اپنی چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ پڑھ ہی نہیں سکتے جو کہ عربی رسم الخط میں لکھی گئی تھی۔ صرف وہ کتابیں پڑھ سکتے ہیں کہ



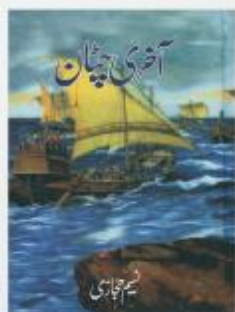
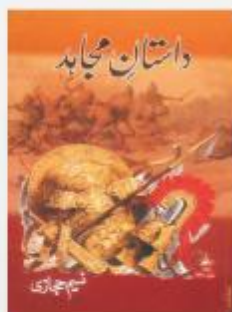
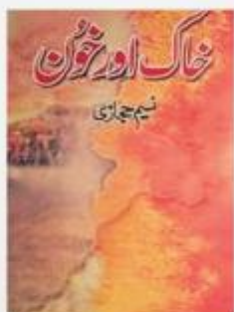
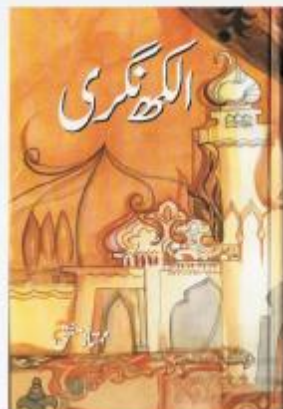
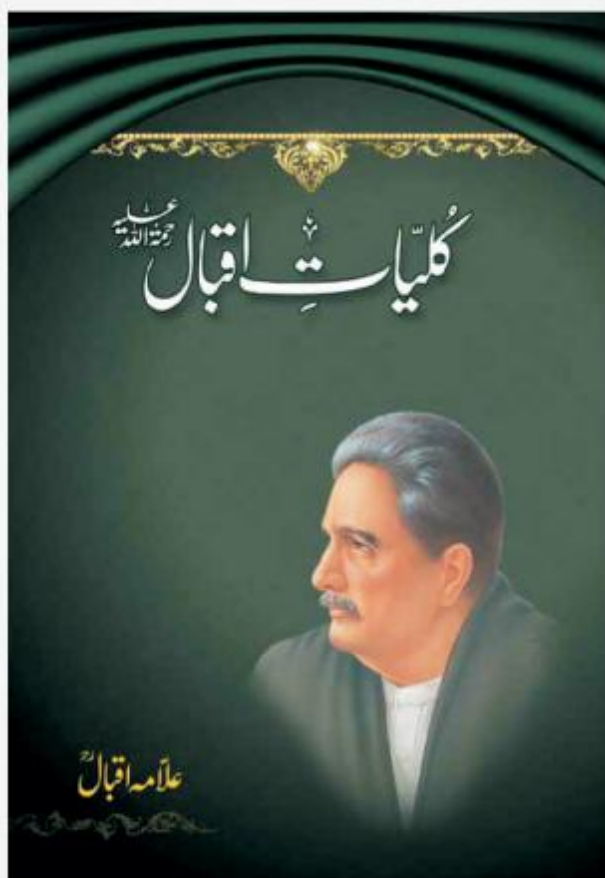
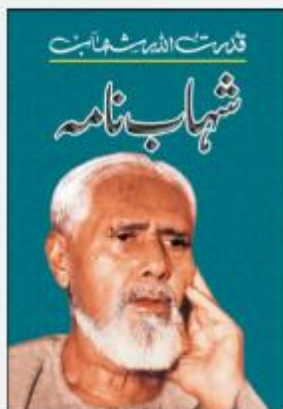
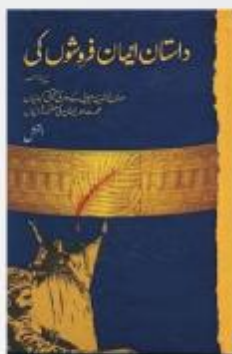
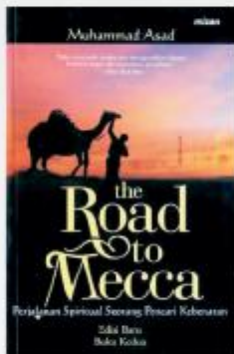
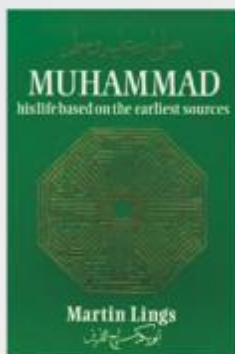
جولاطینی رسم الخط میں ہیں، لیکن وہ تو بہت معمولی سی ہیں۔ اسلامی تاریخ کی ان کتابوں کا تو آجکل کی جدید ترکی زبان میں ترجمہ کیا ہی نہیں گیا۔ سارا خزانہ تو عربی رسم الخط میں تھا کہ جواب ترک بچے پڑھ ہی نہیں سکتے۔ کسی قوم کو جاہل رکھنا ہو، تباہ و برباد کرنا ہو تو اسے اسکی زبان سے محروم کر دیں۔ جو مرضی کرو، اپنی زبان کی حفاظت لازمی ہے۔ ہمیں ہر حال میں اردو کو بہتر کرنا ہوگا۔

جب تک آپ عربی پر عبور حاصل نہیں کر لیتے، قرآن پاک کی جو اچھی تفاسیر اور ترجمے نظر آئیں، وہ لے کر ان کا مطالعہ کر لیں۔ اسکے علاوہ جو کتابیں ہم تجویز کرنا چاہیں گے، ان میں سے ایک مارٹن لنگز کی انگریزی کتاب ہے کہ جو سیرت مبارکہ کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ نہایت ہی خوبصورت کتاب ہے۔ (مارٹن لنگز کا مسلم نام ابو بکر سراج الدین ہے)۔ مارٹن لنگز برٹش لائبریری میں کام کیا کرتے تھے۔ مسلمانوں کے وہ نسخے کہ جو مسلمانوں کے پاس بھی نہیں ہیں، تاریخی کتابوں کے وہ نسخے کہ جو شمر قند، بخارا، وسطی ایشیا، غرناطہ اور اندلس سے یورپ پہنچے تھے، ان نسخوں کی مدد سے انہوں نے حضور ﷺ کی سیرت مبارکہ پہ ایک کتاب لکھی "The Life of Prophet Muhemmed"۔ بہت ہی باکمال کتاب ہے۔ اتنے ادب اور پیار سے لکھی گئی ہے کہ جو اس کتاب کو پڑھتا ہے وہ فوراً جذبات سے آبدیدہ ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ ہونا چاہیے۔

”الرحیق المختوم“ سیرت پر ایک نہایت ہی عمدہ کتاب ہے، اردو میں۔ اس کے مصنف صفی الرحمن مبارکپوری ہیں۔ اس کتاب کو ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔ اسکے علاوہ سیرت کے حوالے سے جو بھی مستند کتابیں ملیں، پڑھیے۔

انگریزی میں ایک اور کتاب ہے، محمد اسد کی، کہ جو پہلے لیوپولڈ ویلس تھے۔ لیوپولڈ ویلس پہلے یہودی تھے، پھر مسلمان ہوئے، اور پھر علامہ اقبالؒ سے آکر تربیت لی، اور پھر پاکستان بننے کے بعد پاکستان میں اسلامی قانون سازی کے حوالے سے بہت نایاب کام کیا۔ ان کی مشہور کتاب ہے: The Road to Mecca بہت ہی خوبصورت کتاب ہے۔ ۳۰-۱۹۲۰ء میں وہ مسلمان ہوئے۔ اس دور میں خلافت عثمانیہ ٹوٹ رہی تھی۔ مسلمان دنیا میں ہر جگہ جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی۔ یہ اسی تاریخی پس منظر میں ہے۔ یہ بحیثیت مسلمان آپ کے تاریخی تناظر کو وسیع کرے گی۔

اس کے علاوہ ہم سب سے اہم مسلم مفکر اقبالؒ کو پڑھنے کا کہیں گے۔ اگر آپ کو علامہ اقبالؒ کا کلام بہت زیادہ مشکل لگتا ہے تو اس میں آسان کلام سے شروع کریں۔ ہم نے اقبالؒ کے حوالے سے بہت پروگرام بھی کیے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے بعد اقبالؒ کو پڑھیں گے تو اقبالؒ سمجھ میں آنے لگیں گے۔ اقبالؒ کو سمجھ بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اقبالؒ اللہ کا تحفہ ہیں۔ انہوں نے قرآن و سنت کی تشریح کی ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کے اسباب بتائے ہیں۔ امت کی نبض شناسی کی ہے۔ حکیم الامت ہونے کی ذمہ داری ادا کی ہے۔ لیکن اقبالؒ کے کلام کو بھی تشریح کی ضرورت ہے۔ اب اقبالؒ کی تشریح آپ کو کہاں ملے گی؟ اس سلسلے میں ہماری کتاب ”اقبالؒ پر اسرار“ ان شاء اللہ آپ کیلئے کافی ہوگی۔



اقبالؒ کے کلام کے جذبے اور جنون کو سمجھنا چاہتے ہیں تو پھر نسیم حجازی کو بھی پڑھیں۔ نسیم حجازی کے درجنوں ناول ہیں۔ ”خاک اور خون“ پاکستان بننے کی تاریخ پر ہے۔ ”اور تلوار ٹوٹ گئی“ ٹیپو سلطان سے متعلق ہے۔ بغداد کس طرح تباہ ہوا، مسلمان دنیا میں کیسی بے حسی چھائی ہوئی تھی اور کس طریقے سے تاریخی چلے آرہے تھے اور کیسے مسلمان رسوا ہوئے، ”آخری چٹان“ میں وہ سب موجود ہے۔ کس طرح مسلمان قافلہ حجاز سے نکلتے ہیں اور رومی اور ایرانی سلطنتوں کو روندتے ہوئے چلے جاتے ہیں، یہ سب آپکو ”قافلہ حجاز“ اور ”داستان مجاہد“ میں ملے گا۔ کس طرح اندلس سے مسلمان نکالے گئے، کس طرح ہماری پوری تہذیب تباہ ہوئی، وہ سب کچھ آپ کو ”کلیسا اور آگ“ اور ”شاہین“ میں ملے گا۔ نسیم حجازی کو لازماً پڑھیں۔ ایک کتاب بھی ان کی ایسی نہیں ہے کہ جو غیر اہم ہو۔ ایک بار ان کو پڑھ لیں گے تو یہ آپ کو نارمل نہیں رہنے دیں گے۔ پھر آپ کو وہ جنون سمجھ میں آنے لگے گا کہ جس کی اقبالؒ اتنے جوش و شدت سے بات کرتے ہیں، کہ جن پر اسرار لوگوں کی باتیں کرتے ہیں کہ دو نیم جن کی ٹھوکر سے صحرا اور یا اور سمٹ کر پہاڑ جن کی ہیبت سے رائی ہوتے تھے۔ صلیبی جنگیں اور پوری دنیا میں مسلمانوں پر جنگ کس طرح مسلط کی گئی، اس کیلئے التمش کی کتاب ”داستان ایمان فروشوں کی“ پڑھیں۔ مختار مسعود کی ایک شاندار کتاب ”آواز دوست“، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ جدید دور کے لکھنے والوں میں قدرت اللہ شہاب کی ساری کتابیں پڑھیں، ممتاز مفتی کو بھی پڑھ ڈالیں۔ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کو ضرور پڑھیں۔ واصف علی واصف کو پڑھیں۔ آپ کو نہ صرف چودہ سو سال کی اسلامی تاریخ کا پتہ چل جائے گا بلکہ آپ کا کم از کم مطلوبہ معیار کا مطالعہ بھی ہو جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ آج کے دور میں انسانیت، محبت، تعلق، رواداری اور پاکستان کی تاریخ سے بھی آگاہی حاصل ہو جائے گی۔ ہماری نوجوان نسل اپنی تاریخ سے واقف نہیں ہے۔ اپنے آپ کو وقت دیں۔ یہ طے کر لیں کہ آپ کو تین مہینے میں یہ ساری کتابیں پڑھ ڈالنی ہیں۔ اور آپ پڑھ لیں گے، ان شاء اللہ۔ یقین کیجئے کہ یہ زندگی تبدیل کر دینے والی کتابیں ہیں۔ میں پانچویں چھٹی جماعت میں تھا تو جو پہلی کتاب پڑھی وہ ”آخری چٹان“ تھی۔ اس زمانے میں ہم لوگوں کی اردو نسبتاً بہتر ہوتی تھی۔ والدین کی مدد سے بیٹھ کر پڑھنا شروع کیا۔ میٹرک پاس کیا تو ہم نسیم حجازی کو بھی پڑھ چکے تھے، کلام اقبالؒ بھی شروع کر لیا تھا، ”داستان ایمان فروشوں کی“ اور باقی کتابیں بھی پڑھ ڈالی تھیں۔ انہی نے وہ بنیاد رکھی کہ جو آگے چل کر اس مشن کی صورت میں آپ کو نظر آتی ہے۔ آپ بھی ان کتابوں کو لازماً پڑھیں۔ اقبالؒ کا کلام، ماشاء اللہ، ایک غیر معمولی تحفہ ہے۔ ایک عمیق سمندر ہے۔ جتنی کتابوں کا ہم نے حوالہ دیا ہے، ان کا مغز آپ کو کلام اقبالؒ میں ملے گا۔

سوال: کیا دین نافذ کرنے کیلئے سیاست کا راستہ اختیار کرنا لازم ہے؟

جواب: سوال آپ کا یہ ہے کہ کیا دین نافذ کرنے کیلئے سیاست اور طاقت کا ہونا ضروری ہے؟ مختصر جواب یہ ہے کہ لازم

ہے۔ اسکے بغیر دین نافذ ہی نہیں ہو سکتا۔ بابا بلھے شاہؒ بخوبی صورت شعر فرماتے ہیں:

چار کتاباں اتوں لتھیاں  
 اتوں لتھا ڈنڈا  
 چار کتاباں کج نہ کیتا  
 سب کج کیتا ڈنڈا

اوپر سے اللہ تعالیٰ نے چار کتابیں اتاریں اور ساتھ میں ایک ڈنڈا بھی اتارا۔ چار کتابوں سے کچھ نہیں ہوا۔ سب کچھ ڈنڈے نے کیا۔ خلفائے راشدینؓ میں سے ایک کا قول ہے، اسکا مفہوم ہے کہ جو قرآن سے سیدھا نہیں ہوتا، اسکو سیدھا کرنے کیلئے مسلمان سلطان ہوتا ہے۔ قرآن کے احکامات ہیں ناں کہ چوری نہ کرو، جھوٹ نہ بولو، قتل نہ کرو۔ لیکن اسکے باوجود لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں، تو پھر ان کو انسان بنانے کیلئے، قانون نافذ کرنے کیلئے، مسلمان سلطان ہوتا ہے۔ اسی لیے اقبالؒ کہتے ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ اس دور میں جس سے کام لے گا وہ جنیدی اور اردشیری کا مجموعہ ہوگا۔ اس میں حضرت جنید بغدادیؒ کا فقر بھی ہوگا، ان کی غیرت بھی، جلال و جمال بھی، مگر اسکے پاس سیاسی اور عسکری طاقت بھی ہوگی کہ جو ایران کے بادشاہ اردشیر کے پاس تھی۔

اقبالؒ نے ایک بہت خوبصورت نظم لکھی ہے، اسکا نام ”قوت اور دین“ ہے یعنی دین اور عسکری قوت۔ یعنی دین کی عسکری قوت کے ساتھ کیا وابستگی ہے۔ کیا یہ کافی ہے کہ ہم ویسے ہی تبلیغ کر کے، چلے کاٹ کر، کئی کئی دن تک گھروں سے نکل کر، لوگوں کے دروازوں پہ جا کے ان کو اسلام کی تبلیغ کریں تاکہ اسلام نافذ ہو جائے۔ قوت کی کیا ضرورت ہے؟ اس حوالے سے اقبالؒ فرماتے ہیں:

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں  
 سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک

اسکندر اور چنگیز نے ہزار بار انسانیت کی دھجیاں اڑائیں۔ ان کے پاس فوجی، سیاسی اور معاشی طاقت تھی، سکندر سلطنت یونان کا سلطان تھا۔ مقدونیہ سے نکلا اور ہندوستان تک فتح کرتا، تباہ و برباد کرتا چلا گیا۔ چنگیز خان منگولیا سے نکلا، مصر تک جا پہنچا۔ اس زمانے میں اس نے لاکھوں انسانوں کو ہلاک کیا اور ان کی کھوپڑیوں کے مینار بنائے۔

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے  
 ”صاحب نظراں! نشہ قوت ہے خطرناک“

ہمیشہ سے تاریخ کا یہ پیغام رہا ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں، آپ کو ہر جگہ یہی پیغام نظر آئے گا۔ اے صاحب نظر، حقیقت جاننے والے لوگو!



یہ سمجھو کہ قوت اور طاقت کا نشہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔

“Power corrupts and absolute power corrupts absolutely”

اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے

عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک

طاقت کا نشہ اور عسکری، معاشی اور سیاسی طاقت کا جو زور ہے، جو طوفان ہے، اسکو آپ محض کسی علم، ٹیکنالوجی، ریاضی، علم کیمیا، فنون لطیفہ وغیرہ کی مدد سے روک ہی نہیں سکتے۔ کوئی تہذیب ان کے آگے نہیں نکلتی۔ اگر سیاسی اور عسکری طاقت کسی ظالم اور جابر کے ہاتھ میں آجائے تو مثال آپ کے سامنے ہے۔ بغداد مسلمانوں کی تہذیب کا اوج کمال تھا۔ پوری دنیا میں مسلمانوں کا مرکز تھا۔ بغداد میں چار لاکھ مسلمان فوج تھے۔ بد بخت ابن القمی، جو اس وقت کا میر جعفر اور خلیفہ کا غدار وزیر تھا، نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ علم و ہنر کے مرکز میں اتنی بڑی فوج کا کیا کام؟ دفاعی بجٹ کم کر دیتے ہیں (یہی آج پاکستان میں بھی کہا جاتا ہے کہ دفاعی بجٹ کم کیا جائے)۔ اسکا یہ کہنا تھا کہ بغداد میں ہم اتنا بھاری دفاعی بجٹ خرچ کر رہے ہیں۔ صرف بغداد کی حفاظت کیلئے چار لاکھ کی فوج ہے، اسکو فارغ کر دیتے ہیں اور اسکے بجائے فنون لطیفہ، ٹیکنالوجی، کتابوں، لائبریریوں، باغات اور سڑکوں وغیرہ پر خرچ کریں گے، اپنے معاشرتی معیار کو بلند کریں گے۔ وہی خرافات کہ جو آجکل آپ ذرائع ابلاغ پر سنتے ہیں۔ تو چار لاکھ کی فوج کو خلیفہ نے چھٹی دے دی اور بغداد پوری دنیا کیلئے علوم و فنون، کلچر اور تہذیب کا مرکز بن گیا۔ اس وقت پوری دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت شہر ہی کوئی نہ تھا۔ حال یہ تھا کہ چنگیز خان جب بغداد کے دروازے تک آپہنچا تو اس وقت خلیفہ کے پاس محل کے محافظین کے علاوہ اور کوئی سپاہی تھے ہی نہیں کہ جو چنگیز خان کا مقابلہ کر سکتے۔ خلیفہ جب ہیرے جو ہرات ہلا کو خان کے پاس بھجواتا ہے، تو ہلا کو خان وہی چیزیں خلیفہ کو واپس اس پیغام کے ساتھ بھیجتا ہے کہ اب کھاؤ ان کو۔ جن جوہرات سے تم اپنی حفاظت کیلئے تلواریں نہ بنا سکتے، فوج نہ بنا سکتے، ان ہیرے جوہرات کا کیا مصرف؟

پھر جب خلیفہ کے متعلق اس کو یہ کہا گیا کہ خلیفہ کا خون اگر زمین پر گرے تو بڑا عذاب نازل ہوگا، تو ہلا کو خان نے کہا کہ ہم اسے یوں ماریں گے کہ اس کا خون زمین پر نہ گرے۔ خلیفہ کو قائلین میں لپیٹ کر تاری فوج کے گھوڑوں کے نیچے ڈال دیا گیا۔ علم و ہنر کے تمام مراکز، پوری دنیا میں کی جانے والی کئی سو سال کی ریسرچ اور ٹیکنالوجی کی کتابوں کو دجلہ میں پھینک دیا گیا۔ پندرہ لاکھ آبادی کے شہر میں سے صرف کتے زندہ بچے۔ اور یہ سب کچھ ایک ہفتے میں ہو گیا۔ اقبالؒ یہی کہتے ہیں کہ جب عسکری طاقت کا طوفان اٹھتا ہے، تو کوئی علم و ہنر، ٹیکنالوجی، سائنس وغیرہ اسکے سامنے ٹک نہیں پاتے۔ جاپان وغیرہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ ٹیکنالوجی کے مراکز بن گئے ہیں اور امریکہ ہمارا دفاع کرے گا، تو آنے والے وقت میں دیکھیں گے کہ جاپانیوں کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔ وہ تمام قومیں کہ جو اپنی عزت اور دفاع دوسروں کے حوالے کر دیتی ہیں، وہ بے عزت بھی ہوتی ہیں اور تباہ و برباد بھی۔

لا دیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر

ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک

اگر یہ عسکری طاقت لا دین ہو تو بدترین زہر سے بھی بڑھ کر خطرناک ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ فوجی طاقت دین کی حفاظت میں ہو تو پھر دنیا میں کوئی زہر، کوئی شرک، کوئی فتنہ و فساد ایسا نہیں ہے کہ جس کا یہ علاج نہ کر سکے۔ اقبالؒ نے کتنی خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ اگر خالد بن ولیدؓ کے پاس یہ طاقت ہو، سیدنا عمرؓ کے پاس یہ طاقت ہو، تو پھر چین سے لیکر یورپ تک جو سلطنت بنے گی تو اس میں کسی ایک انسان کی عزت پر بھی حملہ نہیں ہوگا، ایک کتابھی دجلہ کے کنارے بھوکا نہیں مرے گا، دور دراز ریگستان میں بھی کوئی بچہ بھوکا نہیں سوئے گا۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رات کے وقت گشت کر رہے تھے تو ایک گھر سے رونے کی آواز آئی۔ اجازت لیکر جب گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا ایک عورت کھانا پکا رہی ہے اور بچے رو رہے ہیں۔ سیدنا عمرؓ کہتے ہیں کہ کیسی عورت ہو بچوں کو کھانے کو کیوں نہیں دیتی؟ عورت رو پڑی۔ حضرت عمرؓ نے ڈھکن اٹھا کر دیکھا تو پتھر ابل رہے تھے۔ عورت کہتی ہے کہ اللہ غارت کرے عمر کو۔ ہم مر گئے اور اسے ہمارا احساس تک نہیں۔ میں پتھر ابل رہی ہوں تاکہ بچوں کو لگے کہ کھانا بن رہا ہے۔ سیدنا عمرؓ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ وہاں سے بھاگے۔ بیت المال میں آئے۔ گندم کی بوریاں اور دیگر سامان اٹھا کر کندھوں پر رکھا۔ غلام نے کہا آقاؐ! میں اٹھا لیتا ہوں۔ مگر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرا بوجھ تم نہیں اٹھاؤ گے۔ خود اٹھا کر لائے۔ کھانا بھی پکایا۔ بچوں کو کھلایا۔ جب بچے کھانا کھا کر خوش ہو گئے تو خادم نے کہا کہ حضور آپ نے کھانا پہنچا دیا، اب یہاں سے چلیں۔ کہتے ہیں: ”نہیں، میں نے ان بچوں کو روتے دیکھا ہے، اب انہیں ہنستے دیکھنا چاہتا ہوں“۔ وہی بات کہ جب یہ طاقت دین کے حصار میں ہوگی تو ہر بیماری کا علاج بن جائیگی۔ سیاست، قوت اور طاقت کے بغیر دین نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات خلافت راشدہ کی تاریخ سے ہم پر عیاں ہوتی ہے کہ طاقت اگر چنگیز خان کے ہاتھ میں ہوگی تو دنیا کو تباہ و برباد کر دے گی اور اگر حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں ہوگی تو پوری دنیا میں خیر و برکت کا پیغام ہوگی۔

ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد

فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اس کی

تو ہیں ہر اول لشکرِ کلیسیا کے سفیر!







## کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہِ سحر گاہی

نوجوان اکثر ہم سے سوال کرتے ہیں کہ ہم عملی طور پر کب کام شروع کریں گے؟ اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ ہم سیاست میں کب آئیں گے؟ سڑکوں پر جلوس کب نکالیں گے؟ دھرنے کب دیں گے؟ ہمارے ملک میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی شخص عملی کام کرنا چاہتا ہے، تو پہلے اپنی کوئی الگ تنظیم یا جماعت بنا کر یا تو سیاست میں آجاتا ہے یا فلاح عامہ کا کام کرنے لگتا ہے۔ اس باب میں ہم آپ کو بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے اس شخص کیلئے کیا معیار قائم کیے ہیں کہ جو معاشرے میں ایک حقیقی تبدیلی لانا چاہتا ہے۔

ہر مسلمان کی خواہش ہے کہ اللہ کے دین کیلئے نیک نیتی سے کام کرے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ امت مسلمہ میں جو جماعتیں اچھا کام کرنا بھی چاہتی ہیں، تو ان کے افراد میں جرأت کردار اور قوت عمل نہیں ہوتی، ان میں حکمت و فراست کی کمی ہوتی ہے۔ ان میں بندہ مومن کی وہ صفات نظر نہیں آتیں کہ جن کی بنیاد پر وہ رات کے راہب اور دن کے شہسوار ہوتے ہیں، جن سے اللہ تعالیٰ تقدیریں تبدیل کرنے کا کام لیتا ہے۔ قرآن پاک میں دو انتہائی حیرت انگیز سورتیں ہیں۔ ان سورتوں میں ان افراد کیلئے پورا ترہیتی پروگرام بیان کیا گیا ہے کہ جو اللہ کے دین کی سر بلندی کے لیے اذان دینا چاہتے ہیں اور اس کو نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اس باب میں ہم انہی دو سورتوں کے حوالے سے بات کریں گے، سورہ مزمل اور سورہ مدثر۔

سورہ مزمل فرد کی تربیت کا نصاب مہیا کرتی ہے۔ اس فرد کی تربیت کا نصاب کہ جو اللہ کے دین کا غلبہ چاہتا ہو اور اسے پوری دنیا میں قائم



اور نافذ کرنا چاہتا ہو۔ جس کیلئے بنیادی شرط ہے حضور ﷺ سے روحانی اور قلبی تعلق۔ سورۃ مزمل کی پہلی گیارہ آیات بہت اہم ہیں۔ جو شخص ”مزمل“ کی تربیت سے گزر جاتا ہے، پھر اسکے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کیا اس شخص سے ”مدثر“ کا کام لینا ہے یا نہیں۔ سورہ مدثر اٹھ کراذان دینے اور عملی ڈیوٹی سے متعلق تربیت دینے والی سورۃ ہے۔ یہ سورہ نعرہ تکبیر بلند کرنے کا طریقہ بتاتی ہے۔

قرآن پاک میں سورتوں کی ترتیب بھی دیکھئے کہ پہلے سورہ مزمل ہے، پھر سورہ مدثر۔ پہلے تربیت دی گئی، پھر میدان جنگ میں اتارا گیا۔ ہماری بد نصیبی یہ ہے کہ ہم نے سورہ مزمل اور سورہ مدثر کی تربیت کے بغیر ہی اپنے بچے میدان جنگ میں اتار دیئے ہیں، نتیجتاً جب آزمائشیں اور امتحانات آتے ہیں، دباؤ بڑھتا ہے، تو یہ انکا مقابلہ نہیں کر پاتے۔ یہ آپ نے کیسے تصور کر لیا کہ آپ اللہ کے دین کے لیے لڑیں گے، جاہر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہیں گے اور آپ پر جان، مال اور عزت و آبرو کے حوالے سے مشکلات نہیں آئیں گی؟ سورہ عنکبوت کی دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ”کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ (صرف) ان کے (اتنا) کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے ہیں، چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہ کی جائے گی؟“! نہ صرف یہ کہ آپ کی عزت و آبرو اور جان و مال پر حملہ ہو سکے، بلکہ ذرائع ابلاغ میں بھی آپ کے خلاف طوفان کھڑا کر دیا جائے گا۔

یہ قدم قدم قیامت، یہ سوادِ کوئے جاناں

جسے زندگی ہو پیاری وہ یہیں سے لوٹ جائے

جب آپ کفر کے معاشرے میں اللہ کے دین کی خاطر اذان دینے کھڑے ہوتے ہیں، تو آپ کے مقابلے پر وقت کے ابو جہل اور ابو لہب کھڑے ہونگے۔ وہاں حضرت بلالؓ کی طرح آپ کی چربی بھی کونکوں پر جلائی جائے گی، حضرت یاسرؓ اور حضرت سمیعہؓ کی طرح آپ کو بھی تپتے ریگزاروں میں گھسیٹا جائے گا، وہاں کچرا بھی پھینکا جائے گا، مجنوں بھی پکارا جائے گا، جا دو گھر بھی گردانا جائیگا، گھروں سے بے گھر بھی کیا جائے گا، اپنوں سے ہی بدر کا معرکہ بھی درپیش ہوگا اور احداور خندق کے امتحانات سے بھی گزرنا پڑے گا۔

جو شخص آج کے دور میں دین کی خدمت کرنا چاہتا ہے، اسکے لیے تربیتی پروگرام سورہ مزمل ہے۔ اس تربیت کے مکمل ہونے کے بعد سورہ مدثر کی آغاز کی آیتوں کا کام شروع ہوتا ہے۔ قرآن پاک اور اس کی آیات حضور ﷺ کے فیض و برکت سے ہماری ہدایت کیلئے نازل ہوئیں۔ حضور ﷺ شان نزول کا سبب ضرور بنے، قرآن حضور ﷺ پر نازل ضرور ہوا ہے، لیکن قرآن حضور ﷺ کی ذات مبارکہ تک محدود نہیں ہے۔ اقبالؒ کو بھی ان کے والد نے نصیحت کی تھی کہ قرآن کو ایسے پڑھو کہ جیسے یہ تم پر نازل ہو رہا ہو۔ اسی پر اقبالؒ نے وہ شعر کہا تھا:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

یعنی کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی آپ پر اس کے راز نہیں کھول سکتا کہ جب تک کہ یہ قرآن خود آپ کے قلب پر نازل نہ ہو۔ اس کتاب کو ایسے پڑھیں کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب آپ پر نازل کی ہے۔ سورہ مزمل کی شان نزول یہ ہے کہ جب حضور ﷺ پر پہلی وحی ’اقراء باسم ربک الذی خلق‘ نازل ہوئی، تو حضور ﷺ پر کچھ طاری ہوگئی۔ آپ ﷺ پر خوف اور حیرانی کی ایک کیفیت طاری تھی۔ آپ ﷺ حضرت خدیجہ طاہرہؓ کے پاس پہنچے تو کانپ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے فرمایا ’زملونی‘، یعنی مجھے چادر اوڑھا دو۔ حضرت خدیجہؓ ان کو تسلی دیتی ہیں کہ اللہ کبھی آپ کو ضائع نہیں کریگا۔ آپ یتیموں، یتیموں، مسکینوں کی مدد کرتے ہیں۔ آپ رشتوں اور قرابت داروں کا خیال رکھتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ آپ ﷺ کی زوجہ اور رازدار تھیں۔ عمر میں پندرہ سال بڑی تھیں، مگر آپ دونوں کا تعلق ایسا تھا کہ جیسے بہترین دوستوں کا ہوتا ہے۔ حضرت خدیجہؓ ہی تھیں کہ جنہیں حضور ﷺ اپنی ظاہری حیات مبارکہ کے آخری سالوں تک یاد فرماتے رہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے کہہ بھی دیا: ’یا رسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ حضرت خدیجہؓ کو یاد فرماتے رہتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ان سے بہتر ازواج عطا فرمادی ہیں۔‘ حضور ﷺ اداس ہو گئے۔ فرمایا: ’اللہ کی قسم! آپ لوگ ان سے بہتر نہیں ہیں‘۔ جب حضرت خدیجہؓ نے نبوت کے دسویں سال پردہ فرمایا تو یہی وہ سال تھا کہ جب آپ ﷺ کے چچا حضرت ابوطالب کا بھی انتقال ہوا تھا، جس سے پہلے شعب ابی طالب کی گھاٹی میں آپ کو اور دیگر اہل ایمان کو تین سال کیلئے بند کر دیا گیا تھا۔ اسی لیے اس کو ’عام الحزن‘، یعنی غم کا سال قرار دیا گیا۔

انہی حضرت خدیجہؓ نے حضور ﷺ کو پہلی وحی کے بعد جب چادر اوڑھائی، تو اسی وقت دوبارہ وحی نازل ہوئی کہ جس میں اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو مخاطب کر کے پیار سے ’مزمل‘ کہتے ہیں، یعنی چادر اوڑھ کر لیٹنے والے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کو ایک پورا ترتیبی نظام دیا۔ اب یہی سورہ مزمل اور اس کی اولین آیات، قیامت تک آنے والے ہر مسلمان، کہ جو حضور ﷺ کے دین کو غالب اور قائم کرنے کی ذمہ داری، یعنی رسالت کی ذمہ داری ادا کرے گا، کیلئے ترتیبی نصاب ہے۔ نبی تو اب کوئی نہیں آئے گا، مگر رسالت کی ذمہ داری، حضور ﷺ کے پیغام کو پھیلانے کی ذمہ داری، دین کو نافذ و غالب کرنے کی ذمہ داری، تو آپ ﷺ نے خود خطبہ حجتہ الوداع میں پوری امت کے ذمے لگا دی تھی اور فرمادیا تھا کہ جو تم میں سے یہاں موجود ہے وہ یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچا دے کہ جو یہاں موجود نہیں۔ یہ ذمہ داری اب ہر مسلمان کی ہے کہ حضور ﷺ کی سنت مبارکہ اور قرآن کو زندہ کرنے کیلئے، ہر دور میں اذان دے۔ جو شخص اللہ کے اس حکم کو لے کر اٹھے گا، اسکا ابتدائی ترتیبی نصاب سورہ مزمل کی پہلی گیارہ آیات ہی ہوں گی۔

قرآن پاک انسان کے ظاہر پر بھی لاگو ہوتا ہے اور انسان کے باطن پر بھی۔ جب کہا گیا: ’فصل لربک وانحر‘ (الکوثر، آیت ۲) اسکا یہ ترجمہ بھی ٹھیک ہے کہ اپنے پروردگار کیلئے نماز پڑھو اور اسی کیلئے قربانی دو۔ اسکا ایک ترجمہ یہ بھی ہے کہ اپنے وجود میں ذکر الہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے ہر وقت حالت وصل میں رہو اور اپنی خواہشات نفس کی قربانی دو۔

”ان شانئک هو الابر“ بے شک تمہارا دشمن ہی تباہ و برباد ہو جائے گا! اب دشمن ابو جہل بھی ہے اور آج کے دور میں امریکہ، کفار اور دجال کا نظام بھی ہے۔ لیکن ایک مومن کیلئے اس کا سب سے بڑا دشمن اس کے اندر کا شیطان یعنی نفس امارہ ہے کہ جو اسے برائی کی جانب راغب کرتا ہے۔

”انا شانئک هو الابر“ کا افس اور آفاق دونوں کے اعتبار سے ترجمہ کیا جاسکتا ہے۔ افس میں اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تمہارا دشمن یعنی شیطان کہ جو تمہیں ورغلاتا ہے، گمراہ کرتا ہے، تمہارا نفس کہ جو تمہیں برائی کی طرف اکساتا ہے، اللہ اسکو بھی رسوا اور ناکام کرے گا کہ جب تم اپنی خواہشات نفس کی قربانی دو گے۔ آفاق میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب تم اللہ کی راہ میں ہر اس چیز کی قربانی دو گے کہ جو تمہیں بہت محبوب ہے، تو اس سے تمہاری تربیت اور تزکیہ ہوگا، تمہارا اللہ سے تعلق قائم ہوگا، اللہ تمہاری حفاظت کرے گا اور تمہارے سارے ظاہری دشمن بھی اپنے مزموم عزائم میں ناکام رہیں گے۔

آج کے دور میں جب سورہ منزل کی بات کرتے ہیں تو ہم نے ظاہری طور پر تو چادر نہیں اوڑھی ہوئی، لیکن آج کے دور کا انسان خواہشات نفس میں ضرور لپٹا ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ یوں بھی ہو سکتا ہے: اے وہ شخص کہ جو اپنی خواہشات نفس میں لپٹا ہوا ہے! اے وہ شخص کہ جس نے اپنے کاروبار، روپے پیسے، اپنی جائیداد، اپنے قبیلے، خاندان اور دولت کو اپنے گرد اوڑھ رکھا ہے! اے وہ شخص کہ جو دنیا داری کی آلائشوں میں لپٹا ہوا ہے!

ہمیں ہی مخاطب کر کے ”یا ایہا المزمّل“ کہا جا رہا ہے۔ یہ کہا جا رہا ہے کہ خواہشات نفس کہ جنہوں نے تمہیں گھیر رکھا ہے، وہ خوف، لالچ، حسد، کینہ، غیبت، دنیا اور مال کی محبت ہیں۔ ہر انسان کسی نہ کسی آلائش میں لپٹا ہوا ہے۔ کوئی جمہوریت کے سحر میں ہے، کسی کو آمریت کا سودا ہے، کوئی سود اور رباء کے نظام کا اسیر ہے اور کوئی کمیونزم کے بت کو پوج رہا ہے۔ ہر انسان نے اپنا اپنا ایک خدا بنا رکھا ہے اور وہ اس کے سحر سے نہیں نکل پاتا۔ الغرض ہر انسان کی چادر مختلف ہے کہ جس میں وہ لپیٹا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہونے کیلئے کچھ تو فرض احکامات ہیں کہ جو بجالانا لازم ہیں، اس کے علاوہ نوافل بھی ہیں کہ جنہیں انسان اپنی مرضی سے ادا کرتا ہے۔ یہ زبردستی نہیں ادا کیے جاتے۔ کہہ دیا گیا ہے کہ جتنا تمہارا دل چاہے، ادا کرو۔ نوافل کی تعداد مقرر نہیں ہے۔ فرائض کی تعداد مقرر ہے، یہ وہ ذمہ داری ہے کہ جو لازماً ادا کرنی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے قریب ہونا ہے تو اسکے لیے نوافل کی کثرت شرط ہے۔ چاہے نفل عبادت ہو، نفل روزے ہوں یا نفل صدقات۔

سورہ منزل کا آغاز یوں ہوتا ہے: ”اے اوڑھ لپیٹ کر لیٹنے والے، رات کو (تہجد کی نماز میں) کھڑے ہو۔۔۔۔۔“، یعنی اب راتوں کو قیام کیا کرو۔ تم خواہشات نفس میں لپٹے ہوئے ہو۔ تمہیں رات کی نیند بہت پیاری ہے۔ دنیا جہاں کی خواہشات نفس تمہیں اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ لیکن اب ایک بھاری ذمہ داری تمہیں ادا کرنی ہے، جس کیلئے اب تمہاری تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔



”قم الیل الا قلیلاً. نصفه او انقص منه قلیلاً.“ (آیت ۳۰)

”رات کو تھوڑا وقت (نماز کیلئے) کھڑے ہوا کرو، چاہے آدھی رات یا اس سے کچھ کم۔“

یعنی رعایت بھی دی جا رہی ہے کہ ساری رات نہ کھڑے رہیں، کچھ آرام بھی کریں۔ نفس کے بھی حقوق ہیں۔ لیکن یہاں رات کی عبادت بتائی جا رہی ہے۔ یہ عشاء کی نماز کی بات نہیں ہو رہی، یہ اسکے بعد کی بات ہو رہی ہے، تہجد کی بات ہو رہی ہے۔

”او زد علیہ ورتل القرآن ترتیلاً.“ (آیت ۴)

”یا اس پر کچھ زیادہ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھیے۔“

یعنی اللہ تعالیٰ سے باتیں کیجئے، قرآن کی زبان میں۔ قرآن کی تلاوت کیجئے۔ قرآن کی تلاوت کا کیا مطلب ہے؟ فرض نمازیں تو جماعت کے ساتھ مسجد میں پڑھنے کا حکم ہے۔ نوافل کے بارے میں اللہ کے بندے کہتے ہیں کہ جتنے خفیہ ہوں، اتنا ہی بہتر ہے۔ یہ آپکا اور اللہ کا معاملہ ہے۔ خاص طور پر تہجد کی نماز۔ وہ تو ہے ہی آپ کے اور اللہ کے بیچ۔ اس وقت تو کوئی آپ کو دیکھ ہی نہیں رہا ہوتا۔ وہاں شرک، منافقت، ریاکاری کی کوئی گنجائش نہیں۔ تہجد کی نماز تو درحقیقت بندے اور اسکے رب کے مابین ہے، یا اسکی بیوی اور بچے رازدار ہونگے۔ اسکے علاوہ تو کسی کو نہیں معلوم ہوتا کہ آپ تہجد پڑھتے ہیں۔

یہ قرآن کیا ہے؟ قرآن اللہ کی صفت کلام کا ایک اعجاز ہے کہ جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ آپ سے بات کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مختلف طریقوں اور ذرائع سے کلام کرتا ہے۔ کبھی وحی کے ذریعے، کبھی فطرت کے اشارات کے ذریعے تو کبھی اپنے کسی خاص بندے کو بھیج کر آپ تک اپنا پیغام پہنچا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے براہ راست کلام کرنا ہو تو قرآن کا مطالعہ کریں۔

قرآن کو اگر بغیر آواز کے پڑھا جائے تو اسکی حکمت عطا ہوتی ہے، اگر اس کی بلند آواز میں تلاوت کی جائے تو اس کا نور عطا ہوتا ہے۔ یہاں پر اللہ تعالیٰ حکم دے رہا ہے کہ اس کو ہلکی سی آواز کے ساتھ دھیمے دھیمے تلاوت کرو۔

”انا سنلقی علیک قولاً ثقیلاً.“ (آیت ۵)

اس لیے کہ ”ہم تم پر ایک بھاری ذمہ داری ڈالنے والے ہیں۔“

”قَوْلًا ثَقِيلًا“ کا مطلب صرف قرآن پاک نہیں ہے۔ قرآن نے خود اپنا تعارف کروایا ہے کہ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو وہ اللہ کے خوف سے پھٹ جاتا۔ لیکن حضور ﷺ پر جو ذمہ داری پڑ رہی تھی، وہ صرف قرآن پہنچا دینے ہی کی نہ تھی، بلکہ اس قرآن کو نافذ کرنے کی بھی تھی۔ یہ سورہ مزل اس وقت نازل ہوئی کہ جب پہلی وحی ”اقراء.....“ نازل ہو چکی تھی۔ اسکے بعد تیس سال میں وہ کوئی



يَوْمَ تَأْتِي سَأَلَ الْعِلْمِ ذِي الْقُوَّةِ  
أَخْذُوا أَلْهَامَكُمْ ذِي الْقُوَّةِ  
الْعِلْمِ ذِي الْقُوَّةِ  
عَلَيْكُمْ بِذِكْرِ الْفَيْدَةِ

ایسی کائنات کی آزمائش، مشکل، پریشانی، تصادم تھا کہ جس سے حضور ﷺ اور ان کی چھوٹی سی جماعت کو گزرنا نہ پڑا ہو۔

اس بھاری ذمہ داری کو ادا کرنے کیلئے سورہ منزل کے تربیتی عمل سے گزرنا لازم ہے۔ اگر انسان یہ سمجھے کہ اللہ اسے بغیر کسی مشکل، پریشانی، آزمائش اور تصادم کے سب کچھ عطا کر دے گا، تو یہ خام خیالی ہے۔ اگر اعلیٰ ترین مقام چاہتے ہیں، تو اللہ کو اپنی صلاحیتوں اور وقت کا بہترین حصہ دیں۔ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں لٹا دیں۔

ایسے نہیں ہوگا کہ اپنے آپ کو تو بچا بچا کر رکھیں، خطرات میں نہ پڑیں، کیرئیر، روپیہ، پیسہ، خاندان اور عزت پر آنچ نہ آنے دیں، بدر اور احد سے نہ گزریں، ہجرت نہ کریں اور اللہ پھر بھی آپ کو اولیاء، صدیقین اور شہداء میں شامل کر دے۔ یہ ناممکن ہے! جنت تو شاید یوں بھی مل ہی جائے، کہ اللہ کی رحمت بہت وسیع ہے، لیکن ہمارا ہدف جنت نہیں ہے۔ جنت تو اللہ اپنی رحمت اور مغفرت سے بہت سے گناہگاروں کو بھی عطا فرما دے گا۔ مگر وہ دور کہ جس میں آبروئے رسول ﷺ پر حملے کیے جا رہے ہوں، امت رسول ﷺ کو غلام بنادیا گیا ہو، لاکھوں مسلمان اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہے ہوں، پوری دنیا میں سودا و کفر کا نظام قائم ہو، وہاں مسلمان صرف جنت کمانے کیلئے اپنی زندگی نہیں گزار سکتا۔ وہاں اسکا جینا، مرنا، اٹھنا، بیٹھنا، سب کچھ اللہ کے دین کو غالب و نافذ کرنے کیلئے ہوتا ہے۔

ہر دور میں ”قولا ثقیلا“ مختلف ہو جایا کرتا ہے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے لیے ”قولا ثقیلا“ یہ تھا کہ وہ امت مسلمہ کو صلیبیوں سے بچائیں اور بیت المقدس شریف آزاد کروا کے امت مسلمہ کی آبرو کی حفاظت کریں۔ یہ ان کی بھاری ذمہ داری تھی۔ حضرت مجدد الف ثانی کیلئے ”قولا ثقیلا“ کچھ اور تھا۔ ان کی بھاری ذمہ داری یہ تھی کہ اکبر کے کفر کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہو جائیں اور ہندوستان میں اسلام کی حفاظت کریں۔ ہر دور کے ”مدثر“ کی ذمہ داری الگ رہی ہے، لیکن ”منزل“ کا تربیتی پروگرام ایک ہی ہے۔ تربیت کے مراحل یہی ہیں۔ ”انا سنلقی علیک قولا ثقیلا“۔ انبیاء بھی ان آزمائشوں سے گزر رہے ہیں، یہاں تک کہ انہیں آروں سے چیرا گیا ہے، آگ میں پھینکا گیا، حضور ﷺ پر طائف میں سنگ باری ہوئی اور آپ کے نعلین مبارک خون سے بھر گئے، غزوہ احد میں دندان مبارک شہید ہوئے، ہجرت کرنا پڑی، اپنے ساتھیوں کی شہادت دیکھی۔ کائنات کا کونسا ایسا دکھ تھا کہ جو آپ ﷺ نے نہیں اٹھایا۔

اللہ تعالیٰ ہمارا رب ہے۔ اسے ہمارے متعلق سب کچھ معلوم ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا: ”بے شک رات کا اٹھنا بڑا سخت ہے“۔ لیکن یہ نفس پر قابو پانے کیلئے، انسان کو مضبوط کرنے کیلئے، اسکی کردار سازی کے لیے اور جرأت کردار پیدا کرنے کیلئے نہایت ضروری ہے۔ بے شک رات کا اٹھنا بہت سخت ہے۔ انسان کا دل چاہتا ہے کہ گرم لحاف میں سوئے یا کوئی فلم دیکھ لے یا دوستوں کے ساتھ محفلوں میں جائے، لیکن رات کا وقت تنہائی میں اپنے رب کے ساتھ گزارنے کا وقت ہوتا ہے۔ اس میں بس آپ اور آپ کا رب ہو۔ بزرگ کہتے ہیں اور حضور ﷺ کی حدیث مبارکہ سے بھی یہ حکمت ملتی ہے کہ جو شخص تنہائی میں الگ بیٹھا کرے، لوگوں سے زیادہ نہ ملا کرے، کم بولا



کرے، اسکے پاس جا کر بیٹھا کرو کہ اللہ تعالیٰ اسے حکمت عطا کرتا ہے! زیادہ بولنے والے کو، زیادہ شور کرنے والے کو، زیادہ فتوے دینے والے کو اور زیادہ اعتراض کرنے والے کو، زیادہ کھانے والے کو، حکمت نصیب نہیں ہوتی۔

جب آپ دین کی اصل حکمت اور اساس اور دین کی حقیقی روح کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو حلال چیزوں پر بھی پابندی لگائی جاتی ہے۔ حرام تو خیر ہے ہی حرام۔ اس طرف تو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر حلال پر بھی چند پابندیاں لگادی جاتی ہیں۔ مثلاً بولنا تو حرام نہیں ہے، لیکن اللہ کے بندوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ کم بولتے ہیں۔ کھانا حرام نہیں ہے، مگر اللہ کے بندوں کی صفت یہ بتائی گئی ہے کہ کم کھاتے ہیں۔ سونا حرام نہیں ہے، مگر اللہ کے بندوں کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ کم سوتے ہیں۔ اب بات لطافت اور نفاست کی طرف جارہی ہے۔ اب بات صرف فرائض پورے کرنے کی نہیں ہے۔ کیوں؟ کیونکہ اب بات جارہی ہے بھاری ذمہ داری ادا کرنے کی جانب۔ جو بھاری ذمہ داری نہیں لینا چاہتا، جو آج کے دور میں اللہ کے دین کو غالب، نافذ اور قائم نہیں کرنا چاہتا، وہ ایک عام زندگی گزارے، حرام حلال کی تمیز کرے، لوگوں کو تکلیف نہ پہنچائے، بنیادی احکام بجالائے، اخلاق کی تعمیر کرے، فرائض پورے کرے، دین کے اراکین کی پابندی کرے، ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اسکی مغفرت فرمادے گا۔ لیکن سورہ مزمل ان کیلئے ہے کہ جنہیں یہ ذمہ داری دی جارہی ہے کہ دنیا میں اللہ کے دین کو نافذ کریں، قائم کریں اور کفر اور طاغوت کے نظام سے تصادم کریں۔ تو حید کو قائم کرنے کی ذمہ داری اس شخص کی ہے کہ جو مزمل کے نصاب سے گزرے۔ اس میں یہ حکم نہیں دیا جا رہا کہ باہر جا کر تبلیغ کرو، لیکچر دو، لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلاؤ۔ یہاں صرف ذاتی تربیت کی بات ہو رہی ہے۔ یہ باتیں آپ کو مدثر میں ملیں گی کہ جہاں پر کہا گیا ہے کہ اٹھیے، اذان دیجیئے اور کفر کے خلاف اعلان جنگ کیجیئے۔

جب آپ نے نفس کی مرضی کے خلاف عمل کرنا شروع کر دیا، تو سمجھیے کہ اب آپ کے نفس کی اصلاح شروع ہو گئی۔ ایک مرتبہ ایک بزرگ مسجد کے باہر بیٹھے تھے۔ حلیے سے مجذوب اور دیوانے لگتے۔ اونچی آواز میں بولے جارہے تھے: ”نہ تو میرا اللہ ہے، نہ میں تیرا بندہ ہوں“۔ لوگ تو ظاہر کو دیکھتے ہیں، لہذا انہیں غصہ آ گیا۔ انہوں نے بزرگ کو بہت مارا۔ وہ بزرگ مسلسل روتے رہے اور کہتے جاتے: ”نہ تو میرا اللہ ہے، نہ میں تیرا بندہ ہوں“۔ لوگوں میں سے ایک سیانے شخص نے باقی لوگوں کو مشورہ دیا کہ بابا کی بات تو سن لو، کہ آخر وہ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔ اس شخص نے بزرگ سے یہ جملہ کہنے کی وجہ پوچھی، تو بزرگ نے جواب دیا کہ یہ میں اپنے نفس کے شیطان سے کہہ رہا ہوں کہ نہ تو میرا اللہ ہے، نہ میں تیرا بندہ ہوں۔ وہ مجھے بھڑکار رہا تھا، مجھے گناہوں پہ اکسار ہا تھا اور میں اس کی مخالفت کرتے ہوئے اس کو ڈانٹ رہا تھا۔

ہر شخص اپنے نفس کے ساتھ حالت جنگ میں ہے۔ ہر شخص یہ بات جانتا ہے۔ کہیں دل چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کو توڑے، اگر حرام کاموں کو دور بھی کر دیا جائے اور صرف حلال کاموں کی ہی بات کی جائے، تو یہ بھی عام مشاہدہ ہے کہ انسان کے پاس پیسے ہوتے

ہیں، دل چاہ رہا ہوتا ہے کہ مہنگی گھڑی خرید لوں، میرے پاس دس قمیضیں ہیں، دل چاہتا ہے دو اور خرید لوں، جوتے اور لے لوں۔ یہ وہ خواہشات نفس ہیں کہ جو حرام نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا ہے تو بے شک لیں، لیکن انہی خواہشات پر قابو پانا عزیمت کا راستہ ہے۔ یہی وہ خواہشات ہیں کہ جن میں انسان لپٹا ہوتا ہے، جن میں انسان پھنسا ہوتا ہے۔ ان خواہشات پر قابو پا کر اللہ کی راہ میں پیسہ تقسیم کر دیں، اس طرح نفس پر ضرب لگے گی، یہ اسکی اصلاح کیلئے لازم ہے۔ بہت سی چیزیں انسان کی ضرورت ہوتی ہیں، مثلاً کھانا، کپڑے، ادویات وغیرہ۔ بہت سی چیزیں انسان کی خواہشات، مثلاً مہنگے ہوٹل میں جا کر کھانا، عالیشان گاڑی لینا، پر تعیش رہائش رکھنا وغیرہ۔ ضرورت اور خواہش میں توازن قائم رکھنا مومن کی صفت ہے۔ مومن خرچ کرتا ہے، مگر فضول خرچ نہیں ہوتا، ضرورتیں پوری کرتا ہے، مگر خواہشات نفس نہیں۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ بندہ مومن کی ضروریات بھی کم ہونے لگتی ہیں اور وہ انتہائی کم وسائل کے باوجود بھی ایک پرسکون زندگی گزار سکتا ہے۔

”ان لک فی النهار سبحاً طویلاً۔“ (آیت ۷)

”بے شک دن میں آپ کے لیے بہت سی مصروفیات ہوتی ہیں۔“

مثلاً نوجوانوں کو یونیورسٹی، کالج جانا ہوتا ہے، امتحانات کی تیاری کرنا ہوتی ہے، والدین کام پر لگا دیتے ہیں، دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے جانا ہوتا ہے، دفتری اور نوکری کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، وغیرہ۔

”واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلاً۔“ (آیت ۸)

”اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتے رہیں، اور ہر ایک سے ٹوٹ کر اس کے ہور ہیں۔“

یہ ایک بہت خوبصورت راز ہے۔ جب تزکیہ، معرفت اور اللہ تعالیٰ سے تعلق کی بات ہوتی ہے تو جو بزرگ ان معاملات میں اختصاص رکھتے ہیں، ان کو اولیاء اور مرشدین کہا جاتا ہے۔ اللہ کے بے شمار نام ہیں۔ رحمان، رحیم، ستار، غفار، قہار وغیرہ۔ مگر جب ”واذکر اسم ربک“ کی بات ہوتی ہے، کہ اپنے رب کے ”اسم“ کا ذکر کرو، تو اس سے مراد اسم ذات ”اللہ“ کا ذکر ہے۔ اسی لیے طریقت کے تمام سلاسل میں ”اللہ ہو“ کے ذکر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا حکم سورہ مزمل کی اسی آیت سے لیا جاتا ہے، کہ پوری کائنات سے کٹ کر اپنے رب کی طرف متوجہ رہو۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی ایسا وقت ضرور نکالیں کہ جب آپ اپنے رب سے بات کرنے کیلئے تنہا ہوں۔ اس میں کائنات کی اور کوئی شے دخل انداز نہ ہو۔ جب انسان کی رات کی تاریکی میں تربیت ہو جاتی ہے، تو اسکے بعد دنیا کے کسی بھی مقام پر وہ جو مرضی ذمہ داری ادا کر رہا ہو، دنیا کی نظر میں تو وہ وہاں کھڑا ہوتا ہے، مگر روحانی طور پر اس کا اپنے رب کے ساتھ ایک ایسا ذاتی تعلق قائم ہو جاتا ہے کہ پھر کوئی چیز اس کے اور اسکے رب کے درمیان نہیں آسکتی۔ دنیا کی ذمہ داریاں آپ بے شک ادا کرتے رہیں۔ ڈاکٹر ہوں، انجینئر ہوں، سائنسدان، افسر یا طالب علم، لیکن اگر آپ مزمل کی تربیت کے مرحلے سے گزر چکے ہیں، تو اسکے





بعد آپ کے اور آپ کے رب کے درمیان کوئی نہیں آسکتا۔

”رب المشرق و المغرب لا اله الا هو فاتخذہ وکیلاً“۔ (آیت ۹)

”وہ مشرق اور مغرب کا مالک ہے، اس کے سوا کوئی معبود، محبوب، مقصود، مطلوب اور موجود نہیں، سوا سی کو (اپنا) وکیل بناؤ۔“

وکیل بنانے کا کیا مطلب ہے؟ جب آپ عدالت میں کوئی مقدمے لڑتے ہیں، تو اپنا سارا مقدمہ وکیل کے حوالے کر دیتے ہیں۔ پھر وکیل سے کہتے ہیں کہ تم جانو اور تمہارا کام۔ آپ خود سکون سے بیٹھ جاتے ہیں۔ وکیل آپ کی طرف سے مقدمہ لڑتا ہے۔ اللہ جو مشرق اور مغرب کا مالک ہے، جو دو جہانوں کا مالک ہے، جس کے علاوہ کوئی حقیقت، کوئی مقصود، کوئی طاقت موجود نہیں ہے، اسی کو اپنا وکیل بناؤ۔ اپنے سارے مقدمات اسی کے حوالے کر دو۔ اپنی جان، مال، رزق، عزت و آبرو، بچے سب کچھ اپنے رب کی پناہ میں دے دو۔ تمہارا رب تمہارے مقدمات سنبھال لے گا۔ پھر تمہاری ساری ذمہ داریاں تمہارے رب کے پاس ہوں گی۔ جب تم اس مشن پر روانہ ہو گے تو راستے میں مشکلات ضرور آئیں گی۔

”واصبر علیٰ ما یقولون واهجر ہم هجراً جمیلاً“۔ (آیت ۱۰)

”اور یہ (آپ کے مخالفین) جو کچھ بھی کہتے رہیں، اس پر صبر کریں اور ان کو نہایت پروقار طریقے سے نظر انداز کر دیں۔“

یعنی یہ تمہارا مذاق اڑائیں گے، تمہاری توہین کریں گے، بے عزتی کریں گے، تم کو کافر بھی کہیں گے، تم کو پتھر بھی ماریں گے، مگر تم صبر کرنا، متانت اور بردباری کے ساتھ۔ پست سطح پر نہ اتر آنا۔ ان کے مقابلے پر تمہیں پروقار اور تہذیب یافتہ انداز میں اپنے مشن کو جاری رکھنا ہے۔

”وذرنی و المکذبین اولی النعمۃ و مہلہم قلیلاً“۔ (آیت ۱۱)

”اور یہ صاحب اختیار اور صاحب ثروت لوگ کہ جو آپ کا مذاق اڑاتے ہیں، ان کو ذرا چھوڑیں اور ذرا مہلت دیں (پھر دیکھیں کہ ہم ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں)۔“

یہ بات نوٹ کیجئے کہ کئی دور، کہ جو تیرہ سال پر مشتمل ہے، میں مسلمانوں کو تلوار نکالنے کی اجازت نہیں تھی۔ مسلمانوں کو حکم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ کو اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہے، کیونکہ وہ تربیت کا دور تھا۔ غیر تربیت یافتہ فوج کے ساتھ جنگ کا آغاز نہیں کیا جاتا۔ جب مسلمانوں کی جماعت تربیت یافتہ ہو جاتی ہے، مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام وجود میں آ جاتا ہے، تب مسلمانوں کو تلوار نکالنے کا حکم اور اجازت ملتی ہے۔ غزوہ بدر ہجرت کے دوسرے ہی سال برپا ہوتی ہے، مگر اس سے پہلے ہی مشرکین سے جھڑپوں کا آغاز ہو جاتا ہے۔

آج کے دور میں بھی کسی بھی جماعت یا قوم کیلئے سورہ منزل، اس کا تربیتی نظام اور مکی و مدنی دور کی حکمت عملی کا فرق سمجھنا اور اختیار کرنا لازم ہے۔ قرآن و سنت کی اس حکمت کو سمجھے بغیر، ان تربیتی مراحل سے گزرے بغیر، جو بھی اقامت دین کا کام کرنے کی کوشش کرے گا، خود بھی رسوا ہوگا، دین میں فتنہ پھیلانے کا اور امت کو بھی تقسیم کرے گا۔ اس تربیتی نظام کے بعد ہی ”مدر“ کی ڈیوٹی شروع ہوتی ہے۔







## طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گوہر نکلے

بندہ ءمومن جب تک سورہ مزمل کے تربیتی پروگرام سے نہ گزرے، وہ اللہ کے دین کو نافذ، غالب اور قائم کرنے کیلئے ”مدرّس“ کی اذان نہیں دے سکتا۔ گزشتہ باب میں ہم نے اس تربیتی پروگرام پر بات کی تھی کہ جو اللہ نے بندہ ءمومن کیلئے سورہ مزمل میں دیا ہے۔ ہم اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سورہ مدرّس پر بھی بات کریں گے۔

سورہ مزمل میں اللہ تعالیٰ نے اس بندہ ءمومن کیلئے تربیت کا نظام دیا ہے کہ جس پر وہ بڑی بھاری ذمہ داری ڈالنے والا ہے۔ اللہ کے دین کو نافذ، غالب اور قائم کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی شخص اللہ کے دین کو نافذ، غالب اور قائم کرنے کے لیے ذمہ داری اٹھائے اور اس پر قیامت نہ ٹوٹے۔ یہ انبیاء کا کام ہے یا پھر ان لوگوں کا کہ جو انبیاء کرام سے فیض لیں۔ ہر دور میں اللہ تعالیٰ کوئی ایسا بندہ، فقیر، درویش، مجدد، عالم یا ولی پیدا کرتا ہے کہ جو اس وقت اللہ کے دین کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہے۔ یہ لوگ بہت نصیب والے ہوتے ہیں۔ ہر دور میں آپ کو ایسے لوگ مختلف روپ میں ملیں گے۔ کہیں عالم دین کی شکل میں، تو کہیں مسلمان جرنیل کی شکل میں، کہیں فقیر کے روپ میں اور کہیں محدث کی شکل میں۔ اگر یہ وجود اپنی جگہ پر قائم نہ رہیں، تو پھر آنے والی نسلیں گمراہ ہو جاتی ہیں۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ جب تم خرافات کے پاس سے گزرو، تو عزت، غیرت اور وقار کے ساتھ گزرو! راستے میں اگر آپ پر کتے بھونکنے لگیں، تو ان کو چپ کرانے کیلئے ان پر بھونکنا نہیں شروع کر دیتے۔ شیخ سعدیؒ نے کیا خوب کہا ہے:

غوغائے سگاں کم نہ کند رزق گدارا

یعنی کتوں کے بھونکنے سے فقیر کا رزق کم نہیں ہوتا۔ فقیر کو اللہ اس کا رزق دیتا رہتا ہے، چاہے کوئی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کر لے۔ ابو جہل کے شور مچانے سے مسلمانوں کی جماعت کو کیا فرق پڑ گیا؟ کیا وہ مشن کو روک سکا؟ نہیں۔ مسلمانوں کی جماعت کی تعداد میں کمی کس سکا؟ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے امت کیلئے جو کرم اور فیض کھول دیا ہوتا ہے، اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ تقدیر جو فیصلے کر چکی ہوتی ہے، انہیں کوئی تبدیل نہیں کر سکتا۔ لوگ جتنا مرضی چیخ لیں کہ پاکستان نہیں بن سکتا، پاکستان کا فرستان ہے، علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کا فر ہیں، لیکن جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ جو لوگ اس وقت تقدیر الہی کی مخالفت کر رہے تھے، وہ آج بھی کر رہے ہیں۔ وہ اس وقت بھی رسوا تھے اور آج بھی رسوا ہیں۔ اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔

جب انسان سورہ منزل کا تربیتی پروگرام مکمل کر لیتا ہے، تو وہ اپنے رب پر بھروسہ کرنا سیکھ جاتا ہے، اپنے رب کو اپنا کیل بنالیتا ہے۔ پھر وہ مدر کی بھاری ذمہ داری کیلئے بھی تیار ہو جاتا ہے اور پھر اگر اللہ چاہے، تو اس پر وہ ذمہ داری دھیرے دھیرے بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ جب اس کو وہ ذمہ داری دے دی جاتی ہے، جب وہ اس صبر اور وقار کا مالک ہو جاتا ہے کہ چاہے پوری دنیا اس پر کچڑا چھالتی رہے اور وہ متانت سے گزر جائے، جب کچرا پھینکنے والی عورت ایک دن کچرا نہیں پھینکتی تو وہ جا کر اس کی خیریت معلوم کرے، تب انسان کا یہ کردار اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اب وہ کار نبوت کا حق ادا کرنے کا اہل ہے۔

جن بندوں سے اللہ کام لیتا ہے، ان کا سب سے بڑا وصف یہی ہوتا ہے کہ وہ معاف کرنے والے ہوتے ہیں۔ آجکل لوگ معاف کرنا بھول گئے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مقدمات قائم کر دیئے جاتے ہیں، قتل ہو جاتے ہیں۔ انتقامی کارروائیاں ایسی کہ استغفار! ایک شخص نے ہمیں بتایا کہ فلاں شخص میرے بیٹے کی شادی میں نہیں آیا تو میں نے بیس سال اس سے بات نہیں کی۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پہ تعلقات قطع کر دیئے جاتے ہیں، انا اللہ وانا الیہ راجعون! سوچیئے اگر اللہ تعالیٰ نے بھی، ہماری غلطیوں اور گناہوں کی وجہ سے، ہم سے قطع تعلیق کر لیا اور ہمارا چہرہ سے بھی انکار کر دیا، تو پھر ہم کیا کریں گے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے ساتھ وہی سلوک کرتا ہے کہ جو انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔

جب آپ اس تربیتی پروگرام سے گزریں تو اس مقام پر پہنچ جائیں گے کہ آپ میں معاف کرنے کا ظرف بھی ہوگا۔ یہ اللہ کے بندوں کی خاص صفت ہوتی ہے۔ وہ برداشت بھی کرتے ہیں اور معاف بھی۔ انکا صبر بے انتہا آزمایا جاتا ہے، لیکن وہ درگزر سے کام لیتے ہیں۔ اپنی ذات کیلئے کبھی انتقام نہیں لیتے۔ حضور اکرم ﷺ نے تمام منافقین کے نام ایک صحابی کو لکھوا دیئے تھے۔ سب کو نہیں بتائے۔



حضرت عمرؓ بار بار ان صحابیؓ کے پاس جا کر پوچھتے کہ صرف یہ بتا دو کہ ان میں میرا نام تو نہیں ہے۔ یعنی خشیت کا یہ عالم تھا!

حضور ﷺ کو سب معلوم تھا کہ کون منافق ہے اور کون مومن، مگر پردہ رکھتے تھے۔ لوگوں کی غلطیوں کو ایسے چھپا جاتے کہ جیسے پتہ ہی نہ ہو۔ بندہ مومن کی بھی یہی صفت ہے۔ لوگوں کے بڑے بڑے گناہ دیکھ لیتا ہے، لوگوں کی غلطیاں کوتاہیاں اس کو پتہ چل جاتی ہیں، مگر کیونکہ اللہ ”ستار العیوب“ ہے، گناہوں پر پردے ڈالتا ہے، اسی لیے اللہ کا بندہ بھی ستار ہوتا ہے۔ وہ بھی لوگوں کی غلطیوں پر پردے ڈالتا ہے۔ وہ انسان کہ جو لوگوں کے گناہوں پر پردے ڈالتا ہے، اللہ پھر اس کے گناہوں پر پردہ ڈالتا ہے۔ جس کا پردہ اللہ نے اٹھا دیا، وہ دنیا و آخرت میں ہلاک و رسوا ہوا۔

لوگ اپنے گناہوں پر امید رکھتے ہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے گا، ان سے نرمی کا معاملہ کرے گا، مگر جب دوسرے سے معاملات کرتے ہیں تو نہ صرف ان کی غلطیاں معاف نہیں کرتے بلکہ بڑا سخت حساب کرتے ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیں کہ جو اللہ کی مخلوق سے سخت حساب کرتا ہے، آخرت میں ایک سخت حساب اس کا منتظر ہوتا ہے۔

ہم ایک فقیر کے پاس جاتے ہیں۔ لوگ ان سے بڑی بڑی دعائیں کروانے آتے ہیں اور وہ اللہ کا بندہ صرف ایک دعا دیتا ہے: ”اللہ پردے رکھے“۔ کیونکہ اللہ پردے رکھے گا تو حساب آسان ہو جائیگا، ہلکا ہو جائے گا ورنہ اگر حساب کھل گئے، پردے کھل گئے تو پھر کوئی بچ نہ پائے گا، نہ دنیا میں، نہ آخرت میں۔ اللہ کا یہ احسان ہے کہ وہ پردے رکھتا ہے۔

ایک شخص سے دوسرے شخص نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ کیسی گزر بسر ہو رہی ہے؟ اس نے بڑے اداس اور دکھی انداز میں جواب دیا: ”بس ٹھیک ہے، شکر ہے اللہ کا“۔ لکھنے والے نے لکھا کہ میں نے کہا کہ یہ تم نے اللہ کا شکر ادا کیا ہے یا رازق دو عالم کو طعنہ دیا ہے؟ اگر شکر ادا کرو تو زبان کے علاوہ وجود سے بھی کرو۔ تمہارا چہرہ بھی چمکتا دمکتا ہوا دکھائی دینا چاہیے، چاہے بھوک سے مر رہے ہو، تمہارے پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہوں، تین دن سے کھانا نہ کھایا ہو، مگر آنکھوں کی چمک رب کائنات سے کہہ رہی ہو کہ اگر آپ میرے رب ہیں، تو میں بھی آپ کا بندہ ہوں، شکایت نہیں کروں گا! شکایت نہیں ہونی چاہیے اللہ سے۔ اگر آزمائش پہ صبر کرنا ہے تو عزت، وقار اور حوصلے کے ساتھ کرنا ہے۔ بندہ مومن کی خصوصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے شکوے اور شکایتیں لے کر لوگوں کے پاس نہیں جاتا۔ اس کے رب کو معلوم ہوتا ہے کہ اسے کیا چاہیے۔ اس پہ جو مرضی قیامت گزر جائے، اس کی زبان پر شکوہ اور شکایت تو دور کی بات، زبان سے صرف شکر ہی ادا ہوتا ہے۔ مصیبتوں پر صبر کرنا اعلیٰ مقام ہے، مگر اس سے بھی اعلیٰ مقام یہ ہے کہ انسان مصیبتوں میں ہوتے ہوئے بھی اللہ کا شکر ادا کرے۔ یہ فضل ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ قرآن میں ”وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ“ اور ”وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ“ کی تلقین کی گئی ہے۔ جب بھی حق بات کی تلقین کی جائے گی، اذان حق دی جائے گی، ”مدرّ“ کی ڈیوٹی ادا کی جائے گی، تو مخالفت ہوگی۔ ایسے میں صبر کرنا واجب اور لازم ہوتا ہے، اور صبر کی تربیت کے بغیر یہ ڈیوٹی انجام نہیں دی جاسکتی۔

سورہ منزل کے تربیتی پروگرام سے گزر کے جب آپ میدان جنگ میں آتے ہیں تو کہا جاتا ہے، ”یا الیہا المدثر!“ مدثر کا ترجمہ بھی وہی ہے۔ ”لحاف میں لپٹے ہوئے“۔ ظاہر ہے آج کے دور میں کوئی شخص لحاف میں تو نہیں لپٹا ہوا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کفر کے نظام سے خوف میں لپٹا ہوا شخص۔ جب انسان وقت کے فرعون کو چیلنج کرنے جاتا ہے، تو اس کے وجود میں خوف سراٹھانے لگتے ہیں۔ موسیٰ کو جب اللہ تعالیٰ نے فرعون کے دربار میں بھیجا تو انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا: ”یا اللہ! میں نے تو وہاں قتل کیا ہوا ہے، وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔“ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ ہارون کو ساتھ بھیج دیتا ہوں، یعنی بھائی کو ساتھ بھیج دیا لیکن بھائی کا ساتھ ہونا بھی فرعون کے مقابلے میں طاقت کا باعث تو نہ تھا۔ اہمیت اس سے اگلے جملے کی تھی کہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا کہ میں آپ دونوں کے ساتھ ہوں، وہ کچھ کر کے تو دیکھیں آپ کے ساتھ! یہ وہ مقام ہے کہ جس کیلئے کہا گیا ہے کہ اللہ کو اپنا وکیل بنا لو۔ اپنا مقدمہ اس کے حوالے کر دو۔ موسیٰ نے بھی یہی کیا۔ اپنا مقدمہ اللہ کے حوالے کر دیا اور پھر وقت کے فرعون سے ٹکرا گئے۔

سوچیں آج پورے امریکہ کو چیلنج کرنے کیلئے ایک فقیر اپنے ساتھ ایک اور آدمی کو لے جائے اور امریکی صدر کے دربار میں جا کر کلمہ حق بیان کرے۔ کیا دنیا ہنسے گی نہیں؟ تماشا نہیں بنائے گی؟ حضرت موسیٰ جب اپنے بھائی کو لیکر فرعون کے دربار میں گئے تو کچھ یہی صورتحال تھی۔ کوئی مقابلہ نہ تھا ان کے اور فرعون کے درمیان۔ مگر اس سارے واقعے میں فرعون کی پوری حکومت تباہ ہوگئی، مگر ایک تیر بھی نہ چلا حضرت موسیٰ کی جانب سے۔ بنی اسرائیل کے پاس نہ فوج تھی نہ ہتھیار، مگر فرعون کی پوری فوج ہتھیاروں سمیت غرق ہوگئی اور اس مقصد کیلئے اللہ نے کوئی فوج بھیجی؟ موسیٰ اور ہارون!

جب آپ منزل کے تربیتی پروگرام سے گزر کر مدثر کی ذمہ داری ادا کرنے پر آتے ہیں، تو خوف تو پھر بھی ہوتا ہے۔ مگر حکم دیا گیا ہے کہ اٹھیے اور اذان دیجیئے اور لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیجیئے! اب وقت آگیا ہے۔ اب لوگوں کو بتائیے کہ ہوش میں آ جاؤ! ہندوستان تمہاری سرحد پہنچیں جمع کر رہا ہے۔ لوگوں کو آگاہ کیجئے کہ یہ سود اور ربا کا معاشی نظام پاکستان کو تباہ کر رہا ہے۔ جاؤ اب کھل کر اذان دو کہ یہ خوارج کا فتنہ مذہب کے لبادے میں امت کو تباہ کر رہا ہے، کھل کر اعلان کرو کہ آج صلیبی اور صیہونی طاقتیں امت مسلمہ کو تباہ و تقسیم کر رہی ہیں، کھل کر تنبیہ کرو کہ ہماری صفوں میں موجود منافق مدینہ عثانی کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں، چاہے وہ علماء کے روپ میں ہوں، دانشوروں کے روپ میں، سیاستدانوں کے لبادے میں یا جہادیوں کی شکل میں۔

رب کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب صرف نعرہ تکبیر بلند کرنا نہیں ہے۔ رب کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب یہ ہے کہ رب کی زمین پر رب کا نظام قائم کیا جائے۔ رب کی بڑائی بیان کرنے کا مطلب ہے کہ بے باک دہل یہ کہا جائے کہ اب یہاں کفر کا بنایا ہوا جمہوریت، آمریت اور سود اور ربا کا نظام نہیں چلے گا۔ یہاں پہ اللہ کے دین کا بنایا ہوا خلافت راشدہ کا معاشی، سیاسی، سماجی اور عدالتی نظام قائم ہوگا۔ یہاں اللہ کا پورا دین غالب و نافذ ہوگا۔

یہی وہ مقام ہے کہ جہاں سے تصادم کا آغاز ہوتا ہے۔ جیسے ہی آپ کفر کے نظام میں اذان دینا شروع کریں گے، تو یہ تصادم شروع



ہو جائیگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہو ”لا الہ الا اللہ“، یعنی اللہ کے سوا کوئی حاکم، مالک، معبود اور مطلوب نہیں ہے، تو فلاح پا جاؤ گے۔ ہم بھی تو روزِ کلمہ پڑھتے ہیں، مگر کفر کو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا، لیکن اُن کفار اور مشرکین کو اس کلمے کی کیا سمجھ آئی تھی کہ جس لمحے وہ یہ کلمہ سنتے، مسلمانوں پر قیامت ڈھانا شروع کر دیتے۔ ان مشرکوں کو تو حید کی ایسی کوئی طاقت کا علم تھا کہ وہ اس کو اپنے لیے سب سے بڑا خطرہ سمجھتے؟

اب آپ کو سمجھ آئے گا کہ مسلمان جماعتیں اور تحریکیں کیوں کامیاب نہیں ہوتیں۔ ان میں کام کرنے والے افراد کی تربیت مزل پر نہیں ہوتی، چنانچہ وہ مدثر کی ذمہ داری ادا کرنے کے اہل بھی نہیں ہوتے۔ نہ نفس پہ قابو پایا، نہ اللہ کو کیل بنایا، نہ بھاری ذمہ داری کے لیے تیار ہوئے، نہ اتنا وقار کہ معاف کر سکیں، نہ صبر کرنے کی جرأت۔ آپ سے باہر بھی ہو جاتے ہیں، جلد باز بھی ہیں، درگزر بھی نہیں کر پاتے، دوسروں کی غلطیوں پر پردہ بھی نہیں ڈالتے، خواہشاتِ نفس میں لپٹے ہوئے اور امراضِ قلبی میں بھی مبتلا، اپنی مرضی، اپنی انا کو انہوں نے خدا بنایا ہوا ہے، خواہشاتِ نفس کی چادر لپیٹ رکھی ہے، کہ جس کے سبب مدثر کی ڈیوٹی انجام دینے کے اہل نہیں ہیں۔

## سوالات و جوابات

سوال: ہم نوافل تو ادا کر لیتے ہیں۔ اپنی نفسانی خواہشات کو دبا لیتے ہیں۔ انہیں اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں، لیکن اپنی نمازوں، اپنی عبادات میں ہم وہ عشق کیسے لائیں کہ جو صحابہ کرام کی عبادات میں تھا؟

جواب: جب آپ کو یہ یقین ہو کہ سوائے اللہ کے، کائنات میں میرا کوئی آسرا، کوئی سہارا نہیں، اس وقت نمازوں میں سوز آتا ہے۔ آپ اپنی زندگی میں نوٹ کریں۔ اگر آپ کا کوئی پیارا بیمار ہو، مرنے والا ہو اور ڈاکٹر یہ کہہ دے کہ اب صرف دعا ہی بچا سکتی ہے، اس رات پھر دیکھیں کہ کیسے آپ کے آنسو نکلتے ہیں۔ جب تک دل نہ ٹوٹے، اس وقت تک نماز میں سوز نہیں آتا۔ جب تک انسان کی زندگی میں کوئی ایسا طوفان نہ آئے، کہ جو اسکے وجود کو ہلا کے رکھ دے، اس وقت تک نماز میں درد پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے اقبالؒ نے دعا کی تھی۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے

کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں



کیٹ سٹیونز سے یوسف اسلام تک

جو انسان ٹھنڈی، پرسکون زندگی گزار رہا ہے، غافل ہے، اپنی زندگی میں مست ہے، کھانا پینا مل رہا ہے، روپیہ پیسہ وافر ہے، کاروبار ٹھیک ہے، کئی سال کیلئے وسائل اور خزانے اسکے پاس موجود ہیں، نہ اسکو رزق کا کوئی مسئلہ ہے نہ صحت کا، طاقت اور اختیار اس کے پاس ہے، لہذا اسے کسی کا خوف بھی نہیں، اسکے دل میں آخر گداز کیسے پیدا ہو! گداز تو تب پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان دکھی ہو۔ اتنے غیر مسلم مسلمان ہوئے۔ نو مسلموں کی کہانیاں سنیں۔ یوسف اسلام (Cat Stevens) اس وقت مسلمان ہوا، اسکے دل اللہ کی طرف اس وقت راغب ہوا کہ جب وہ موت کے قریب پہنچا اور اس دکھی دل کے ساتھ کہ جب اس کو اپنی موت کا یقین تھا، تو اس نے قرآن پڑھنا شروع کیا اور پھر، ماشاء اللہ، اسلام قبول کر کے یوسف اسلام بن گیا۔ ایسی ہزاروں مثالیں ہیں۔ جب دل ٹوٹتا ہے، جب دل نرم ہوتا ہے، تب نماز اور دعا میں سوز و گداز آتا ہے۔ اس لیے بندہ ءمومن کی یہ خاص صفت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دکھ بانٹتا ہے، یتیموں، یتیموں اور مسکینوں کے پاس جاتا ہے، قبرستانوں میں جاتا ہے کہ ان سب باتوں سے انسان کا دل گداز ہوتا ہے۔

بندہ ءمومن کے دل کی خواہش ہوتی ہے کہ حضور ﷺ کے قد میں شرفین میں جا پہنچے۔ اسکے علاوہ کائنات کی کوئی اور خواہش اسکے دل میں نہیں ہوتی۔ جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے تو فقراء کی زبان میں وہ مرنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔ مرنے سے پہلے مرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی خواہشات نفس کو اس طرح ختم کر دے کہ نفس امارہ، نفس مطمئنہ میں بدل جائے۔ یہ نفس مطمئنہ کی کیفیت جس کو حاصل ہو جائے، اس کی خواہشات نفس ختم ہو جاتی ہیں، پھر وہ اللہ ہی کے لیے جیتا اور مرتا ہے، اپنی ذات کے لیے نہیں۔ نہ اس کی سفلی خواہشات ہوتی ہیں، نہ اس کے دل میں انتقامی جذبات ہوتے ہیں، نہ اس میں غصہ پایا جاتا ہے۔ وہ اس لیے جیتا ہے تاکہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کی طرف سے دی گئی ذمہ داری ادا کر سکے، زندگی صرف شکر اور ڈیوٹی میں گزارتا ہے۔



میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی

میں اسی لیے مسلمان، میں اسی لیے نمازی

یہ مقام جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو عطا فرما دیتا ہے، تو وہ صرف رب ہی کا طالب بن جاتا ہے۔ اسے دنیا کی کسی شے کی طلب نہیں رہتی۔ یہ حقیقت اسی وقت انسان کو عطا ہوتی ہے کہ جب وہ خواہشات نفس سے اتنا اوپر چلا جائے کہ سوائے اپنے رب کی ذات کے کسی اور چیز کا طالب نہ رہے۔ جنت بھی نہ مانگے، صرف رب کو مانگے۔ پھر رب انہیں اپنا آپ بھی دیتا ہے، دنیا بھی دیتا ہے اور آخرت بھی۔

سوال: آجکل کے دور میں ہم سورہ مزمل سے سورہ مدثر تک کا فاصلہ کیسے طے کر سکتے ہیں؟

جواب: سورہ مزمل ایک فرد کیلئے تربیتی پروگرام ہے۔ یہ ہر شخص اپنے گھر میں کر سکتا ہے۔ کتنا وقت گھر کو دینا ہے، کتنا ڈی کو دینا ہے، کتنا وقت کالج، یونیورسٹی میں گزارنا ہے، کتنا وقت پڑھائی کو دینا ہے اور کتنا وقت کھیل کو۔ اپنی زندگی کے نظام الاوقات کا تعین آپ خود کرتے ہیں۔ آپ کو اختیار دیا گیا ہے کہ جتنا وقت بھی ہے، اس میں اپنی مرضی سے، خاص طور پر رات کی تاریکی میں، نفل عبادت کریں۔ رسول اللہ ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ براہ راست ذاتی تعلق قائم کریں۔ ہم پہلے بھی یہ بات کر چکے ہیں کہ حضور ﷺ ہمارے آخری نبی ﷺ تو ہیں ہی، مگر ان کو مرشد تسلیم کرنا بھی لازم ہے۔ مرشد کا مطلب ہے کہ ان کے ساتھ ایک ذاتی روحانی تعلق بھی قائم کیا جائے۔ جس طرح صحابہ کرامؓ مجموعی طور پر اس امت کا حصہ ضرور ہیں، مگر ان سب کا حضور ﷺ سے ایک ذاتی روحانی تعلق بھی تھا۔ حضور ﷺ کے دربار میں ہر ایک کا اپنا ایک منفرد مقام ہے۔ کوئی عشرہ مبشرہ میں سے ہے، کوئی خلفائے راشدین میں سے ہے، کوئی اہل بدر میں سے، تو کوئی بیعت رضوان اور کوئی اصحاب صفہ میں سے۔ ہر صحابی کا اپنا درجہ متعین ہے۔ اسی طرح آج بھی ہر امتی کا حضور ﷺ سے ایک ذاتی تعلق ہے اور حضور ﷺ کے دربار میں اس کا اپنا ایک مقام متعین ہوتا ہے۔ اسکے عشق، اسکے پیار، خلوص، قربانی اور سچائی کی وجہ سے حضور ﷺ کے دربار میں اس کا ایک درجہ متعین کیا جاتا ہے۔

کوئی بھی تربیتی پروگرام بغیر استاد اور مرشد کے نہیں ہوتا۔ استاد اور مرشد تلاش کریں۔ علمائے حق میں سے بھی آپ کو ایسے لوگ ملیں گے، فقراء میں سے بھی ملیں گے۔ انہیں تلاش کریں، کیونکہ استاد کی عدم موجودگی میں اعلیٰ سے اعلیٰ ترین کتاب بھی ریکار جاتی ہے۔ انسان اس پر عمل نہیں کر پاتا۔ سورہ مزمل کی پہلی گیارہ آیات میں سے بھی بیشتر آیتیں ایسی ہیں کہ جن کا تعلق انسان کی قلبی واردات سے ہے، انسان کے دل کے امراض سے ہے۔ وہاں یہ کہا گیا ہے کہ وقار کے ساتھ درگزر کرو، صبر کرو۔ یہ ساری آزمائشیں قلب کی ہیں۔ آپ پر بھاری ذمہ داری آنے والی ہے۔ صرف جسمانی تربیت ہی نہیں درکار، قلبی تزکیہ بھی چاہیے۔ یہاں پر آپ کو ایک ایسا استاد چاہیے کہ

جو خود اس مقام پر فائز ہو کہ اسے اللہ کی طرف سے اس بات کی اجازت ہو کہ وہ انسان کا تزکیہ کر سکے، نیتوں کو درست کرے، امراض قلبی کا علاج کرے۔

اگر انسان نیت کرے کہ اسکو جنت حاصل کرنی ہے اور پھر ساری رات تہجد پڑھے تو اسے جنت مل جائے گی، لیکن اگر وہ یہ نیت کرے کہ دنیا اس کے ماتھے پر پڑنے والے نشان کو دیکھ کر اسے تہجد گزار سمجھے گی، تو وہ تباہ و برباد ہو جائیگا۔ عبادت تو ایک ہی ہے، مگر نیت کے فرق سے اجرا و فیض تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ نیت درست کروانا مرشد کا کام ہے۔

ایک بہت بڑی محفل کے اختتام کے بعد تمام لوگ سو رہے تھے۔ ایک آدمی نے آدھی رات کو اپنے بیٹے کو اٹھایا اور کہا کہ آؤ تہجد پڑھیں۔ دونوں باپ بیٹا تہجد پڑھنے لگے۔ تہجد پڑھنے کے بعد بیٹا بولا: ”بابا ہم کتنے اچھے ہیں۔ سب لوگ سو رہے ہیں اور ہم نے تہجد پڑھی“۔ یہ سن کر باپ بولا: ”اس سے تو بہتر تھا کہ تو بھی سوتا ہی رہتا۔ یہ تکبر تجھے تباہ کر دے گا!“

جس کے دل میں رائی برابر بھی تکبر ہوا اور جس نے دوسرے مسلمانوں کو حقیر سمجھا، وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ فقیروں اور درویشوں کی باتیں بڑی گہری ہوتی ہیں۔ ایک فقیر نے ہمیں کہا کہ میں لوگوں کے گناہوں سے نہیں ڈرتا، مجھے لوگوں کی نیکیوں سے ڈر لگتا ہے۔ یہ بات عجیب سی لگتی ہے۔ ہمیں بھی اس وقت یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ ہم نے کہا کہ بابا وضاحت کریں۔ کہتے ہیں کہ گناہ پہ انسان خجالت کا اظہار کرتا ہے، شرمندگی محسوس کرتا ہے، کوئی انسان گناہ کر کے فخر نہیں کرتا اور پھر اللہ کے حضور توبہ استغفار کرتا ہے، اس کے سامنے جھکتا ہے، شرمندگی کے آنسو بہاتا ہے۔ اللہ کو یہ بات بہت پسند ہے کہ انسان گناہ کے بعد اس کے حضور توبہ و استغفار کرے۔ اللہ کی رحمت بڑی وسیع ہے۔ جو اللہ کا بندہ گناہ کرنے کے بعد اللہ سے سچے دل سے توبہ کرتا ہے، اللہ اسکی مغفرت فرما دیتا ہے، بلکہ بعض لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اللہ انکے گناہ نیکیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ مگر ہمیں جس چیز سے خطرہ ہے وہ یہ کہ انسان اپنی نیکیوں پر تکبر کرنے لگے۔ یہ عادت انسان کو ہلاک کرنے والی ہے۔ جو انسان بہت نیک ہو جاتا ہے، شیطان سب سے شدید حملے بھی اسی پر ہی کرتا ہے، اور اسے کہتا ہے کہ تو بڑا نیک ہے اور جس لمحے انسان میں نیکی کا تکبر آ جاتا ہے، جہنم اسکا مقدر بن جاتی ہے۔ کیونکہ ایسے معاملے میں وہ توبہ بھی نہیں کرتا، کیونکہ اسے اپنی نیکی پر گھمنڈ ہوتا ہے، گناہوں پر خجالت نہیں۔ گناہوں پر خجالت ہو تو انسان کو توبہ کی توفیق مل ہی جاتی ہے۔ نیکی کا تکبر ایسا فتنہ ہے کہ انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا اور وہ ہلاک ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ کے بندے اپنے گناہوں سے نہیں، اپنی نیکیوں کے تکبر سے خوف کھاتے ہیں۔

غلطی کا احساس ہونا اور توبہ کی توفیق ملنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ کی طرف سے اس شخص کی مغفرت کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔ جس کی مغفرت اللہ نے نہ کرنی ہو، اس کو اپنے گناہ کا احساس ہی نہیں ہوتا، نہ توبہ کی توفیق ملتی ہے۔ توبہ کی توفیق مغفرت کی دلیل ہے۔







سوال: حضور ﷺ کی اس دعا ”ربنا آتنا فی الدنیا.....“ اسکی تشریح ظاہری اور باطنی طور پر کیا ہے؟

جواب: قرآن پاک کی آیتوں کے حوالے سے آپ کو بتایا گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ جو آیتیں نازل فرماتا ہے، ان کی ظاہر اور باطن دونوں طرح سے تشریح ہو سکتی ہے۔ ”انا اعطینک الکوثر“ کے حوالے سے آپ کو بتایا تھا کہ اسکی تشریح یہ ہے کہ ہم نے آپ کو حوض کوثر عطا کیا، حضور ﷺ کو ساقی کوثر کہا جاتا ہے۔ ”فصل لربک وانحر“۔ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجیے، ان شاء اللہ، آپکا دشمن (ظاہری دشمن مثلاً ابو جہل، ابولہب اور دیگر مشرکین وغیرہ) تباہ و برباد ہو جائیگا۔ اسکی تشریح انفس میں بھی ہے کہ اللہ نے آپ کو خیر کثیر عطا فرمائی تو اپنے رب کا ذکر کیجیے، اپنے دل میں اپنے رب سے ایک خاص تعلق قائم کیجیے اور اپنی خواہشات نفس کی قربانی کیجیے۔ آپکا دشمن شیطان جو انسان کے وجود میں خون کی طرح گردش کرتا ہے، ختم ہو جائیگا، ان شاء اللہ۔

اسی طرح ”ربنا آتنا فی الدنیا.....“ یہ حضور ﷺ کی سکھائی ہوئی ایک حیرت انگیز دعا ہے۔ اہل ایمان کے درجات ہیں۔ مسلمان، مومن، متقی، محسن، صالح، شہید، صدیق، نبی اور ان کے اوپر حضور ﷺ ہیں۔ تو ہر شخص کیلئے ”حسنہ“، مختلف ہے۔ ایک شخص جو مسلمان ہے وہ جنت کا طالب اور دوزخ سے بچنا چاہتا ہے، بالکل ٹھیک ہے۔ کوئی بری بات نہیں ہے۔ اسکے لیے اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: ”یا اللہ! میری دنیا اچھی گزار دے، میری دنیا میں روپیہ پیسہ مال و دولت، عزت و آبرو، صحت و تندرستی اور سلامتی ہو۔ آخرت میں مجھے جنت عطا کرنا اور جہنم کی آگ سے بچالینا“ یہ بالکل سیدھا سادہ ترجمہ ہے۔ ہر انسان کے لیے حسنہ مختلف ہے۔ اللہ کے ولیوں اور درویشوں کے پاس جاؤ تو ان سے پوچھو کہ اکثر لوگ آپ کے پاس آکر کیا مانگتے ہیں۔ ہر آدمی اللہ سے اپنے لیے حسنہ مانگتا ہے۔ جو چیز اسکو اچھی لگتی ہے، وہ اللہ سے مانگتا ہے۔ اللہ کے ولی اور درویش آپکو بتائیں گے کہ اکثر لوگ ہمارے پاس آکر کہتے ہیں کہ ہمیں معاشی مسئلے بہت ہیں، پیسوں کی بہت تکلیف ہے، بیماری ہے، مقدمہ چل رہا ہے، بچی کی شادی نہیں ہو رہی، زمین جائیداد کے مسئلے ہیں۔ ہر انسان اپنے لیے اللہ سے اپنے ظرف کے مطابق حسنہ مانگتا ہے۔ اس آیت کا ظاہری ترجمہ تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا میں اچھی چیزیں عطا فرما۔ آخرت میں جنت عطا فرمانا اور دوزخ کی آگ سے بچانا۔ لیکن بندہ مومن کیلئے اس آیت اور دعا کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ اقبالؒ فرماتے ہیں:

جس کا عمل ہے بے غرض، اسکی جزا کچھ اور ہے

حور و خیام سے گزر، بادہ و جام سے گزر

ایک اور موقع پر اقبالؒ فرماتے ہیں:

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو

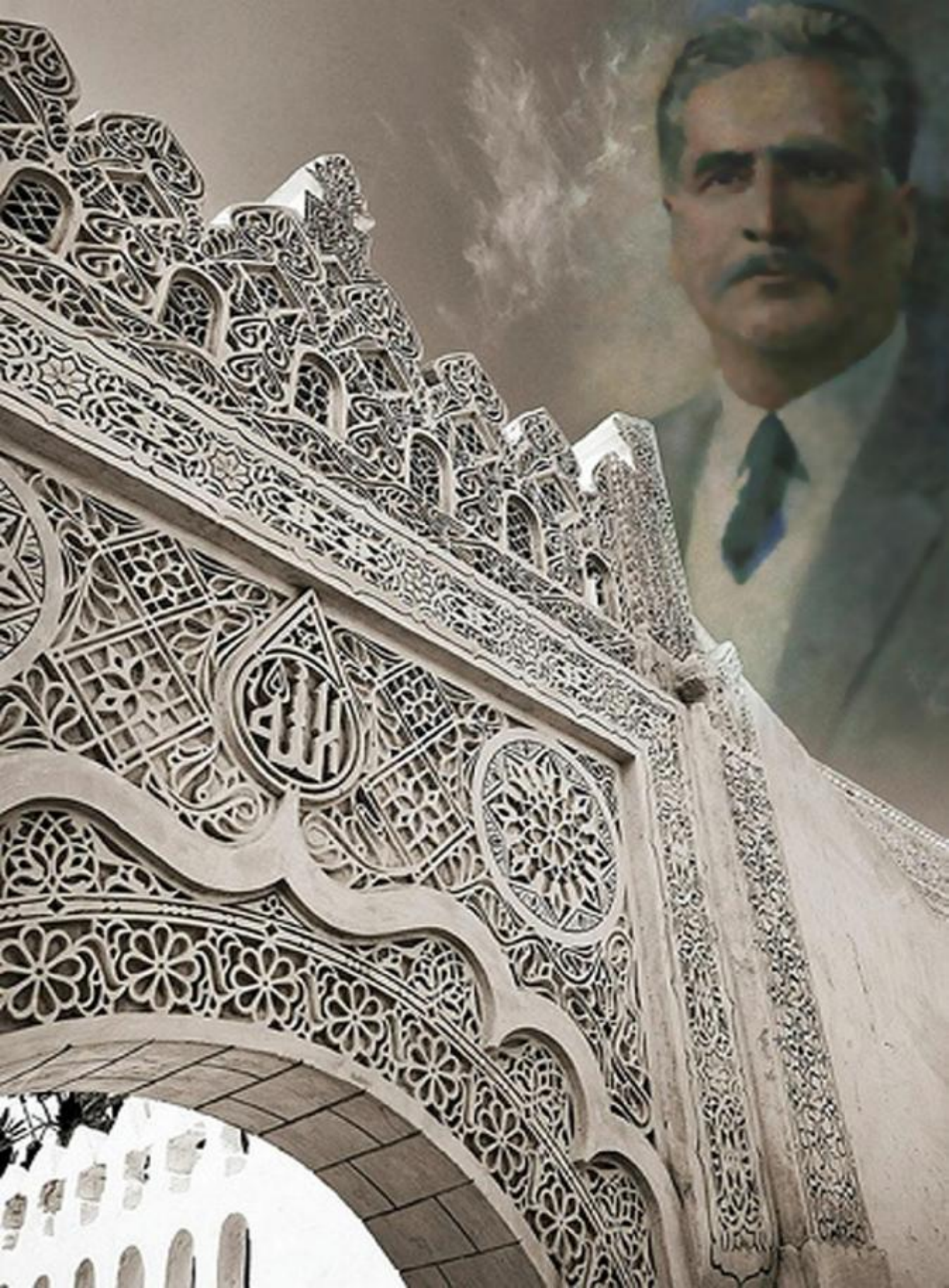
کہ میں آپکا سامنا چاہتا ہوں



طمانچے موج کے کھاتے تھے جو بن کر گوہر نکلے

اللہ کے مومن بندوں کیلئے ”حسنۃ“ کا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ: اے اللہ! مجھے دنیا میں بھی حضور ﷺ کا قرب، زیارت اور دیدار نصیب فرماتا اور آخرت میں بھی، اور مجھے حضور ﷺ کے فراق کی آگ سے بچانا! اسکے لیے فراق ہی دوزخ کی آگ ہے، کیونکہ وہ حضور ﷺ کا دیدار چاہتا ہے۔ عاشق رسول ﷺ، بندہ مومن کیلئے حضور ﷺ کا قرب ہی جنت ہے اور حضور ﷺ کا ہجر ہی جہنم!







## موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اللہ تعالیٰ ہر دور میں ایک فرقان قائم کرتا ہے کہ جو کائنات میں حق اور باطل کی کسوٹی ہوتا ہے۔ اگر وقت کے فرقان کے خلاف جائیں گے، تو دنیا و آخرت میں تباہ و برباد و رسوا ہو گئے۔ اگر وقت کے فرقان کے ساتھ کھڑے ہو گئے، تو دو جہانوں میں عزت پائیں گے۔ اس بات میں شک نہ کیجئے گا کہ آج کے دور کا فرقان پاکستان ہے۔ جو پاکستان کے خلاف کھڑا ہوا، جس نے اس سے خیانت کی، جس نے اس کے خلاف جنگ کی، جس نے اس سے غداری کی، جس نے پاکستان کی توہین کی، جس نے اس کو قومیت، لسانیت، فرقہ واریت میں تقسیم کیا، یا درکھیے گا وہ دنیا و آخرت میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دشمن لکھا جائے گا، چاہے کتنی ہی نمازیں پڑھ لے، حج کر لے یا روزے رکھ لے۔

اس پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم ترین مقصد کیلئے تخلیق کیا ہے۔ اس کی تعمیر تو ہوئی لیکن تکمیل باقی ہے۔ پچھلے ۶۸ سالوں سے پاکستان کے حکمران، اس کی اشرافیہ، علماء، دانشور اور عدلیہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے آگے سخت گنہگار ہیں، کہ یہ ابھی تک پچاس لاکھ مسلمانوں کی قربانی کے نتیجے میں قائم ہوئی ہے پاکستان کے ساتھ خیانت کر رہے ہیں۔ جو بھی اس پاکستان میں خلافت راشدہ کے نظام کو قائم کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے، وہ خائن ہے، ملک و ملت کا بھی، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا بھی۔ اس خیانت کی سزا ہماری پوری قوم کو پاکستان کی پیدائش کے پچیس سال کے بعد ایک بڑے دردناک انداز میں ملی، کہ جب مشرقی پاکستان ہم سے اس طرح جدا

کیا گیا کہ بھائیوں نے بھی غداری کی اور مشرکوں نے بھی عیاری۔ قوموں کی اجتماعی غلطیوں کی سزا، بڑی المناک ہوتی ہے۔ اگر قومیں وقت پر نصیحت نہ پکڑیں تو پھر ایک وقت توبہ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور پھر کفارے خون سے ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ پھر اللہ کی مرضی ہے کہ ہزاروں جانوں کا کفارہ لے، یا لاکھوں کا، یا کروڑوں کا۔ پھر کفارے کے بغیر معافی نہیں ملتی۔

حضرت فرید الدین عطارؒ بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، مولانا جلال الدین رومیؒ کے دور میں۔ ان کی عمر ۷۰ سال سے زائد تھی کہ جب تاتاریوں کا فتنہ ان کے شہر نیشاپور کی طرف آیا۔ تب لوگ دعا کروانے کے لیے حضرت فرید الدین عطارؒ کے پاس پہنچے۔ فرید الدین عطارؒ نے فرمایا کہ دعا کا وقت گزر چکا، اب کفارہ تلوار اور خون سے ادا ہوگا۔ دعا کا وقت اس وقت تھا کہ جب فتنوں کے آنے سے پہلے میں تمہیں خبردار کیا کرتا تھا۔ اس وقت تم لوگ اپنے ناچ گانے اور رنگ رلیوں میں مصروف تھے۔ تم لوگ دنیا میں اس قدر غافل تھے کہ تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ یاد ہی نہیں آئے۔ اب اللہ کا عذاب، اس کا فتنہ، اس کی پکڑ آ پہنچی ہے۔ پھر حضرت فرید الدین عطارؒ نے اپنے مریدوں سے فرمایا: ”اب صرف وہی نجات پائے گا کہ جو لڑتے ہوئے شہید ہوگا، دعا کا وقت گزر چکا، اب کتابیں بند کرو اور تلواریں نکال لو۔“ اس ضعیف العمری میں ۱۱۴ سال کی عمر میں، حضرت فرید الدین عطارؒ، تاتاریوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ اللہ کے بندے اللہ کا مزاج جانتے ہیں۔ کچھ اوقات ہوتے ہیں دعا کے۔ کچھ وقت ایسے ہوتے ہیں کہ جب دعا کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں اور کفارہ خون سے دیا جاتا ہے، اور کچھ وقت تو ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جب کفارہ بھی قبول نہیں ہوتا اور صرف اللہ کا عذاب نازل ہوتا ہے۔

آج ہم پاکستان کے جس دور میں داخل ہو چکے ہیں، اس کا پس منظر یہ ہے کہ پچھلی کئی دہائیوں سے ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے خیانت کرتے چلے آ رہے ہیں۔ کوئی نصیحت اس قوم پر، اس کے حکمرانوں اور اس کی اشرافیہ پر کارگر نہ ہوئی۔ آج پوری مسلم دنیا بھی خونریز تباہی سے دوچار ہے۔ بڑے بڑے مسلمان ممالک، عراق، شام، لیبیا، کھنڈر بنائے جا چکے ہیں۔ لاکھوں مسلمان شہید ہو چکے ہیں۔ لاکھوں گھر بار چھوڑ کر مہاجر ہیں۔ ہزاروں مسلمان عورتوں کی عصمتیں تار تار ہو چکی ہیں اور صلیبی قوتیں اور خوارج بڑی خونریزی سے مسلم دنیا کو پارہ پارہ کرنے کیلئے حملہ آور ہو رہے ہیں۔

اس تمام صورتحال میں پاکستان ہی وہ واحد اسلامی ریاست تھی کہ جس سے امت کی امیدیں وابستہ تھیں۔ مگر اس کے خائن ترین حکمرانوں نے خود اپنے آپ کو بھی رسوا کیا، ملت کو بھی خوار کیا اور امت کو بھی دھوکہ دے رہے ہیں۔ وہ فتنے کہ جو عالم اسلام کے دیگر ممالک میں تباہی مچا رہے ہیں، اب انہوں نے پاکستان کا رخ بھی کر لیا ہے۔ پاکستانی قوم کے سامنے اب صرف یہ تین ہی راستے رہ گئے ہیں۔

یانی الفور توبہ کرے، اللہ کی طرف رجوع کرے، اپنے گناہوں پر استغفار کرے اور پاکستان سے طاغوت اور کفر کا نظام ہٹا کر یہاں

خلافت راشدہ کا نظام قائم کرے اور اس وعدے کو پورا کرے کہ جس کی تکمیل کی خاطر لاکھوں مسلمانوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ ان شہداء کے خون سے خیانت حرام ہے۔

ایسا نہ کرنے کی صورت میں دوسرا راستہ پاکستانی قوم کے سامنے صرف یہ ہے کہ پھر اس آندھی کا انتظار کرے کہ جواب آکر اس کی سرحدوں اور گھروں سے ٹکرانے والی ہے اور اب جس کوٹا لے کیلئے ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں، شاید کروڑوں کی قربانی دے کر ہی کفارہ قبول ہوگا۔

اور تیسرا راستہ یہ ہے کہ پھر صرف ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جائیں، اللہ کے عذاب کا انتظار کریں اور یہ دیکھیں کہ اللہ پھر اس قوم کے بارے میں کیا فیصلے کرتا ہے۔

پاکستان اللہ کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ یہ خطہ زمین اتنا قیمتی ہے کہ اللہ اس کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ پاکستانی قوم، اس کے حکمران اور اشرافیہ اس قدر اسفل السافلین ہو چکے ہیں کہ شاید اب اللہ اس قوم کو تبدیل ہی کر دے اور وہ لوگ لے آئے کہ جو اللہ سے پیار کرتے ہوں، اور اللہ ان سے پیار کرتا ہو۔ اور اگر اللہ نے ایسا کرنا چاہا تو یہ ناپاک پاکستانی حکمران اور یہ طاغوت کا نظام اللہ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا، کہ اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔

پاکستان کی نوجوان نسل اور اس کی مسلح افواج پر اب بہت بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آنے والی صدیوں کا بوجھ اب مسلح افواج کی قیادت پر اور پاکستانی نوجوان نسل کے کاندھوں پر ہی ڈالا جائے گا۔ پاکستان کا مستقبل کیسا ہو، اس کا فیصلہ اب اللہ کے ان بندوں کو کرنا ہے کہ جو مردان خود آگاہ بھی ہوں اور خدا مست بھی اور جو یہ جرأت کردار اور عمیق افکار رکھتے ہوں کہ جو اس دور میں امت کو ذلت کی رسوائیوں سے نکال کر، عروج کی بلندیوں تک لے جاسکیں۔ ہمیں ذاتی طور پر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ پاک فوج سے حیرت انگیز کام لے گا۔ پاکستان کے قیام کی حکمت میں سب سے بڑا ازغزوہ ہند ہے۔ اللہ نے یہ سعادت پاک فوج کے ہی نصیب میں لکھی ہے۔

اپنے آپ کو تیار کریں، کڑی ذمہ داری آنے والی ہے۔ اس سے بھاری بھی کوئی ذمہ داری ہو سکتی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نمائندے بن کر دنیا میں اللہ کے دین کو نافذ کیا جائے؟ ایسا نہ ہو کہ ہمارا عمل، ہمارا کردار، ہماری زبان، ہماری گفتار، ہمارے معاملات، اللہ کے رسول ﷺ کے لیے رسوائی کا سبب بنیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ امتی باعث رسوائی پیغمبر ہوں۔ اقبالؒ نے جواب شکوہ میں فرمایا تھا کہ یہ وہ مسلمان ہیں کہ جنہیں دیکھ کر شرمائیں یہود۔ ایسے ناپاک کردار ہیں! ہم صادق و امین رسول اللہ ﷺ کے ماننے والے ہیں اور حال یہ ہے کہ آج سب سے خائن قوم پاکستانی ہے۔ جن سے متعلق کفار نے گواہی دی کہ آپ ﷺ صادق اور امین ہیں، آج ان کی امت کے بارے میں کفار یہ طعن دیتے ہیں کہ یہ چند کوڑیوں کے مول اپنی ماں کو بیچ ڈالتے ہیں۔

اللہ نے اب آپ سے دنیا کی امامت کا کام لینا ہے۔ اپنے آپ کو اس ذمہ داری کیلئے تیار کریں۔ یہ نہ ہو کہ اللہ عزت و وقار حاصل





کرنے کا موقع آپ کی طرف بھیجے اور جب وہ موقع آپ کے سامنے آئے تو آپ کہیں کہ مالک! میں اس کے لیے تیار نہیں۔ اس وقت بہت نقصان ہو جائیگا۔ یہ سعادت ہزاروں سالوں میں کسی کسی کو ملتی ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اللہ پاکستانی قوم میں سے ہی اپنے چنے ہوئے بندوں کو اٹھائے گا کہ جو ایک مرتبہ پھر اس بکھری ہوئی ملت کی شیرازہ بندی کریں گے۔ اس وقت تک کہ جب اللہ اپنے کرم اور فضل کے دروازے کھول دے، پاکستان کی ریاست کی حفاظت کرنا ہم پر فرض العین ہے۔ اس خطہ زمین کو ہم ہر قیمت پر بچا کر رکھیں گے۔ ہر داخلی اور خارجی دشمن سے اس کی حفاظت کی جائے گی اور کسی صورت میں بھی ہم اپنے لاکھوں شہداء کے خون سے خیانت نہیں کر سکتے۔ اس پاکستان نے امت کی قیادت سنبھالی ہے۔ یہ فیصلہ لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے۔ صرف اس کا اظہار ہونا باقی ہے۔ لیکن اس اظہار سے پہلے، اب اس قوم کو اپنے گناہوں کی سیاہی اپنے خون کی سرخی سے رنگی ہوگی۔

یہ وقت ظاہراً انتہائی تاریکی اور مایوسی کا نظر آتا ہے، مگر یہی وقت ہوتا ہے کہ جس میں شیروں اور دلیروں کی پہچان ہوتی ہے، مومن، منافق سے الگ کیے جاتے ہیں، مجاہد اور ملا کا فرق واضح ہوتا ہے، ایک حقیقی لیڈر اور ایک سیاست باز جواری الگ الگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہی تاریک دور ہوتے ہیں کہ جن میں صلاح الدین ایوبی پیدا ہوتے ہیں۔

اس تاریک دور میں ملت کو متحد رکھنا، اس کا دفاع کرنا، اور اس امید کی شمع جلانے رکھنا ہی سب سے بڑا جہاد ہے۔ دشمنوں کا سب سے کاری حربہ نفسیاتی ہوگا، کہ جو اس قوم کو مایوسی میں مبتلا کر کے بے حوصلہ کرنے کی کوشش ہوگی۔ ایک مایوس اور بے حوصلہ قوم میدان میں جائے بغیر ہی شکست کھا جاتی ہے۔

آج اگر سختیاں ہیں تو کل ان شاء اللہ، اللہ کے حکم سے اسی پاکستان کی ہاں اور ناں میں دنیا کے فیصلے بھی ہونگے۔ جو آج اپنی جان، مال، عزت و آبرو کی قربانی دینے اس مدینہ ثانی کے دفاع میں، چاہے وہ اپنی منزل پائیں یا راہ میں ہی شہید کر دیئے جائیں، دونوں صورتوں میں اپنے رب کے حضور سرخرو ہیں۔ جو آج اس ملت کے شجر سے مایوس ہو کر کٹ کر الگ ہو گیا، وہ کل آنے والی بہار میں بھی سرسبز و شاداب نہ ہو سکے گا۔

آج جس دور سے پاکستان اور پاکستانی قوم گزر رہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اقبالؒ کو نوے برس قبل ہی ملت کی اس حالت کا علم تھا۔ اپنی ایک بڑی پر حکمت اور دردا نگیز نظم میں آج کی مایوس پاکستانی قوم کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ  
 ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے  
 ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے  
 کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے  
 ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور  
 خالی ہے جیبِ گل زرِ کامل عیار سے  
 جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور  
 رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے  
 شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو  
 نا آشنا ہے قاعدہ روزگار سے  
 ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ  
 پیوستہ رہ شجر سے، امیدِ بہار رکھ!

آج کتنے ہی لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، دنیا میں کہیں اور جاتے ہیں، کینیڈا کا ویزہ لے لیتے ہیں، پاکستان میں تو کچھ بھی نہیں ہے، یہاں تو فاقوں مرجائیں گے، یا پھر بم دھماکے میں۔ نہ کھانے کو کچھ ہے، نہ بجلی۔ مگر یہی وقت ہے اس ملک کی خاطر کھڑے ہونے کا اور جان، مال، عزت و آبرو کی قربانی دینے کا۔ یہ ممکن نہیں کہ خزاں میں درخت سے ٹوٹ کر گر جانے والی ڈالی بہار میں پھر سے سرسبز و شاداب ہو سکے۔ جس نے خود کو ملت اور جمعیت سے توڑ لیا، اب ایک دائمی خزاں ہی اس کے نصیب میں ہے، مایوسی، افسردگی، لعنت ہی اب اس کا مقدر ہے۔

اقبالؒ نے بہت خوبصورت استعارہ استعمال کیا ہے۔ بہت خوبصورت مثال دی ہے۔ انہوں نے امتِ رسول ﷺ کی مثال ایک شجر سے دی ہے۔ اس میں اگر کوئی ڈالی اپنے آپ کو الگ کرے کہ میں کرد ہوں، میں ترک ہوں، میں عرب ہوں، میں افغان ہوں، میں پاکستانی ہوں، میں بلوچ ہوں، پٹھان ہوں، تو پھر اسکے نصیب میں خزاں ہی آئے گی۔ آج بلوچستان کے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں

حقوق نہیں ملے، اس لیے ہم یہ پاکستان توڑنا چاہتے ہیں۔ دیکھو! آج پاکستان پر فصل خزاں ہے، پاکستان کے ہر حصے میں ظلم ہو رہا ہے۔ صرف بلوچستان یا سرحد میں تو ظلم نہیں ہو رہا۔ اگر آج کوئی یہ کہتا ہے کہ ہم خود کو پاکستان سے الگ کر لیں گے، تو اللہ کی قسم وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکیں گے۔ ابھی ان کو اپنے بھائیوں سے شکایت ہے، بعد میں ان پر کافر مسلط ہونگے۔ پاکستان میں آج اسی لیے ظلم ہو رہا ہے، کیونکہ یہاں اللہ کا دین نافذ نہیں ہے۔ اس کا حل یہ نہیں کہ ملک توڑ دیا جائے۔ اس کا حل یہ ہے کہ یہاں اللہ کا دین نافذ کیا جائے۔ جب اللہ کا دین نافذ ہوگا تو پھر کون ظلم کرے گا؟ یہاں تو دین نافذ ہی نہیں کیا گیا۔ پھر شکوہ کیا جاتا ہے کہ یہاں فصل خزاں ہے، بہار آئی ہی نہیں۔ بہار نہیں ہے تو شجر ہی کاٹ دو۔ ایک دفعہ اللہ تعالیٰ کا دین نافذ کریں، خلافت راشدہ کا نظام تو لائیں، پھر اگر کسی پر ظلم ہو تو بات کریں۔

اقبال! اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ آج ملت میں قحط الرجال کا عالم ہے۔ اللہ کے بندے چراغ لیکر بھی ڈھونڈتے تو نہیں ملتے۔ نہ کہیں صلاح الدین ایوبی نظر آتے ہیں، نہ کہیں امام مالک، امام شافعی یا امام ابوحنیفہ۔ ہمارے اعلیٰ ترین اذہان مایوس ہو کر ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ اذان دینے والے فقراء تھوڑے رہ گئے ہیں۔ حکمران حرام میں پلے ہوئے ہیں، خائن ہیں، ننگ ملت، ننگ قوم! مگر اقبال! ساتھ یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ آج مسلمان اللہ کے رازوں سے واقف نہیں ہیں کہ جن کے تحت قومیں عروج و زوال حاصل کرتی ہیں، قوموں پر فطرت کے روز و شب کی گردش کیسے اثر کرتی ہے۔

حالات کس قدر بھی مایوس کن ہوں، اقبال! بہت سختی سے قوم کے نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ ہر حال میں اپنے آپ کو، اپنی ملت اور امت سے جوڑ کر رکھنا ہے۔ تمہاری بقاء اسی صورت ممکن ہے کہ جب تم اپنے شجر سایہ دار سے وابستہ ہو، چاہے اس وقت اس پر خزاں کا موسم ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ سے امید رکھو کہ فصل بہار ضرور آئے گی، ان شاء اللہ!

مگر اس حقیقت میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اللہ جب بھی کسی مایوس اور تباہ حال قوم کو عروج دینا چاہتا ہے تو ان میں ایک فرد یا کوئی چھوٹی سی جماعت پیدا کرتا ہے کہ جو اس قدر پر اسرار و جود ہوتے ہیں کہ اپنی بلند نگاہی سے، سخن کی دلنوازی اور جاں کی پرسوزی سے اس مردہ قوم میں زندگی کا صور پھونک دیتے ہیں۔ یہی چھوٹی سی جماعت اذان بھی دیتی ہے، قوم کو بیدار بھی کرتی ہے، اس کو متحد بھی کرتی ہے اور پھر دی ہوئی اذان کو نافذ بھی کرتی ہے۔ عوام کی اکثریت ہجوم آبادی ہی ہوتی ہے کہ جو اپنے آس پاس برپا ہونے والے کفر و باطل کے معرکے کو کچھ فاصلے پر بیٹھ کر ہی تماشہ دیکھتی ہے۔ جب اللہ کا حکم نازل ہو جاتا ہے، اور وہ چھوٹی سی سرفروشوں کی جماعت کا میاب ہو جاتی ہے تو پھر وہ ساحل پر منتظر ہجوم آبادی بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ سورہ النصر یاد کیجئے: ”جب (اس چھوٹی سی جماعت کو) اللہ کی مدد اور فتح آ پہنچے، اور آپ دیکھ لیں کہ عام لوگ بھی گروہ درگروہ اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں.....“۔ یہی قرآن کا قائدہ انقلاب ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں ہی فرماتا ہے کہ جو لوگ فتح سے پہلے جہاد کرتے ہیں، اپنی جان، مال، عزت و آبرو قربان کرتے ہیں،





انکا مرتبہ ان لوگوں سے بہت بلند ہے کہ جو فتح کے بعد آکر جماعت میں شامل ہوں۔

بدر کے شہداء کا اتنا بلند مقام کیوں ہے؟ کیونکہ جب بالکل تاریکی تھی، مسلمان ملت چاروں طرف سے گھیری جا چکی تھی، اسلامی ریاست کا خاتمہ یقینی نظر آتا تھا، تو اس صورت میں جنہوں نے اللہ کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہا، وہ قیامت تک آنے والے شہداء کے سردار کہلائے، اور ’فضل الشہداء‘ کا خطاب پایا۔ اسی لیے بدری صحابہ کا درجہ، صحابہ کرامؓ میں بھی، سب سے بلند رکھا گیا ہے۔

آج پاکستان کو بھی ایسے ہی سرفروش دستوں کی ضرورت ہے کہ جو مجاہدین بدر کی سنت پر ہوں۔ جب فضائے بدر ہوگی تو پھر وہی نصرت نازل ہوگی کہ جو یوم الفرقان پر اللہ نے نازل فرمائی تھی۔

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو

اتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی

حضور ﷺ کی احادیث شریف کا مفہوم ہے کہ اسلام اپنے آغاز میں جتنا مسکین اور غریب تھا، آخری دور میں بھی اتنا ہی مسکین اور غریب ہو جائے گا! ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب دنیا کی قومیں مسلمانوں پر اس طرح ٹوٹ کر گریں گی کہ جیسے بھوکے کھانے پر ٹوٹتے ہیں! آج ہم اپنی آنکھوں سے امت مسلمہ کا یہ حال دیکھ رہے ہیں۔ مگر اس آزمائش کی گھڑی میں وہ مجاہد کہ جو اللہ کے رسول ﷺ کی پکار پر لبیک کہیں گے، اس کائنات کے خوش نصیب ترین امتی ہونگے۔ میرے آقا ﷺ کی ایک خوبصورت حدیث شریف ہے کہ جس میں آپ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ میں اپنے بھائیوں سے ملنے کیلئے بہت بے چین ہوں۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے فرمایا کہ یا سیدی رسول اللہ ﷺ! کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ اس پرسیدی رسول اللہ ﷺ نے جواب عطا فرمایا کہ نہیں! تم میرے صحابہ ہو، میرے بھائی وہ ہیں کہ جو بہت بعد میں آئیں گے کہ جنہوں نے مجھے دیکھا بھی نہیں ہوگا اور وہ مجھ سے انتہائی محبت کرتے ہونگے! حضور ﷺ کی یہ انتہائی خوبصورت حدیث آج کے دور کے عشاق کیلئے پیغام حیات ہے۔ سیدی رسول اللہ ﷺ نے انہیں اپنا بھائی فرمایا ہے اور ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار فرمایا ہے۔

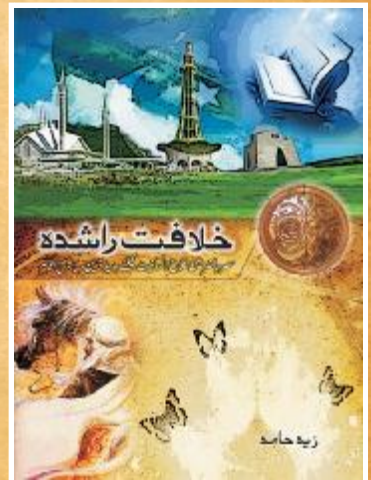
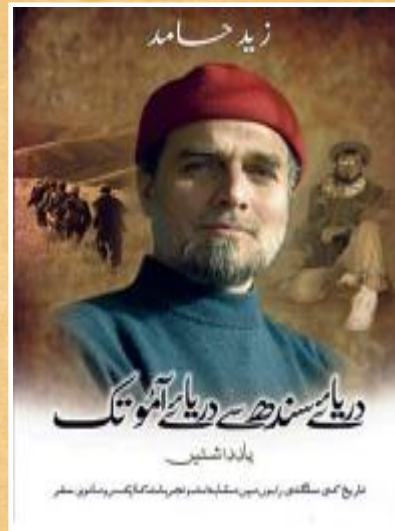
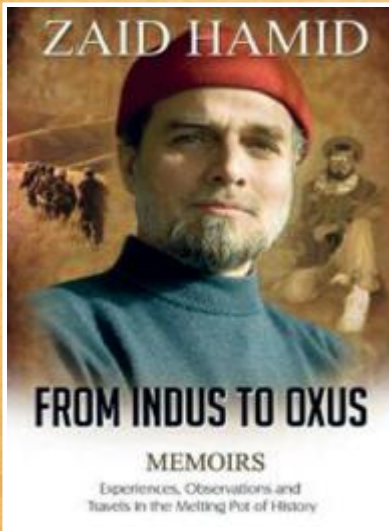
امت کو جتنی بڑی آزمائش اور امتحان کا سامنا ہوتا ہے، اس کے دفاع پر کھڑے ہونے کا اجر اور انعام بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ آج یہ سعادت امت رسول ﷺ کے جانثاروں کے نصیب میں ہے کہ اس امت مرحومہ اور مدینہ عثانی پاک سرزمین کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوں۔ کوئی بعید نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ آپ کی اس جہد مسلسل کو قبول فرمائیں اور سیدی رسول اللہ ﷺ آپ کو اپنے بھائیوں میں شامل فرمائیں۔ یہ سعادت اس امت کو سیدی رسول اللہ ﷺ نے اپنی رحمت سے عطا فرمائی ہے۔ اب جس کا جتنا ظرف ہے، اتنا ہی اس کا نصیب!

اور مومنوں میں سے اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے اپنا اللہ سے کیا ہوا وعدہ سچا کر دکھایا، ان میں سے کچھ تو ہیں کہ جو شہادت کی منزل پر فائز ہو کر اپنی قسم کو پورا کر چکے ہیں اور کچھ ہیں کہ جو ابھی اپنی قسم کے پورا ہونے کے منتظر ہیں، اور ان میں سے کسی نے بھی اللہ سے وعدہ خلافی نہیں کی!

(الاحزاب ۲۳)



# مصنف کی دیگر کتب







اس تصنیف کا مقصد نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت اور آج کے پرفتن دور میں ان کے ذہنوں میں اٹھنے والے اشکالات کے شافی جوابات دینا ہے، تاکہ وہ امت کی قیادت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھا سکیں۔ یہ وقت ظاہراً انتہائی تاریکی اور مایوسی کا نظر آتا ہے، مگر یہی وقت ہوتا ہے کہ جس میں شیروں اور دلیروں کی پہچان ہوتی ہے، مومن، منافق سے الگ کیے جاتے ہیں، مجاہد اور ملا کا فرق واضح ہوتا ہے، ایک حقیقی لیڈر اور ایک سیاست باز جواری الگ الگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہی تاریک دور ہوتے ہیں کہ جن میں صلاح الدین ایوبی پیدا ہوتے ہیں۔

بندہ مومن کی شخصیت میں ایک روحانی جہت ہوتی ہے کہ جس کے باعث اس کا کردار لوگوں کو مسحور کر دیتا ہے، مہوت کر دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود صحابہ کرامؓ ہیں۔ بندہ مومن نرم دم گفتگو بھی ہوتا ہے، گرم دم جستجو بھی۔ رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل بھی ہوتا ہے اور پاک باز بھی۔

امت کو جتنی بڑی آزمائش اور امتحان کا سامنا ہوتا ہے، اس کے دفاع پر کھڑے ہونے کا اجر اور انعام بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ آج یہ سعادت امت رسول ﷺ کے جانثاروں کے نصیب میں ہے کہ اس امت مرحوم اور مدینہ عثمانی پاک سرزمین کے دفاع میں اٹھ کھڑے ہوں۔ کوئی بعید نہیں کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ آپ کی اس جہد مسلسل کو قبول فرمائیں اور سیدی رسول اللہ ﷺ آپ کو اپنے بھائیوں میں شامل فرمائیں۔ یہ سعادت اس امت کو سیدی رسول اللہ ﷺ نے اپنی رحمت سے عطا فرمائی ہے۔ اب جس کا جتنا ظرف ہے، اتنا ہی اس کا نصیب!



**BrassTacks**  
Advanced Threat Analysis  
Defence and Security Advisors

House # 683-A, Street # 4  
Chaklala Scheme 3, Rawalpindi, Pakistan.  
Land line: +92-51-5598046 -7

Website: [www.zaidhamid.pk](http://www.zaidhamid.pk)  
E-mail: [syedzaidzamanhamid@gmail.com](mailto:syedzaidzamanhamid@gmail.com)

Rs: 1,500/-